بسم اللہ الرحمن الرحیم

تحریک ادب

شمارہ62 خصوصی شمارہ فروری 2023 جلد نمبر 16

Tahreek-e-adab vol-16,Special issue-62 February 2023

مجلس ادارت

Editorial board and Peer Review committee

پروفیسر صغیر افراہیم، سابق صدر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

Prof. Sagheer Afrahim Ex.Chairman Dept.of Urdu A.M.U.

پروفیسر شہاب عنایت ملک، سابق صدر شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی

Prof.Shohab Inayat Malik Ex.HOD Urdu,Jammu University

پروفیسر محفوظہ جان، صدر، شعبہ کشمیری، کشمیر یونیورسٹی

Prof. Mahfooza Jaan(H.O.D.Kashmiri,Kashmir University)

ڈاکٹر شمس کمال انجم، صدر شعبہ عربی، باباغلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی

Prof.Shahina Rizvi(Ex.HOD,Urdu,MKVP University,VNS.)

پروفیسر شاہینہ رضوی (سابق صدر، شعبہ اردو، مہاتما گاندھی کاشی ودیا پیٹھ یونیورسٹی، وارانسی)

Dr. Shams Kamal Anjum, H.O.D. Arabic, Baba Ghulam Shah Badshah University,Rajouri (J&K)

ڈاکٹر دبیر احمد، صدر شعبہ اردو، مولانا آزاد پی۔جی۔ کالج، کولکاتا

Dr. Dabeer Ahmad,H.O.D.Urdu, Maulana Azad P.G. College,Kolkata

ڈاکٹر احسان حسن، شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی

Dr.Ehasan Hasan,Dept of Urdu BHU Varanasi

مدیر Editor **جاوید انور** **Jawed Anwar**cell-0091-9935957330

مجلس مشاورت

Advisery Board and Peer Review committee

عظیم حسین، پروفیسر عارفہ بشریٰ، رشید احمد، ڈاکٹر فروز حیدری،
عرفان عارف، ڈاکٹر چمن لال

Azeem Hussain(Director,Idiol Offshore,Mumbai)

Prof. Arifa Bushra(Dept. of Urdu,Kashmir University)

Rasheed Ahmad(Chairman Rosewood Academy,VNS

Dr. Feroz Haidry H.O.D.Urdu,VN Government Institute of Arts and Social Sciences,Nagpur

Irfan Arif(H.O.D.Dept. of Urdu,Govt.SPMR College of Commerce,Cluster University of Jammu,Jammu)

Dr.Chman Lal Bhagat(Asst. Prof.Dept. of Urdu,Jammu University,Jammu)

Name Tahreek-e-Adab

ISSN 2322-0341

Vol-16 (جلد نمبر 16) Year of Publication 2023 سال اشاعت:

Special Issue 62 February 2023 شمارہ نمبر : 62،خصوصی شمارہ،فروری

Title name Artist : Anwar Jamal, Varanasi سرنامہ خطاط: انور جمال

Title cover Uzma Screen, Varanasi سرورق : عظمیٰ اسکرین

200/-Two Hundred rs. for this copy یہ شمارہ : دوسو روپے

زرسالانہ : ایک ہزار روپے (رسالہ صرف رجسٹرڈ ڈاک سے ہی بھیجا جائے گا)

One Year Membership 1000/- rs. One Thousand Rupees

تاعمر خریداری (ہند): بیس ہزار روپے

Life Time: 20000/- Twenty Thousand rs.(only india)

چیک یا ڈرافٹ اور انٹرنیٹ بینکنگ کے ذریعے زر رفاقت یہاں ارسال کریں۔

Please send your subscription amount or donation through cheque,draft or internet banking on the following:

Tahreek-e-adab IFSC IOBA 0001968 Current A/C no.196802000000440 Indian Overseas Bank, Glenhill School Ext. Counter,Manduadih Bazar,Varanasi-221103(U.P) India

***

Jawed Ahmad IFSC SBIN0005382 A/C no. 33803738087 State Bank Of India,Branch-Shopping centre(B.H.U.Campus.B.H.U.Varanasi-221005(U.P) India

اس شمارہ کی مشمولات میں اظہار کیے گئے خیالات ونظریات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

The content/idea expressed in any article of this journal is the sole responsibility of the concerned writer and this institution has nothing to do with it.

متنازعہ تحریر کے لیے صاحب قلم خود ذمہ دار ہے۔تحریک ادب سے متعلق کوئی بھی قانون چارہ جوئی صرف وارنسی کی عدالت میں ممکن ہوگی۔

Any legal matter pertaining to tahreek-e-adab will be possible only in the jurisdiction of Varanasi court.

جاوید انور مدیر تحریک ادب نے مہاویر پریس، وارانسی سے شائع کرا اردو آشیانہ ۱۶۷، آفاق خان کا احاطہ، منڈواڈیہہ بازار، وارانسی سے تقسیم کیا۔

Jawed Anwar Editor Tahreek-e-Adab has got this journal published from mahavir press, Varanasi and distribute it from Urdu Ashiana,167 Afaq Khan Ka Ahata,Manduadeeh Bazar,Varanasi-221103

فہرست

1۔2022 کا فکشن اور فکشن تنقید: ایک عالمی جائزہ — پروفیسر اسلم جمشید پوری 6

2۔اکیسویں صدی کے خدوخال اور اردو شاعری — ڈاکٹر افشانہ 39

3۔لل عارفہ: ایک عظیم المرتبت شخصیت — مظفر یوسف 42

4۔ہندوستان میں جشن نوروز کی ثقافتی اور تہذیبی اہمیت:۔ — ڈاکٹر جہانگیر اقبال 47

5۔اسد محمد خاں کے افسانوں کا جائزہ — ڈاکٹر صفیہ سلطان 55

6۔اردو رباعی کی تعریف اور غزل ،قصیدہ، مثنوی اور۔۔ — سوریہ پرکاش راؤ 59

7۔فارسی زبان کے تذکروں میں ریشیت اور صوفیت۔۔ — ڈاکٹر واحد احمد شیخ 62

8۔فانیؔ کی مثنوی" مصدرالآثار" میں اخلاقی کردار کی عکاسی۔ڈاکٹر سید شافی 70

9۔ولی محمد اسیر کشتواڑی کی ادبی تاریخ نویسی — ڈاکٹر ظہور احمد مخدومی 75

10۔کشمیر غزل کا سفر 1950 کے بعد — اشتیاق احمد ملک 85

11۔اردو کمپوزنگ: مسائل اور حل — ڈاکٹر جرار احمد 90

12۔نسوانیت یا تانیثیت — ڈاکٹر رافعہ ولی 97

13۔کشمیر میں عربی زبان و ادب — ڈاکٹر رقیہ فاضل 102

14۔ولیم ورڈ سورتھ کی شاعری میں رومانوی عناصر — ڈاکٹر سورج کمار 105

15۔حامد اکمل کی شعری کاوشیں — ڈاکٹر مفتی محمد شرف عالم 110

16۔کشمیری ادب میں صنف نعت: ایک تعارف — مظفر یوسف 116

17۔لل دید کی شاعری میں شیو کا استعارہ — ڈاکٹر افشانہ 121

افسانے: 1۔گھروندا، از۔ افشاں احمد 2۔ وہ لڑکا، از۔ ڈاکٹر شاداب علیم 125

مضامین: 1۔کشمیری شاعری میں انسان دوستی — آئینہ گل 135

2۔بچوں کے جاوید نہال — محمد التمش خالد 138

3۔امیر مینائی کی رباعیات میں زبان و بیان کی نیرنگیاں — مجتبیٰ حسن صدیقی 149

4۔آزادی کے بعد افسانہ نگاروں کی پہچان — نثار احمد ڈار 155

5۔ڈاکٹر محمد اکرم عثمان کے افسانوں کی نمایاں خصوصیات — محمد اقرار 161

6۔نئی امیجری اور بشیر بدر — شمس نیازی 166

7۔ایک افسانہ نگار: ڈاکٹر سید نسرین رمضان صدف آرا محمد شفیع چوبدار 175
8۔وہاب کھار۔کشمیری زبان کے برگزیدہ صوفی شاعر سجاد ظہور 179
9۔اشک امرتسری کی شاعری میں بنگلہ زبان وتہذیب آصف پرویز 183
10۔جموں وکشمیر کے نامور محققین سلیمہ اختر 189
11۔منتخب ڈیموگرافک خصوصیات کے تناظر میں۔۔ڈاکٹر سحر امانی، ڈاکٹر شمشاد بیگم 197
12۔ماہنامہ "سب رس" ایک اجمالی جائزہ سرتاج احمد میر 204
13۔ریاست تلنگانہ میں قانون حق تعلیم کے اثرات محمد جیلانی 210
14۔بیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو خاکہ نگاری شبیر احمد ملک 219
15۔محسن خان: سوانحی کوائف اور تصانیف اقصیٰ عباس 223
16۔شبیر مصباحی کے افسانچوں کا مجموعہ "ادراک" اک جائزہ۔مختار احمد زاہد 227
17۔دینا ناتھ نادم کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر ڈاکٹر قیصر احمد ملک 235
18۔ملک کی بڑی اقلیت کی تعلیم اور روزگار کے فروغ۔۔ ڈاکٹر محمد سراج الدین 243
19۔منشی پریم چند کا افسانہ "کفن" کا فنی اور تنقیدی جائزہ بلال احمد وانی 249
20۔سماجی علوم کی تدریس میں ادب۔۔ محمد سعادت حسین، ڈاکٹر صداقت علی خان 255
21۔آزادی کے بعد اردو ناول میں موضوعات کا تنوع رؤف احمد میر 262
22۔اکیسویں صدی میں اردو افسانہ: دیپک بدکی کے حوالے سے۔ڈاکٹر محمد امین نجار 265
23۔ہندوستان میں فارسی زبان وادب کا مختصراً جائزہ ڈاکٹر غلام عباس 271
24۔صنف افسانہ کے منازل: ازل تا ابد لطیف احمد بھٹ 276
25۔فارسی ادب کا نامور ادیب: مولانا اوجی کشمیری ڈاکٹر فاروق احمد وانی 284
26۔عربی ملیالم ادب میں مہاکوی معین کٹی ویڈیار کی شراکتیں ڈاکٹر رفید علی۔ای 289
27۔آصف جاہی خاندان کا قیام: ایک تاریخی تناظر خالد حسین میر 297
28۔احوال وآثار غلام علی خان نقوی مہتاب خان 303
29۔حسین الحق کے افسانوں میں علامتی عناصر شگفتہ اقبال 307
30۔اردو مرثیہ گوئی کی روایت ریاض احمد نجار 310
31۔ابوالفضل صدیقی کے افسانوں میں دیہی سماج ڈاکٹر عزیر احمد 315

2022 ka Fiction aur Fiction Tanqeed by Prof. Aslam Jamshed puri |(Head Dept.of Urdu CCS University,Meerut) cell-9456259850,8279907070

پروفیسر اسلم جمشید پوری (صدر، شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)

۲۰۲۲ کا فکشن اور فکشن تنقید: ایک عالمی جائزہ

وقت کا بہتا دریا کبھی رکتا نہیں۔ وقت کے دریا کی ایک اور بوند ۲۰۲۲ زمانے کے بیکراں سمندر میں سما گئی۔ پانی میں مل کر پانی، پانی ہو گیا۔ اب زمانے نامی سمندر میں ایک بوند پانی کو الگ کرنا کتنا مشکل ہے۔ لیکن کچھ واقعات و حادثات اور ادبی سرگرمیاں ایسی ہوتی ہیں، جن سے اس برس کی پہچان بہ آسانی ہو جاتی ہے۔ ۲۰۲۲ کی ادبی سرگرمیوں سے الگ شناخت قائم ہوتی ہے۔ اس برس کیسا فکشن شائع ہوا۔ یعنی کون کون سے نئے ناول منظر عام پر آئے۔ کن افسانوی مجموعوں نے دھوم مچائی۔ افسانچہ، ڈراما نے کیا گل کھلائے۔ ناول، افسانے، افسانچے، ڈرامے کی تنقید نے کیا کیا رنگ دکھائے۔ کن سیمیناروں اور ایوارڈز نے اپنے اثرات قائم کئے۔ کون سے ادیب، شاعر، صحافی ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوئے۔ ۲۰۲۲ کا ایک مختصر عالمی جائزہ پیش ہے۔

☆ اس سال کئی افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ سب کے رنگ الگ الگ تھے۔ ہمارے مستند اور معروف افسانہ نگار خالد فتح محمد (پاکستان) جو کہ ۱۹۷۰ کی نسل کے ایک ممتاز افسانہ نگار ہیں، اس سال ان کے افسانوں کا مجموعہ **''دیواروں کے راز''** شائع ہوا ہے۔ عکس پبلیکیشنز سے شائع اس مجموعے میں خالد فتح محمد کے انیس افسانے شامل ہیں۔ یہ سبھی افسانے موجودہ عہد کے ترجمان ہیں۔ ان افسانوں میں زندگی، آس پاس کا ماحول، گوشت پوست کے کردار جو ثواب و گناہ کے مجموعے ہیں، سماج کا بدلتا ہوا رنگ، اسلامی معاشرے میں مذہب کے ٹھیکے داروں کا رول، پاکستانی معاشرہ، پرانی تہذیب و اقدار، مسلمانوں کو شک کی نگاہ سے دیکھنے کا مغربی نظریہ، موجودہ سیاست کا ہر وقت بدلتا چولا، سیاست دانوں کا مزاج، حق کا قتل اور ناحق کا بول بالا، انصاف اور عدالتوں کی بے انصافی، پیسے کا سیاست میں بے دریغ استعمال، معاش کے لئے ملک سے ہجرت، گھر گھر کے مسائل وغیرہ ملتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ایک قسم کی بغاوت دکھائی دیتی ہے، انحراف ملتا ہے، مگر یہ بغاوت یا انحراف سماج کی مثبت قدروں کے خلاف نہیں ہے، بلکہ یہ سماجی برائیوں کے خلاف شدید قسم

کا احتجاج ہے۔ یہ احتجاج سماج کو مثبت سمت دینے کی جانب ایک عملی اقدام ہے۔

اس مجموعے کے کئی افسانے ،مرزا کا گھر،بات کچھ اور تھی،مراجعت،دیواروں کے راز،دروازہ کھلنے تک،اندھیروں کا سراغ،دکھ اور سکھ کے بیچ،بارش کا دوسرا قطرہ،راکھ میں چنگاری،تسلسل،ایسے افسانے ہیں کہ ان پر کافی بات ہوسکتی ہے۔ان افسانوں میں حقیقت کے رنگ ہیں جو خالد فتح محمد کے اسلوب میں کچھ اس طرح گھلے ہیں کہ چلتی پھرتی کہانی بن گئے ہیں۔ان افسانوں کے تعلق سے حفیظ تبسم لکھتے ہیں۔

''اردو کے افسانوی ادب میں خالد فتح محمد پکی ہوئی روشنائی سے لکھا ہوا نام ہے جس کی درخشندگی آنے والے وقت کے ساتھ بڑھتی ہی جاتی ہے۔وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار یا ناول نگار، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے، مگر وہ تخلیق کا ہنر جانتے ہیں۔'' [بیک کور، دیواروں کے راز، خالد فتح محمد]

• **''نصف صدی کا قصہ''** سید محمد اشرف کے افسانوں کا کلیات ہے، جسے کافی اہتمام سے عرشیہ پبلی کیشنز نے شائع کیا ہے۔تقریباً ۷۰۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں سید محمد اشرف کے تمام افسانے شامل ہیں۔سید محمد اشرف ہمارے عہد کے ان فکشن نگاروں میں ہیں، جنہوں نے اپنی تخلیقات سے اپنی الگ شناخت قائم کی ہے۔ ۷۰ کے بعد کی نسل سے تعلق رکھنے والے سید محمد اشرف نے تہذیبی زوال اور مثبت قدروں کی پامالی کو بہتر طور پر اپنے افسانوں اور ناولوں میں پیش کیا ہے۔انہوں نے اسلامی تہذیب کے نقوش، ماحولیات اور علامتوں کا ایسا نظام پیش کیا ہے جس کی تفہیم و ترسیل آسانی سے عام قاری تک ہوجاتی ہے۔ پروفیسر نارنگ ان کی تحریر کے تعلق سے لکھتے ہیں۔:

''مجھے اپنی روح سے شرمندگی ہوگی اگر میں اس بات کا اعتراف و اقرار نہ کروں کہ سید محمد اشرف کے پہلے افسانوی مجموعے ''ڈار سے بچھڑے'' سے اردو افسانے کا ایک نیا پڑاؤ شروع ہوتا ہے۔سید محمد اشرف کے یہاں واقعیت اور علامت کا ایسا امتزاج ملتا ہے، جس کی مثال نہیں ملتی۔جب میں ان کی کہانیوں کو بار بار پڑھتا ہوں تو ان کا اسلوب، نثر، ساخت اور تھیم دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے۔'' [فلیپ کور، نصف صدی کا قصہ، سید محمد اشرف]

اس کتاب میں سید محمد اشرف کے ۳۶ افسانے شامل ہیں، جو ان کے افسانوں کی کل کائنات ہے۔ یہ کتاب سید محمد اشرف پر کام کرنے والوں کے ساتھ ساتھ ۷۰ کے بعد کے افسانے کے مزاج، علامتوں کے نظام اور بیانیہ کا افسانے میں استعمال پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔

- **''معصوم خواہش''** اشفاق برادر کے افسانوں کا تازہ مجموعہ ہے۔اس سے قبل ان کے دو افسانوی مجموعے ''مٹی کی مہک'' اور ''احساس میں پگھلتی برف'' شائع ہو چکے ہیں۔اشفاق برادر کے افسانے آج کے ماحول کے عکاس ہوتے ہیں۔آس پاس کا ان کی نظر کافی باریک بینی سے جائزہ لیتی ہے۔وہ معمولی اور سادہ سے واقعے سے بھی سنجیدہ کہانی بننے کے ہنر سے واقف ہیں۔وہ لفظوں سے کھیلنا جانتے ہیں۔اسی لئے ان کے افسانے ایک خاص قسم کا درد رکھتے ہیں۔معصوم خواہش، میں اشفاق برادر کے ۱۴ افسانوں کا مجموعہ ہے۔اس میں ان کے کئی ایسے افسانے بھی شامل ہیں، جو بے حد جذباتی ہیں، جو ہماری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ان کے منفرد افسانوں میں استہار، کرگس، مرہم کی تلاش، ہے بھگوان، شجر کے نام، انسان ، درخت اور بستی، کالے چہرے، چاند میں دھبے، دن کا اجالا، معصوم خواہش، موم، قبریں، فاتح، شاید، میرا فیصلہ، حدیں نہیں توڑنا، گتھی، چمن، سیاست، خواب اور میں، وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔
- **''راگ راگنی اور ورجت سُر''** شفق سوپوری کا تازہ مجموعۂ افسانہ ہے۔شفق سوپوری کا شمار ہمارے ان تخلیق کاروں میں ہوتا ہے ،جنہوں بہت لکھا اور خوب لکھا۔شفق سوپوری نے غزلیں، نظمیں، افسانے، ناول، تحقیق، تنقید، گیت، طنز و مزاح، موسیقی پر کتابیں لکھی ہیں۔ان کے ناولوں نے ایوانِ ادب میں ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔نیلما، فائرنگ رینج : کشمیر ۱۹۹۰، موسیٰ، کوشل خاتون، دریا ہے چشمِ گریہ ناک ،وغیرہ سے شفق سوپوری نے اپنی الگ پہچان بنائی ہے، جو حقیقی واقعات کو قصے کہانیوں میں ڈھالنے پر مہارت رکھتا ہے۔شفق سوپوری کے افسانوں کا یہ مجموعہ بھی روایت سے انحراف ہے۔اس میں کل پانچ افسانے ہیں۔اس کتاب کے ۱۱۲ صفحات پر صرف پانچ افسانے ہیں۔جن میں تین طویل اور مختصر افسانے ہیں۔یہ سبھی افسانے کشمیر کے تازہ ترین واقعات و حادثات پر مبنی ہیں۔ان میں کشمیر کی زندگی، وہاں کی معاشی بدحالی، نئی نسل، دہشت گردی، اسپانسرڈ دہشت گردی، فوجی تشدد، بے روزگاری، نفرت کا بازار، سیاسی شعبدہ بازیاں، کھیتوں میں بوئی گئی بارود، مذہب کے نام پر فرقہ پرستی کا کاروبار، تعلیم کے نام پر مستقبل سے کھلواڑ، نوجوانوں کا اغوا، عالمی سیاست، آزادی کے نام پر نظر بندی کا تماشہ وغیرہ کو کما حقہ اپنے خاص اسلوب کے ذریعہ افسانوں میں ڈھالنے کا ہنر شفق سوپوری کو آتا ہے۔اسی لئے ان کے افسانے حقیقی قصے لگتے ہیں۔ان کے افسانے راگ اگنی اور ورجت سُر، نخلِ گریہ، فیک انکاونٹر، مچک زا، زرد رنگ کا گدھ، جہاں مختلف علامتوں میں واقعات بیان کرتے ہیں، وہیں کشمیر کے ساتھ ساتھ ہر اس خطے کے مسائل کو آواز دیتے

ہیں جہاں ظلم کا بازار گرم ہے۔افسانے میں بیان ہوئی علامتیں گنجلک نہیں ہیں، بلکہ عام لوگوں کے فہم و ادراک میں آسانی سے آجاتی ہیں۔

• ''**مونتاژ**'' نئی نسل کی معروف افسانہ نگار فارحہ ارشد (پاکستان) کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔جسے دستاویز مطبوعات نے شائع کیا ہے۔فارحہ ارشد نئی نسل کی ایسی افسانہ نگار ہیں، جنہوں نے بے باکی سے سماج کی بخیہ ادھڑی ہے۔اپنے آس پاس یعنی پاکستان کے میں سماج میں مردوں کی اجارہ داری اور مردانہ طاقت کے نشے میں دھت انسان کے عورت پر مظالم کے خلاف لفظوں میں اپنا احتجاج بلند کیا ہے۔ان کے افسانے آج کے عہد کی عورت کا بغاوت نامہ ہیں۔ماحول کی سفاکی، عورت کو شئے سمجھنے اور استعمال کرنے والی ذہنیت کی پرزور تردید کی ہے۔مونتاژ، میں فارحہ ارشد کے ۲۲ افسانے شامل اشاعت ہیں۔یہ سبھی افسانے موضوعاتی سطح پر مختلف ومنفرد ہیں۔فارحہ ارشد کا اسلوب بے حد متوازن ہے اور افسانوں کی فضا کے عین مطابق ہے۔پچھلے برسوں فارحہ ارشد کے مشہور ہونے والے افسانے،توبہ سے ذرا پہلے، ڈھائی کمبل کا خدا، دس گھنٹے کی محبت وغیرہ بھی شامل ہیں۔

''ان کے ہاں کچھ افسانے ایسے ہیں جہاں وہ اپنے آپ کو اسی طرح الگ تھلگ کرتی ہیں۔الگ تھلگ، قدرے اوپرا اور زہر خند۔جیسے وہ سارا تماشا دیکھ رہی ہوں، جو وہ نہیں دیکھنا چاہتیں ااور دکھی ہو کر کسی اور طرف دیکھنے پر مجبور ہوں۔ایسے افسانوں میں واقعات تسلسل میں چلتے ہیں یا کم از کم واقعات کے ایک تسلسل میں رہنے کا احساس برقرار رہتا ہے۔''

[فارحہ ارشد کے افسانے: ایک تاثر، شاہد حمید، مونتاژ، فارحہ ارشد، ص ۱۱]

فارحہ ارشد کے افسانے پاکستان کی نئی نسل کی نمائندگی کرتے ہوئے ظلم و زیادتی کے خلاف احتجاج ہیں۔ہر وہ ظلم جو عورت پر ہوں، انسانیت پر ہوں، جنسی درندگی ہو یا مذہبی حصار بندی، قدیم روایات کا بندھن ہو یا تعلیم یافتہ بے روزگاری کی گھٹن ہو، سیاسی شعبدہ بازیاں ہوں یا گھریلو تشدد، فارحہ ارشد ان موضوعات کو بہتر طور پر افسانے میں ڈھالنے کا ہنر جانتی ہیں۔ان کے پاس خوبصورت زبان ہے۔ان کے اچھے اور عمدہ افسانوں میں گرہن گاتھا، ایک تصویر خدا کے بغیر، امیر صادقین تم کہاں ہو؟، آدھی خودکشی، زمیں زادہ، حویلی مہر داد کی ملکہ، مورخ میری تاریخ نہ لکھنا کا شمار ہوتا ہے۔

• ''**تشبیہ میں تقلیب کا بیانیہ**'' نورین علی حق کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔نورین نوجوان افسانہ نگار ہیں اور ان کی نظر نئے معاملات پر بڑی گہری ہے۔وہ صحافی بھی ہیں۔ان کے پیروں میں چکر ہیں۔وہ

سماج کو بہت قریب سے دیکھتے ہیں۔ایسے نوجوان کو اگر لکھنے کا سلیقہ آتا ہو، اسلوب میں تازگی ہو اور اس کے پاس حساس دل ہو تو وہ اچھے افسانے لکھ سکتا ہے۔اور یہ تمام خوبیاں نورین علی حق میں جمع ہو گئی ہیں۔اسی باعث ان کے افسانوں میں ایک الگ قسم کا سوز وگداز ہے۔ایک انفرادیت ہے جو انہیں ان کے معاصرین سے الگ کرتی ہے۔ان کے ایک افسانے کا اقتباس دیکھیں۔:

''فضا میں روحانیت کے ساتھ تپش کا احساس بھی ہو رہا ہے۔بہت غور کرنے پر صرف 'لا' کی صدا سمجھ میں آ رہی ہے۔'لا' کی صوتی تفہیم کے بعد منظر نامہ بدلتا جا رہا ہے۔لیکن 'لا' کی تعبیر ممکن نہیں۔'لا' کے مسلسل اقرار سے شاید دنیا کے انکار کا امکان روشن ہو رہا ہے۔اس کی ضربوں کی رفتار بڑھتی جا رہی ہے۔دل کی کیفیت بھی بدل رہی ہے''

[افسانہ، تشبیہ میں تقلیب کا بیانیہ، مجموعہ، تشبیہ میں تقلیب کا بیانیہ، نورین علی حق، ص ۱۵۵]

آپ نے دیکھا افسانہ نگار نے کہانی کے بیان کے لئے، کیسا اسلوب اختیار کیا۔یہ کتاب کا ٹائٹل افسانہ ہے۔اس میں ایک مجذوب فقیر اور ہرن کا قصہ ہے۔یہاں عرفانِ الٰہی کی بات ہے۔تصوف کا بیان ہے۔بہت دنوں بعد ایسی کہانی پڑھنے کو ملی ہے۔نورین علی حق کے بہت سے افسانے گہرائی اور توجہ سے مطالعے کے متقاضی ہیں۔ان افسانوں کا گہرا مطالعہ قاری پر بہت سے جہان روشن کرے گا۔ان افسانوں میں ظاہر کے ساتھ ساتھ فرد کے باطن کا بھی علم ہوتا ہے۔یہ افسانے جہاں سماج میں آ رہی تبدیلیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں، وہیں انسان کی نفسیات کا بھی پتہ دیتے ہیں۔قسطوں میں مرنے والے کا نوحہ، بوسیدہ حویلی میں رقص، بای ذنب قتلت، پنجرے میں قید نیند، ایک سہما ہوا آدمی، حسرتوں کے چراغ، شکار سے دو قدم آگے، سپیدیٔ سحر نورین علی حق کے ایسے ہی افسانے ہیں، جو ہمیں غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔

- ''**یہ سسکتے لوگ**'' ساوتری گوسوامی کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے۔ساوتری گوسوامی آسٹریلیا میں تھیں۔یہ سبھی مجموعے ان کے انتقال کے بعد نذیر فتح پوری نے اسباق پبلی کیشنز سے شائع کئے۔ساوتری گوسوامی ساری زندگی اردو میں افسانے لکھتی رہیں۔

ساوتری گوسوامی کے افسانے معاشرتی افسانے ہیں۔ان میں ہندوستان کے ماحول، پیار نفرت، بغض وعداوت، فرقہ پرستی کے ساتھ عورت کے ساتھ سماج کے سلوک کو پیش کیا گیا ہے۔آسٹریلیا میں عورت کی آزادی، وہاں کا ماحول، تنہائی، اکیلا پن، بزرگوں کی حالت کو ساوتری گوسوامی نے سیدھے سادے انداز میں بیان کیا ہے۔ان کے اچھے افسانوں میں ان کہی، ہار

جیت، پیاس، زرد پتے، بیلن وین، انوکھا لاڈلا کا شمار ہونا چاہیے۔

• **''میں اور میرے خواب''** نذیر فتح پوری کے مختلف خواب پارے ہیں، جو افسانے کی شکل میں بیان ہوئے ہیں۔ نذیر فتح پوری اردو میں مناظر عاشق ہرگانوی کے بعد سب سے زیادہ لکھنے اور چھپنے والے ادیب وشاعر ہیں۔ اردو کی شاید ہی کوئی صنف ایسی ہو، جس میں انہوں نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ ان کے کئی ناول، ناولٹ، افسانچوں کے مجموعے اور کئی افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ کورونا جیسی مہلک بیماری کے وقت جہاں دنیا میں سونا پن، تنہائی، سناٹا، اکیلے پن نے سب کو گھیر رکھا تھا۔ سنکڑوں لوگ لقمہء اجل ہو گئے تھے۔ نذیر فتح پوری کا قلم مستعدی سے چلتا رہا اور انہوں نے لاک ڈاؤن میں بیس کہانیاں لکھ ڈالیں۔ کورونا کے حالات سے پر یہ کہانیاں پچھلے سال 'کورونا کی بیس کہانیاں' کے نام سے شائع ہوئیں۔

'میں اور میرے خواب' میں نذیر فتح پوری نے ایک تجربہ کیا ہے کہ ان میں موضوعات کی مماثلت کو انداز بیان سے مختلف ومنفرد بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں نذیر فتح پوری نے تقریباً ۶۵ خوابوں کا بیان کیا ہے۔ اس میں کچھ خواب تو بہت متاثر کرتے ہیں۔ مگر بعض خواب تو بھرتی کے لگتے ہیں۔ چند خواب ایسے ہیں جو بعض زندہ شخصیات کے بارے میں ہیں۔ نذیر فتح پوری کا اندازِ بیان خوابوں کو قصے کہانوں میں ڈھال دیتا ہے۔

• **''منٹو کا بھگت''** سید تحسین گیلانی (پاکستان) کا افسانوی مجموعہ ہے۔ جسے میٹرلنک پبلشرز نے شائع کیا ہے۔ سید تحسین گیلانی معروف افسانہ نگار ہیں۔ 'انہاک' نامی ضخیم رسالہ نکالتے ہیں۔ انہاک انٹر نیشنل فورم کے نام سے فیس بک پر ایک گروپ چلاتے ہیں۔ مائیکروفکشن کو پروموٹ کرنے میں سرفہرست ہیں۔

مذکورہ کتاب آپ کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ آپ دراصل دنیا کے کئی ممالک میں رہ چکے ہیں۔ لہٰذا عالمی سطح پر بہت سے مسائل سے بخوبی واقف ہیں، جن کا اظہار آپ کے افسانوں اور مائکرو فکشن میں ہوتا ہے۔ آپ کا اسلوب، آپ کو ممتاز کرتا ہے۔ موضوعات کا انتخاب مثلاً دہشت گردی، مذہبی جنون، سیاسی جبر، عورتوں پر ظلم واستبداد، نئی نسل کا معاش کے لئے غیر ممالک کی ہجرت، حب الوطنی کا نشہ، کالے گورے کا امتیاز، مسلمانوں کے عالمی مسائل جیسے معاملات آپ کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ اس مجموعے میں پندرہ افسانے اور سات مضامین شامل ہیں۔ افسانوں میں منٹو کا بھگت، لا۔ شے، برا کہانی کار، اماوس نگری، کہانی ایک خواب کی، یہ قصہ کچھ اور ہے، چائے کی

پیالی، کیمیکل، کہانی کتھا وغیرہ اچھے افسانے ہیں۔

• **''یادوں کے جھروکے''** ڈاکٹر نگار عظیم کے زیرِ ترتیب شائع ہوئی ہے۔ یہ ''بنات'' کی پہلی کتاب ہے۔اس میں تقریباً چار درجن کہانیاں ہیں، جو یادوں پر مشتمل ہیں۔ان کا انداز اور بیان افسانے جیسا ہی ہے۔اس کتاب میں بنات کی ممبران کی ہی تخلیقات شامل ہیں۔ نگار عظیم، بلقیس ظفیر الحسن، ذکیہ مشہدی، قمر جمالی، صبیحہ انور، نعیمہ جعفری پا شا، عذرا نقوی، ثروت خان، افشاں ملک، آصف اظہار علی، تسنیم کوثر، نصرت شمسی، فریدہ رحمت اللہ، شبینہ فرشوری، رفیعہ نوشین، سفینہ جیسی افسانہ نگاروں کی کہانیاں شامل ہیں۔

اس کتاب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں یادوں کو افسانے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ سبھی ایک تجربہ ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ بنات نے یہ ایک کامیاب تجربہ کیا ہے۔ بین الاقوامی نسائی ادبی تنظیم کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس پلیٹ فارم کے ذریعہ نہ صرف اردو اور ادب کا فروغ جاری ہے بلکہ سماجی خدمات میں بھی یہ تنظیم آگے آگے ہے۔ بنات کی صدر ڈاکٹر نگار عظیم اپنے پیش لفظ میں لکھتی ہیں۔

''ادب اور تخلیق ذاتی ہوتے ہوئے بھی ایک سماجی عمل ہے۔ ہر ادیب پر سماجی ذمہ داریاں ایک عام شہری سے زیادہ ہوتی ہیں۔ بہتر سماجی زندگی کے لئے وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہمیشہ سے ہوتی رہی ہیں۔ سنجیدہ ادیب کو ان سماجی تبدیلیوں کا ادراک ہونا بہت ضروری ہے۔ ساتھ ہی مصروف عمل ہونا اس بھی زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ ہر پہلو سے ادب کا مرکزی موضوع تو انسان ہی ہے۔ جب بات ہم خاتون کریں گے تو ظاہر ہے ایک ماں، بیوی، بیٹی، بہن، محبوبہ کسی بھی روپ میں محبتوں سے سرشار اس کا وجود اپنے فرائض کے تئیں کس قدر سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ بس تبھی دل سمندر بن جاتا ہے۔''

[یادوں کے جھروکے، مرتبہ: نگار عظیم، بنات، ص، ۹]

• **''اجڑتے لمحوں کی کھیتیاں''** رتن سنگھ کنول پہلگامی کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جسے میزان پبلشرز نے شائع کیا ہے۔ رتن سنگھ کنول بنیادی طور پر پنجابی کے مصنف ہیں۔ وہ اردو میں بھی افسانے لکھتے رہے ہیں۔ یہ ان کا اردو میں پہلا مجموعہ ہے۔ رتن سنگھ کنول کشمیر کے رہنے والے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے افسانوں میں کشمیر کے لوگوں دکھ درد اور غم کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ دہشت گردی، جو جی زور زبر دستیاں، کھیتی باڑی کے مسائل، نوجوانوں کے شکستہ ارمان، تعلیمی معاملات، بے روزگاری، کشمیریوں کا آپسی اتحاد، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، منافرت کا گرم ہوتا بازار جیسے موضوعات کی کثرت ملتی ہے۔

مذکورہ مجموعے میں رتن سنگھ کنول کے اٹھارہ افسانے شامل ہیں۔ڈاکٹر ریاض توحیدی کا مضمون ''رتن سنگھ کنول کے افسانوں کا معروضی جائزہ'' بھی کتاب کی زینت بنا ہوا ہے۔مجموعے کے زیادہ تر افسانے کشمیری زندگی سے متعلق ہیں۔یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ رتن سنگھ کے افسانے موجودہ صورتِ حال میں انسانی نفسیات اور مسائل کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ان کے کئی افسانے اجڑتے لمحوں کی کھیتیاں، جا خدا کے حوالے، ترپ کا پنچہ، اندر کا آدمی، فضا میں لٹکا ہوا سوال، سراب، اب نہیں، پگلا ہوا سیسہ، بہت کچھ پیچھے رہ گیا وغیرہ افسانے ان کے نمائندہ افسانے ہیں۔ان کے افسانوں میں تجربہ، ان کا مشاہدہ، ان کی حساسیت اور ان کی زبان لطف دوبالا کر دیتی ہے۔

☆'' **کلام حیدری**'' پروفیسر شہزاد انجم کے ذریعہ لکھا گیا مونوگراف ہے، جس کو اردو ڈائریکٹوریٹ بہار، نے شائع کیا ہے۔کلام حیدری اپنے زمانے کے معروف افسانہ نگار ہیں۔کلام حیدری کے افسانے زمانے کی داستان ہیں۔سماج کے غماز ان کے افسانوں میں دلکش اسلوب، علامتوں کا نظام، تجربات وغیرہ پائے جاتے ہیں۔پروفیسر شہزاد انجم سنجیدہ لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔مذکورہ مونوگراف میں کلام حیدری کی سوانح، افسانہ نگاری، صحافتی خدمات، تنقید نگاری، منتخب نگارشات شامل ہیں۔کئی افسانے تخی، زندگانی، روشنی کی ضمانت، سوانح اپنی زندگی کے کچھ سچ اور کئی اداریے مونو گرف میں شائع کئے گئے ہیں۔اس مونوگراف کے مطالعے سے کلام حیدری کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

• '' **غیاث احمد گدی**'' ڈاکٹر ہمایوں اشرف کے ذریعہ تحریر کردہ مونوگراف ہے۔جسے اردو ڈائریکٹوریٹ بہار نے شائع کیا ہے۔غیاث احمد گدی اردو کے ایک بہترین افسانہ نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ان کے افسانے، بابا لوگ، پندہ پکڑنے والی گاڑی، تج دو تج دو، افعی، کوئی روشنی، آج بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ ہیں۔ہمایوں اشرف ہماری نسل کے ایک اہم ناقد ہیں۔انہوں نے اردو فکشن تنقید میں اپنا افراد ثابت کیا ہے۔ان کی کئی کتابیں منظر کاظمی، الیاس احمد گدی، سعادت حسن منٹو، غیاث احمد گدی، وہاب اشرفی جیسے اردو کے معروف فکشن نگاروں پر آپ کی کتابیں مشہور ہیں۔

مذکورہ مونوگراف میں غیاث احمد گدی کے ادب کو سمجھنے کے لئے ایک واسطہ ہے۔اس کتاب میں غیاث احمد گدی کی شخصیت اور ادب کے ممکنہ گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ان کے منتخب

افسانے بھی مونوگراف میں شامل ہیں۔

• ''احمد یوسف'' ڈاکٹر اصف سلیم کے ذریعہ تحریر کردہ مونوگراف ہے، جسے اردو ڈائریکٹوریٹ، پٹنہ نے شائع کیا ہے۔ا حمد یوسف نے آزادی کے بعد ہی افسانے لکھنا شروع کر دیا تھا۔بہار کے تین افسانہ نگاروں، غیاث احمد گدی، کلام حیدری اور احمد یوسف کا نام بہت تیزی سے ابھرا۔احمد یوسف کے افسانے انفرادیت کے حامل تھے۔ان کے چار افسانوی مجموعے ،روشنائی کی کشتیاں(۱۹۷۶) آگ کے ہمسائے(۱۹۸۰) ۲۳ گھنٹے کا شہر(۱۹۸۴)،رزم ہو یا بزم ہو،ایک ناولٹ،جلتا ہوا جنگل(۲۰۰۸)،اور دیگر کتب شائع ہوئیں۔

ڈاکٹر آصف سلیم نے بڑی محنت سے احمد یوسف سے متعلق معلومات کو جمع کیا ہے۔انہوں نے احمد یوسف کی افسانہ نگاری، ناولٹ نگاری، خاکہ نگاری، ترجمہ نگاری کے علاوہ مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ساتھ ہی احمد یوسف کے نمائندہ افسانے ،تلوار کا موسم، چراغِ کشتہ،صورت ایک بے کیفی کی، ہوا یہ ایک دن، کے علاوہ ناولٹ جلتا ہوا جنگل کا ایک باب نمونے کے لئے دیے ہیں۔جن کے مطالعے سے احمد یوسف کی فکشن نگاری سے متعلق بہت کچھ واضح ہوجاتا ہے۔

☆اس سال افسانچوں کی بھی کئی مجموعے شائع ہوئے۔

• ''کھول دو'' تنویر اختر رومانی کے افسانچوں کا پہلا مجموعہ ہے۔اس کتاب کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیا ہے۔تنویر اختر رومانی ایک منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''ببول'' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔جس نے ادبی حاقوں میں کافی پذیرائی حاصل کی۔تنویر اختر رومانی کے افسانے شہروں اور دیہات کے انسان کے اندرونی کشمکش اور جذبات کی ترجمانی کے افسانے ہیں۔مذکورہ کتاب کے نام سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ منٹو کے مشہور افسانے سے متعلق کتاب ہوگی۔دراصل تنویر اختر رومانی نے بین التونیت کے ذیل میں یہ کامیاب تجربہ کیا ہے کہ انہوں نے اردو کے مشہور و معروف افسانوں پر افسانچے قلمبند کئے۔جنہیں ری میک افسانچے کہا گیا۔اردو افسانچے کی روایت میں تنویر اختر رومانی نے پہلی بار ری میک افسانچے لکھے۔اس کتاب میں بارہ ری میک افسانچے جن میں عید گاہ، کفن، پنچایت(پریم چند) کول دو، بو(سعادت حسن منٹو) بابا لوگ(غیاث احمد گدی) رئیس خانہ(احمد ندیم قاسمی) لحاف(عصمت چغتائی) لاجونتی(راجندر سنگھ بیدی) جیسے افسانوں پر افسانچے اس طرح لکھے گئے ہیں کہ اصل افسانے کا مزاج ا، اختتام اور تاثر دوبالا ہوجاتا ہے۔دوسرے حصے میں ۱۶۹ افسانچے ہیں جو ان کی ۵۵ سالہ ادبی سفر کی یادگار ہیں۔

• ''نشتر'' محمد علی صدیقی کے افسانچوں کا پہلا مجموعہ ہے، جسے رائل اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔ دراصل محمد علی صدیقی نے اپنے افسانچوں کے ذریعہ سماج میں پھیلی برائیوں پر نشتر زنی کی ہے۔ ان کے افسانچے سماج کے نشیب وفراز، فرقہ پرستی، کذب گوئی، دہشت گردی، فریب و مکاری، انسانی نفسیات، سیاسی بدعنوانیاں، رشوت ستانی، بدخلاقی، بے روزگاری، برادرانہ انتشار، طبقاتی کشمکش اور مغربی بنگال کی مخصوص صورت حال جیسے موضوعات پر افسانچے قلمبند کئے۔

''نشتر'' میں ان کے ۸۷ افسانچے شامل ہیں۔ یہ سبھی افسانچے فن افسانچہ نگاری کے سانچے میں ڈھلے ہیں۔ ان میں موضوعات کا ٹکراؤ بھی نہیں۔ کچھ افسانطے متاثر کرتے ہیں، مثلاً کھلونے، درد کا رشتہ، بھوک، ہمزاد، شجر ممنوعہ، کھلا گوشت، بانجھ، بڑا سوال، پر چھائیں، چائے، ناسمجھ، پاگل، ایندھن، خالی بیڈ، وحشی، کبوتر اڑ گئے، فلیش بیک، شان والی ایسے افسانچے ہیں جو محمد علی صدیقی کی شناخت بنیں گے۔

• ''**گلشن افسانچہ: منتخب افسانچے**'' خالد بشیر تلگامی کی ترتیب دی ہوئی کتاب ہے۔ خالد بشیر تلگامی خود بھی ایک افسانچہ نگار ہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں ۷۱ افسانچہ نگاروں کو شامل کیا ہے۔ کتاب میں ۱۲۱ افسانچے شامل ہیں۔ کتاب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ افسانچہ نگاروں کا مختصر تعارف بھی درج کیا گیا ہے۔ اس میں سے زیادہ تر افسانچے وہاٹس ایپ گروپ ''گلشن افسانچہ'' پر شائع ہو چکے ہیں۔ یہ افسانچے زندگی کے فلسفے، آس پاس کے ماحول، انسان کے بدلتے مزاج، دوہرا پن، فرقہ پرستی، مندر و مسجد کے قصے، سماجی نشیب و فراز، ظلم و ستم، طبقاتی کشمکش، دہشت گردی کے مختلف روپ، فوجی آمریت، بے روزگاری، چھل کپٹ، دھوکہ وفریب، محبت والفت، نفرت کا پھیلتا کاروبار وغیرہ موضوعات کو اپنے دامن مین میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ مرد اور خواتین کے افسانچے الگ الگ دیے ہیں، جبکہ ایسی تفریق کی ضرورت نہیں ہے۔

☆اس برس تنقیدی مجموعے یا فکشن تنقید پر مسلسل کتاب خاصی تعداد میں سامنے آئیں۔

''**اردو کے ۱۲۳ افسانہ نگار اور ان کا پہلا افسانہ**'' ڈاکٹر محمد پرویز کی شہرت یافتہ کتاب ہے۔ شروع میں لوگوں میں یہ تجسس تھا کہ وہ کون سے افسانہ نگار ہیں جن کا اس کتاب میں ذکر ہے۔ بعد میں کھلا کہ ڈاکٹر پرویز نے اپنی پسند اور سہولت کے مطابق کام کیا ہے۔ ویسے یہ کتاب اپنی نوعیت کی منفرد کتاب تھی۔

اس کتاب میں ڈاکٹر پرویز نے علی محمود، علی عباس حسینی، کوثر چاند پوری، حیات اللہ انصاری، مجنوں گورکھپوری، ہنس راج رہبر، صالحہ عابد حسین، شکیلہ اختر، بلونت سنگھ، رام لعل، جوگندر

پال،غیاث احمد گدی،کلام حیدری،انور خان،شموئل احمد،قمر جہاں،حسین الحق،شوکت حیات،عشرت بیتاب،اقبال حسن آزاد،پیغام آفاقی،صادقہ نواب سحر کے پہلے افسانے اور افسانہ نگار کا تعارف بھی پیش کیا ہے۔ان افسانوں کے مطالعے سے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔بعض ایسے بھی افسانہ نگار ہیں،جن کے پہلے افسانے ہی نقش اول ثابت ہوئے اور انہوں نے مزید اچھے افسانے تخلیق کئے۔بعض افسانہ نگاروں نے دوسرے اور تیسرے افسانے سے رفتار پکڑی اور وہ اپنے عہد کے اچھے افسانہ نگار ثابت ہوئے۔اس سے کئی دور کی افسانہ نگاری کا بھی پتہ چلتا ہے۔اس فہرست میں حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں تو رومانی شناخت والے بھی،اس میں ترقی پسند ہیں تو جدیدیے بھی،مابعد جدید ہیں تو نئی صدی کے لکھنے والے بھی ہیں۔خواتین افسانہ نگار ہیں تو غیر مسلم افسانہ نگار بھی۔یہ کتاب اپنے آپ میں انفرادیت کی حامل ہے۔

• **چھٹا پروفیسر شمیم نکہت یادگاری خطبہ ''ہم عصر اردو فکشن''** کتابچے کی شکل میں سامنے آیا۔۶۴ صفحات پر مشتمل اس کتابچے میں پروفیسر شمیم نکہت اور پروفیسر ابن کنول کے تعارف کے ساتھ پروفیسر ابن کنول کے ذریعہ دیے گئے خطبے کو شائع کیا گیا ہے۔پروفیسر ابن کنول نے ترقی پسند افسانے کا ذکر کرتے ہوئے جدید اور مابعد جدید افسانے کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔اکیسویں صدی کے افسانے پر موصوف نے سرسری نگاہ بھی ڈالی ہے۔

• **''الیاس احمد گدی:حیات ونشانات''** ڈاکٹر ہمایوں اشرف کی مرتب کردہ کتاب ہے۔جسے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔۹۴۴ صفحات کی کتاب میں ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے الیاس احمد گدی کی شخصیت اوران کی تخلیقات سے متعلق ہر گوشے پر ماہرین کے مضامین کو یکجا کردیا ہے۔الیاساحمد گدی پر ریسرچ کرنے والے محققین کے لئے یہ کسی تحفے سے کم نہیں۔کتاب میں تقریباً ۸۰ مضامین شامل ہیں جوالیاس احمد گدی کے تعلق سے وضاحت کے ساتھ ہر گوشے پر سیر حاصل مواد فراہم کرتے ہیں۔کتاب میں شمیم حنفی،وارث علوی،علی احمد فاطمی،علیم اللہ حالی،انور پاشا،عبدالقیوم ابدالی،عبدالمغنی،احمد یوسف، انیس رفیع،مناظر عاشق ہرگانوی،قیصر شمیم،مشرف عالم ذوقی،نامی انصاری،اے خیام،آفتاب احمد آفاقی،شہاب ظفر اعظمی،عارفہ بشریٰ،وغیرہ نامی گرامی لوگوں کے مضامین شامل ہیں۔خود مرتب کا تقریباً ۶۰ صفحات کا مقدمہ اور کئی مضامین کتاب میں موجود ہیں۔

• **''شفیع مشہدی کے افسانے''** ڈاکٹر ہمایوں اشرف کی مرتب کردہ کتاب ہے۔کتاب میں شفیع

مشہدی کے ۳۰ افسانے شامل ہیں۔جن کے مطالعے سے شفیع مشہدی کی افسانہ نگاری کو کسی حد تک سمجھا جا سکتا ہے۔ان افسانوں کے متعلق ڈاکٹر ہمایون اشرف کا طویل مضمون (۴۴) بھی شامل کتاب ہے،جس سے شفیع مشہدی کی افسانہ نگاری کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل روشنی پڑتی ہے۔شفیع مشہدی کے تعارف میں افسانے کے علاوہ ان کے دیگر ادبی کارناموں اور ان کی شخصیت کے بارے میں بھرپور معلومات حاصل ہوجاتی ہیں۔

شفیع مشہدی کے افسانوں میں ان کے سبھی معروف افسانے شامل ہیں۔کرچیاں،سینچر شاہ، بنتِ زلیخا،سید کی حویلی،طوطے کا انتظار،گرتی دیواریں،جلدی کرو،مٹی کی خوشبو،میک اپ،کبوتر،روشنی کی آگ، نیلے بادبان والی کشتی،آ ہنی ہے پیرہن وغیرہ شامل ہیں،جن کے مطالعے سے شفیع مشہدی کے افسانوں کو سمجھا جاسکتا ہے۔

• **''اردو فکشن اور اسلم جمشید پوری کی تنقیدی بصیرت''** عرفان عارف کی مرتب کردہ کتاب ہے۔جسے قاسمی کتب خانہ،جموں نے عمدگی سے شائع کیا ہے۔عرفان عارف نوجوان شاعر ہیں۔تحریک بقائے اردو،نامی تنظیم چلاتے ہیں،جس کا روزانہ جلسہ فیس بک کے ذریعہ منعقد ہوتا ہے۔ان کی کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔کتابِ ہٰذا میں انہوں نے اسلم جمشید پوری کے ناول،افسانے اور افسانچے پر لکھے مضامین کو جمع کیا ہے۔اور ایک مقدمہ لکھا ہے۔ساتھ ہی بڑی عرق ریزی سے صاحبِ مضامین کا تعارف نامہ جو تقریباً ۴۰ صفحات پر مشتمل ہے،تیار کیا ہے۔یہ مضامین طالب علموں کے لئے خصوصاً بہت مفید ہیں۔

''اکیسویں صدی میں اردو ناول'' منظور حسین کی کتاب ہے،جسے قاسمی کتب خانہ،جموں نے شائع کیا ہے۔منظور حسین نوجوان اسکالرز ہیں۔وہ ایسے کام کرتے رہتے ہیں۔مذکورہ کتاب میں منظور حسین نے اس کتاب میں دو درجن ایسے ناولوں پر مختلف اسکالرز کے مضامین کو یکجا کیا ہے،جو اکیسوں صدی میں شائع ہوئے۔کئی اہم اسکالرز کے ناول پر لکھے گئے مضامین کتاب میں شامل ہیں۔قدوس جاوید،علی احمد فاطمی،صغیر افراہیم،غضنفر،سید احمد شمیم،مولا بخش،انتخاب حمید،نورالحسنین،سید محمد اشرف،خلیل مامون،ریاض احمد،ریاض توحیدی،شاداب علیمکے مضامین طالب علموں کی صحیح رہنمائی کے لئے کافی ہیں۔

• **''آدھی دنیا کا مکمل جہان''** ڈاکٹر شمع اختر کاظمی کی بہت اہم کتاب ہے۔شمع اختر کاظمی معروف ادیبہ ہیں۔اس سے قبل ان کی دو کتابیں 'آدھی دنیا' اور 'سورج سوا نیزے پر' منظر عام پر آ چکی ہیں۔اس

کتاب، جیسا کہ نام سے ہی واضح ہے، خواتین قلمکاروں کا تعارف اور انٹرویو شامل ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اس سے قبل اتنی تعداد میں خواتین قلم کاروں پر کائی اور کتاب میری نظر سے نہیں گذری۔ اس کتاب میں ۸۱ خواتین قلم کاروں کا تعارف اوران سے انٹرویو شامل ہے۔ ان میں سے پانچ درجن خواتین فکشن نگار ہیں۔ اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان کے ہر صوبے کی نمائندگی ہو۔ اس کتاب میں مشہور ومعروف فکشن نگاروں میں اختر سلطانہ، انورنزہت، بلقیس ظفیر الحسن، اشرف جہاں، بانو سرتاج، ثروت خان، خلیق النساء، ذکیہ مشہدی، رینو بہل، سروسہ نسرین قاضی، نفیس بانوشمع، سلمیٰ صنم، شہناز فاطمی، شہناز صبیح، شبینہ فرشوری، شہناز رحمٰن، صادقہ نواب سحر، غزالہ قمر اعجاز، فریدہ رحمت اللہ، قمر جمالی، قمر جہاں، قمر قدیر ارم، مسرور تمنا، نعیمہ جعفری پاشا، نسترن احسن فتیحی، نصرت شمسی، نشاں زیدی کے علاوہ بہت خاتون فکشن نگار اس کتاب میں شامل ہیں۔ لیکن جیلانی بانو، نگار عظیم، کہکشاں پروین، شائستہ فاخری، غزال ضیغم، صبیحہ انور، شمع افروز زیدی، سفینہ بیگم، مسرت جہاں، افسانہ خاتون، نصرت مہدی، عفت زرین، ظل ہما، ارجمند آرا، مہ جبیں غزال وغیرہ خاتون قلم کار پھر بھی رہ گئی ہیں۔ ضرور کوئی وجہ رہی ہوگی۔ ویسے اس کام کے لئے ڈاکٹر شمع اختر کاظمی مبارک باد کی مستحق ہیں۔

• **''اردو ناول اور ناولٹ''** پروفیسر اسلم جمشید پوری کی نئی کتاب ہے۔ ۳۶۸ صفحات کی اس کتاب کو ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نے بہت اچھے گیٹ اپ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں ناول اور ناولٹ کے متعلق تحقیق مضامین اور تجزیے شامل ہیں۔ ان مضامین کے ذریعہ ادب کی دنیا میں ناولٹ کو لے کر جو کنفیوژن ہے، اسے دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کے آخر میں ۲۰۰۰ سے ۲۰۲۲ تک شائع ہونے والے ناولوں کی ایک فہرست دی گئی ہے۔ ساتھ ہی ابتدا سے اب تک کے خاص ناولٹس کی بھی ایک فہرست دی گئی ہے۔ جو ناول یا ناولٹ پر تحقیقی وتنقیدی کام کرنے والوں کے لئے انتہائی مفید ہے۔

• **''ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کے نمائندہ افسانے''** عمران عاکف خان کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ جسے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیا ہے۔ عمران عاکف خان خود بھی ایک اچھے فکشن نگار ہیں۔ جے این یو کمرہ نمبر ۲۵۹ اور جامعہ گیٹ نمبر ۷ دو ناول سے عمران نے نئے فکشن نگاروں میں اپنی الگ شناخت قائم کی ہے۔

کتاب ہٰذا میں عمران عاکف خان نے نعیمہ جعفری پاشا کے افسانوں کا ایک انتخاب شامل

کیا ہے۔نعیمہ جعفری پاشا کے ۲۸ افسانے کتاب میں شامل ہیں۔ان افسانوں کے مطالعے سے نعیمہ جعفری کی افسانہ نگاری کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ان افسانوں میں نعیمہ جعفری پاشا کے مشہور و مقبول افسانے شامل ہیں۔چوتھی کا ایک اور جوڑا،امر بیل،بابل کا آنگن،ٹوٹا ہوا آدمی،کرائے کی کوکھ،زہریلی دھوپ،اف یہ آسمان،خوبصورت،آنکھوں کی مہکتی خوشبو،چاند کا داغ،داغدار اجالا،کینچوے،ایک وفا ایسی بھی،وغیرہ نعیمہ جعفری پاشا کے اچھے اور نمائندہ افسانے ہیں۔پھر عمران عاکف خان کا طویل مقدمہ بعنوان''مابعد جدید افسانے کا نمائندہ نام: ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا'' موصوفہ کے افسانے کی تفہیم میں معاون ہوتا ہے۔مگر میرا خیال ہے کہ نعیمہ جعفری پاشا کو مابعد جدید کے خانے میں رکھنا مناسب نہیں۔ان کے زیادہ تر افسانے ترقی پسندی کا رنگ لئے ہوئے دل کو چھو لینے والے افسانے ہیں۔اگر کتاب میں نعیمہ جعفری پاشا کا تعارف بھی شامل ہوتا تو ان پر کام کرنے والوں کو آسانی ہوتی۔

• ''**اردو ناول: نظری اور عملی تنقید**'' ڈاکٹر سفینہ بیگم کی ایک اہم تنقیدی کتاب ہے۔ناول کی تنقید پر مبنی اس کتاب کو عرشیہ پبلی کیشنز نے شائع کیا ہے۔یہ کتاب ناول کے متعلق بغربی نظریات کے ساتھ ساتھ اردو میں موجود ناول کی تنقید سے بھی بحث کرتی ہے۔سفینہ بیگم ایک سنجیدہ طالب علم ہیں۔وہ خود بھی ناول نگار ہیں۔گذشتہ برسوں ان کا ناول ''خلش'' ادبی حلقوں میں سراہا جا چکا ہے۔مذکورہ کتاب میں ناول کے تعلق سے عمدہ تنقید کی گئی ہے۔ناول کی ہیئت ، پلاٹ،اسلوب،کردار،واقعات وغیرہ پر سیر حاصل بحث ملتی ہے۔اردو ناول میں وجودی عناصر،ناول تنقید کے امکانات،ناول میں اظہار و بیان کے مسائل،اردو ناول میں تاریخ کے تجربات،اردو ناول کی تانیثی قرات،ناول کا تصور اور اس کی ساخت، بین المتونیت اور اردو ناول، جیسے موضوعات سے سفینہ بیگم نے صحت مند بحث کی ہے۔ساتھ ہی اردو ناولوں کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

سفینہ بیگم نے اپنی کتاب میں کئی چاند تھے سر آسماں (شمس الرحمٰن فاروقی) غلام باغ،حسن کی صورت حال (مرزا اطہر بیگ) خواب سراب (انیس اشفاق) آخری سواریاں (سید محمد اشرف) شہرِ لازوال،آباد ویرانے (بانو قدسیہ) جیسے معرکتہ الآرا ناولوں کا مختلف زاویے سے مطالعہ پیش کیا ہے۔ان ناولوں کے مطالعے میں ناول کی نظری اور عملی تنقید کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ناول پر کام کرنے والے اسکالرز اور تحقیق کے طالب علموں کے لئے یہ کتاب بہت ضروری ہے۔

• ''**قرۃ العین حیدر کے منتخب افسانے**'' ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ کی مرتب کردہ کتاب ہے جو ماڈرن پبلشنگ

ہاؤس نے شائع کی ہے۔ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ کی اس سے قبل بھی ایک کتاب ’’قرۃ العین حیدر کے نمائندہ افسانے‘‘ منظر عام پر آچکی ہے۔ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ ایم۔فل اور پی ایچ۔ڈی بھی قرۃ العین حیدر پر کی ہے۔اسی لئے ان سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ قرۃ العین حیدر کے فکشن پر اچھی خاصی نظر رکھتی ہوں گی۔امید کے عین مطابق ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ نے عینی آپا کے ایسے افسانے منتخب کئے ہیں،جن کا تعلق نصاب سے ہے۔اودھ کی شام،مونا لیزا،جہاں کارواں ٹھہرا تھا۔جلا وطن،برف باری سے پہلے،ڈالن والا،یاد کی ایک دھنک چلے،سکریٹری،دو سیاح اور فقیروں کی پہاڑی،جیسے افسانوں کی شمولیت اور ان کے تجزیے رسرچ اسکالرز کے لئے بڑے کام کے ہیں۔آپ نے اس کتاب میں ایک مقدمہ بھی لکھا ہے۔جس میں انہوں نے قرۃ العین حیدر کے فکشن اور خاص کر افسانوں سے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔

’’تنقید وتعبیر‘‘ ڈاکٹر زرینہ بیگم کے مضامین کا مجموعہ ہے۔یہ کتاب ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نے شائع کی ہے۔ڈاکٹر زرینہ بیگم ویسے تو بنیادی طور پر شاعرہ ہیں۔مگر ان کے مختلف مضامین ہندو پاک کے ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔تنقید وتعبیر،ان کے مضامینکا پہلا مجموعہ ہے۔اس کتاب کو مصنفہ نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔پہلے حصے میں شاعری پر تنقیدی مضامین شامل کئے ہیں۔دوسرے حصے میں فکشن پر تنقیدی مضامین شامل ہیں۔جنمیں پریم چند،ترقی پسند افسانے،عصمت چغتائی،پریم چند کے بعد اردو افسانہ،اور نئے اردو افسانے پر خاطر خواہ مضامین شامل ہیں۔

• **’’قدرت اللہ شہاب کے منتخب افسانے اور تجزیے‘‘** ڈاکٹر شبستاں آس محمد کی کتاب ہے۔اس کتاب کو ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیا ہے۔ڈاکٹر شبستاں ابھرتی ہوئی ناقد ہیں۔ان کی اس قبل ایک کتاب ’’جہان قدرت اللہ شہاب‘‘ شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہے۔جس میں انہوں نے قدرت اللہ شہاب کی سوانح،ناولٹ،افسانے،وغیرہ پر تنقیدی بحث کی ہے۔ڈاکٹر شبستاں نے ایم فل اور پی ایچ۔ڈی بھی قدرت اللہ شہاب پر مکمل کی ہے۔

مذکورہ کتاب’’ ’’قدرت اللہ شہاب کے منتخب افسانے اور تجزیے‘‘ میں ڈاکٹر شبستاں نے قدرت اللہ شہاب کے افسانوں کو جمع کیا ہے اور ان کے تجزیے بھی کئے ہیں۔یہ وہ افسانے ہیں جو آسانی دستیاب نہیں ہیں۔مثلاً چندراوتی،ماں جی،دورنگا،جال،پہلی تنخواہ،شلوار،غریب خانہ،اسٹینو گرافر،پکے آم،پھوڑے والی ٹانگ،تلاش،ریلوے جنکشن،جگ مگ افسانوں کے ساتھ ساتھ ان کے تجزیے اس کتاب میں شامل ہیں۔یہ کتاب قدرت اللہ شہاب اور ترقی پسند افسانے پر کام کرنے

والوں کے لئے خاص طور سے مفید ہے۔

• ''**کہکشاں پروین: فکری وفنی جہات**'' ڈاکٹر مکمل حسین کی مرتب کردہ کتاب ہے۔اس کتاب کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیا ہے۔اس کتاب کا پہلے حصے الف کے سارے مضامین مکمل حسین کے ہیں۔مکمل حسین نے کہکشاں پروین کی ادبی خدمات پر اچھا خاصا لکھا ہے۔کہکشاں پروین کی تحقیق،تنقید،شاعری اور افسانوں کا مکمل جائزہ پیش کیا ہے۔اس حصے میں کہکشاں پروین کے برض مشہور افسانے بھی شامل کئے ہیں۔ایک مٹھی دھوپ،دھوپ کا سفر،سرخ لکیریں،پانی کا چاند اور مور کے پاؤں جیسے مشہور افسانے شامل کئے گئے ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصے میں مشہور و معروف ناقدین اور فکشن نگاروں کے مضامین شامل کئے ہیں۔ قمر جہاں ،ہمایوں اشرف،سموئل احمد،عبیداللہ ہاشمی،اختر آزاد،غالب نشتر،ارشاد سیانوی،لائق فاطمہ نقوی،شرافت حسین،خورشید پرویز صدیقی،عرفان کوثر اور تقریباً ایک درجن اسکالرز کے مضامین شامل ہیں۔اس کتاب کے مطالعے سے کہکشاں پروین کی مکمل شخصیت اور فن ابھر کر سامنے آتا ہے،جو مکمل حسین کی تنقید کو بھی اجاگر کرتا ہے۔

• ''**افسانچہ اور افسانچہ نگار**'' کتاب اسلم جمشید پوری کی تحریر کردہ کتاب ہے، جسے ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیا ہے۔اس کتاب میں افسانچے کے فن پر تحقیقی وتنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔افسانچہ کب اور کس ادیب کے ذریعے وجود میں آیا۔کس نے اسے افسانچہ نام دیا۔کن کن افسانچہ نگاروں نے اس کے فروغ میں حصہ لیا۔موجودہ اور ماضی کے عہد کے معروف افسانچہ نگار اور ان کے افسانچے اس میں شامل ہیں۔پہلی بار افسانوں کے تجزیے بھی اس کتاب میں شامل کئے گئے ہیں۔افسانچے پر کام کرنے ولے طالب علوں کے لئے یہ کتاب کام کی ہے۔

• ''**تیرہ افسانے**'' ڈاکٹر قسیم اختر کی مرتب کردہ کتاب ہے۔قسیم اختر نوجوان لکھنے والے ہیں۔نئے نئے کام کرنا قسیم اختر کی سرشت میں شامل ہے۔ویسے اردو کے تیرہ افسانے،محمد اطہر پرویز کی مرتب کردہ مشہور کتاب ہے۔جسے ایجوکیشنل بک ہاؤس نے ائع کیا تھا۔ابھی ریشا قمر نے ''اردو کی نئی تیرہ کہانیاں'' کتاب مرتب کی ہے۔قسیم اختر نے جن تیرہ افسانوں کو شامل کیا ہے۔وہ سارے ایسے افسانے ہیں،جو بہار اور جھارکھنڈ کے کالجز اور یونیورسٹیز کے بی اے اور ایم اے کے نصاب میں شامل ہیں۔یہ سبھی افسانے اردو کے ممتاز افسانے ہیں۔

کفن (پریم چند) اپنے دکھ مجھے دے دو (راجندر سنگھ بیدی) آدھے گھنٹے کا خدا (کرشن چندر)،صنوبر

کے سائے (حجاب امتیاز علی) ہتک (سعادت حسن منٹو) چوتھی کا جوڑا (عصمت چغتائی) ڈائن (شکیلہ اختر) بد صورت لڑکی (سہیل عظیم آبادی) بابالوگ (غیاث احمد گدی) ایک درخت کا قتل (اختر اورینوی) کارمن (قرۃ العین حیدر) بے نام گلیاں (کلام حیدری) آخری کوشش (حیات اللہ انصاری) اردو کے مشہور افسانے ہیں۔ یہ سبھی افسانے ایک کتاب میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ قسیم اختر نے اردو افسانے کی ابتدا اور ارتقاء، افسانے کے فن، ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے متعلق خوب سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ یہ کتاب طالب علموں کے لئے بہت مفید ہے۔

• **''قرۃ العین حیدر کے ۵۲ افسانے''** ڈاکٹر نازیہ بیگم جافو خان (ماریشش) کی کتاب ہے، جسے کتابی دنیا، لاہور نے شائع کیا ہے۔ اس سے قبل بھی نازیہ بیگم کی کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ قرۃ العین حیدر ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ پچھلے سال بھی قرۃ العین حیدر پر ان کی کتاب شائع ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نازیہ بیگم گاندھی انسٹی ٹیوٹ، ماریشش میں پروفیسر ہیں۔ مذکورہ کتاب میں نازیہ بیگم نے عینی آپا کے سارے افسانوں کے تجزیے کئے ہیں۔ انہوں نے عینی آپا کے پانچوں افسانوی مجموعوں، ستاروں سے آگے، شیشے کے گھر، پت جھڑ کی آواز، روشنی کی رفتار اور جگنوؤں کی دنیا کے ہر افسانے کا تجزیہ کیا ہے۔

''تجزیہ میں پلاٹ، کردار، پس منظر، نقطہ نظر، اسلوب، وحدت تاثر اور آغاز و اختتام پر افسانے کے فن کی مناسبت سے بحث کی گئی ہے تا کہ معلوم ہو جائے کہ افسانہ کس نوعیت کا ہے۔''

[قرۃ العین حیدر کے ۵۲ افسانے، ڈاکٹر نازیہ بیگم جافو خان، پیش لفظ]

• **''بارود اور کونپل، عارف نقوی (جرمنی) کے منتخب افسانے''** اسلم جمشید پوری کی مرتب کردہ کتاب ہے، جسے ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں عارف نقوی کے بیس افسانے اور پانچ افسانچے شامل ہیں۔ ساتھ ہی اسلم جمشید پوری کا ایک طویل مقدمہ جس میں عارف نقوی کی شخصیت اور فن پر بحث کی گئی ہے۔ عارف نقوی کی افسانہ نگاری کے مختلف شیڈس کا انکشاف بھی اس مقدمے میں ہے۔ عارف نقوی یوں بھی کثیر رخی فنکار ہیں۔ وہ افسانہ نگار، افسانچہ نگار، شاعر، صحافی، سفر نامہ نگار، محقق و ناقد، خاکہ نگار، ناولٹ نگار کے ساتھ ساتھ اچھے استاد بھی ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ عارف نقوی ترقی پسند عہد کا انسائکلو پیڈیا ہیں۔ ایسے لوگ اردو میں کم کم ملتے ہیں۔ ان کے معروف افسانوں میں بارود اور کونپل، زلیخا، رکشے والا، پشیمانی، کیرم بورڈ، تعویذ، نوکر، سوئے فردوس بریں، بیرک نمبر ۱۰۸، پہلا جوتا، لوسی، پاسپورٹ وغیرہ ہیں۔ ان

افسانوں میں عارف نقوی کا ترقی پسند نظریہ واضح ہے۔ جو منفی حالات میں بھی ،مثبت قدروں کا امین رہتا ہے۔

• **''اردو افسانے کی بے وفا عورتیں''** دراصل شموئل احمد اور رمانہ تبسم کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ شموئل احمد کی یہ آخری کتاب ہے۔ شموئل احمد کا انتقال اردو فکشن کا بڑا نقصان ہے۔ شموئل احمد نے ساری زندگی جو فکشن لکھا وہ اس طرح منفرد ہے، کہ انہوں نے ہر افسانے اور ناول میں جنسیت کو موضوع بنایا اور مختلف قسم کا فکشن تحریر کیا ہے۔ مذکورہ کتاب میں شموئل احمد اور رمانہ تبسم نے بالکل نئے موضوع پر کام کیا ہے۔ 'اردو افسانے کی بے وفا عورتیں' اردو کے ایسے افسانے ہیں، جن میں بے وفا عورتوں کا ذکر ہیں۔ ان افسانوں میں پریم چند، کرشن چندر، غلام عباس، ممتاز مفتی، ضمیر الدین احمد، منٹو، اے حمید، رام لعل، بلونت سنگھ، منشا یاد کے ساتھ ساتھ نئے افسانہ نگار شموئل احمد، ساجد رشید، سلام بن رزاق، شاہد اختر اور رمانہ تبسم کے افسانے اس انتخاب میں شامل ہیں۔ بہت زمانے بعد اردو میں نئے موضوع پر کوئی کتاب آئی ہے۔ خود شموئل احمد نے کتاب کے مقدمے میں لکھا ہے۔:

''عورت کی بے وفائی کو ہمیشہ جنسی نا آسودگی سے جوڑنا غلط ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عورت جنسی نا آسودگی سے زیادہ ذہنی اور روحانی آسودگی کے لئے کوشاں رہتی ہے۔ جنس کا روحانی پہلو بھی ہے، جس پر نظر نہیں جاتی۔ رجنیش لکھتے ہیں کہ عورت بہت پیار میں آتی ہے تو اس کے ہاتھ مرد کے سر پر چلے جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آدمی نے مذہب کا زہر دے کر سیکس کو مارنے کی کوشش کی ہے۔ سیکس مرا تو نہیں ،زہریلا ہو کر زندہ ہے۔''

[اردو افسانے کی بے وفا عورتیں، مرتبہ، شموئل احمد و رمانہ تبسم، ص ۱۹]

• **''خاموش صدائیں''** صبیحہ تزئین کے زریعہ مرتب کردہ کتاب ہے، جسے عرشیہ پبلی کیشنز نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں محبت کے موضوع پر ۱۱۲ افسانوں کو جمع کیا گیا ہے۔ ایسی کوشش پہلے بھی عابد سہیل نے کی تھی۔ اس کتاب میں ایسی کہانیوں کا انتخاب کیا گیا ہے جو محبت کے جذبات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوں۔ وہ خواہ کسی بھی عہد کی ہوں۔ لہٰذا اس کتاب میں بھی قرۃ العین حیدر، قاضی عبدالستار، ضمیر الدین احمد، عبداللہ حسین، سے لے کر موجودہ عہد کے شفیع جاوید، زاہدہ حنا، صدیق عالم، مشرف عالم ذوقی، خورشید اکرم، سہیل وحید، عمر عادل، ضمیر الدین احمد کی کہانیاں شامل ہیں۔ سوال اٹھتا ہے کہ یہی افسانے کیوں؟ پاکستان کے صرف دو ہی نام عبداللہ حسین، زاہدہ حنا۔ ضمیر الدین احمد کے دو افسانے کیوں؟ کیا ضمیر الدین احمد اتنے مشہور افسانہ نگار ہیں۔ دوسرے افسانہ نگاروں کے افسانے کیوں نہیں

شامل نہیں ہیں۔
• ''**اردوڈراما**'' پروفیسر محمد کاظم کی کتاب ہے، جسے این سی پی یو ایل نے شائع کیا ہے۔ پروفیسر کاظم ڈراما صنف سے عملی طور پر جڑے ہوئے ہیں۔ڈرامے لکھنا، ڈراموں کی تحقیق وتنقید کرنا، ڈرامے کھیلنا، ڈراموں کی ہدایت دینا اور بچوں کو ڈراما سکھانا محمد کاظم کا شوق ہے۔نکڑ ناٹک پر آپ کی کتاب کافی مقبول ہے۔مذکورہ کتاب ''اردو ڈراما'' ڈرامے کا فن، اردو ڈرامے کا آغاز وارتقا، اردو کے اہم ڈراما نگار(نواب سید محمد آزاد، آغا حشر کاشمیری، پریم چند، سید عابد حسین، محمد مجیب، حبیب تنویر، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی ،راجندر سنگھ بیدی) اردو کے اہم ڈراموں کا تجزیہ(اندرسبھا، نوابی دربار، انارکلی، اسیر حرص، سفید خون، صید ہوس، سلور کنگ، یہودی کی لڑکی، رستم سہراب، پردہء غفلت، کھیتی، انجام، خانجنگی، جھجکا تون، ہیروئن کی تلاش، دوسری شام، آزمائش، آگرہ بازار، ضحاک ، کہرے کا چاند) شامل ہیں۔ڈرامے پر کام کرنے والے طالب علموں کے لئے یہ کتاب اہمیت کی حامل ہے۔
• ''جاوید دانش: اعتبار فکر وفن'' ابوذر ہاشمی کی مرتب کردہ کتاب ہے، جسے عدیلہ پرنٹرس نے شائع کیا ہے۔ جاوید دانش (کناڈا) کی بنیادی شناخت ڈرامہ آرٹسٹ اور ڈراما نگار کی ہے۔ ویسے ان کی نظمیں اور غزلیں بھی اپنی افرادیت رکھتی ہیں۔سفر نامے بھی جاوِد دانش کی پہچان ہیں۔مگر اب ان کی شناخت کا حوالہ ان کی ''داستان گوئی'' بن گئی ہے۔ہندوستان کیا پوری دنیا میں ان کی داستان گوئی کے چرچے ہیں۔ابوذر ہاشمی کی شہرت ،روح ادب، کے حوالے سے زیادہ ہے۔ ویسے ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔محمد سالم : شخص وعکس، مباحثے ومحاکمے، عصر حاضر میں ادبیات ٹیگور کی معنویت، پرویز شاہدی، مضراب قلم وغیرہ کے ذریعہ ابوذر ہاشمی نے اپنے قلم کا سحر قائم رکھا ہے۔

مذکورہ کتاب کی ترتیب میں ابوذر ہاشمی نے اپنی مدیرانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔اس کتابمیں جاوید دانش کی تمام تخلیقات کا مکمل جائزہ لیا گیا ہے۔انہوں نے کتاب کو کئی حصے میں منقسم کیا ہے۔پہلے حصے ''جاوید دانش: شخصیت کے نقوش'' میں پانچ مضامین شامل کئے ہیں، جن میں ڈاکٹر خالد سہیل، کناڈا، کامران رضوی ، نیو کناڈا، کے مضامین شامل ہیں۔دوسرے حصے ''نقوش فن ا: یہ زندگی ڈرامہ ہی تو ہے'' میں ۲۰ مضامین ، جوگندر پال، اکرام بریلوی، پروفیسر صالحہ رشید، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر زاہد الحق ، رابعہ الربا، پروفیسر محمد کاظم، ڈاکٹر وفا یزداں منش جیسے اسکالرز کے مضامین شامل ہیں۔تیسرے حصے ''نقوش فن ۱۱: نگری نگری پھرا مسافر'' میں ۱۴ اسکالرز کے مضامین، چوتھے حصے''

نقوش فن III: داستان گوئی''میں چار مضامین، پانچویں حصے''نقوش فن iv: ترجمہ نگاری''اور آخری حصے''مصاحبے'' میں ایک ایک مضمون اور انٹرویو شامل ہیں۔ساتھ ہی ساتھ جاوید دانش کی نظمیں ،غزلیں اور تصاویر کا انتخاب شامل ہے۔اس کتاب کے مطالعے سے جہاں جاوید دانش کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، وہیں ابوذر ہاشمی کی مدیرانہ اور ناقدانہ صلاحیتوں کا علم بھی ہوتا ہے۔

☆ادب اطفال پر کئی کتابیں اس سال منظر عام پر آئیں۔

• ''**چشمے کی تلاش**'' جہانگیر اُنس کی بچوں کے لئے کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ جسے عرشیہ پبلی کیشنز نے شائع کیا ہے۔ادبِ اطفال میں جہانگیر اُنس کی دلچسپی کا ثبوت یہ ہے کہ وہ بچوں کے لئے مستقل لکھ رہے ہیں۔۲۰۲۱ میں ان کی کتاب''کہانیاں'' بھی بچوں کے لئے کہانیوں پر مشتمل تھی۔

چشمے کی تلاش، دراصل ایسی کہانیوں کا مجموعہ ہے، جو لیک سے ہٹ کر ہے۔اس میں بچوں کے لئے ایسی کہانیاں ہیں، جو بچوں کو تفریح کے علاوہ ذہنی ورزش، اخلاقی درس، زندہ کرداروں سے ملاقات، اسلامی شخصیات کا بھر پور تعارف موجود ہے۔چشمے کی تلاش میں تقریباً ۲۸ چھوٹی بڑی کہانیاں اور ڈرامے شامل ہیں۔ یہ سبھی اسلامی کہانیاں ہیں۔ان میں بچوں کے لئے سبق اور معلومات ہیں۔ یہ سبھی بچوں میں اچھے اخلاق اور اسلامی تعلیمات کو عام کرتی ہیں۔ان میں کچھ کہنیاں تو واقعی بڑی دلچسپ اور نصیحت آموز ہیں۔اونٹ والے مسلمان ہو گئے،خود داری کا پھل،صحت کا راز،حضرت عمر اور ایک شرابی، نیک دل انسپکٹر، جنت کی مٹی، ماں کی دعا، گناہوں کی سزا، دادی شفق النساء، کم عمر شہید وغیرہ اچھی کہانیاں ہیں۔

• ''**بچوں کی کتابیں: تعارف وتذکرہ**'' عطا عابدی کی تحریر کردہ کتاب ہے، جسے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب بہار کے حوالے سے تحریر کی گئی ہے۔عطا عابدی ایک اچھے شاعر، بچوں کے ادیب، محقق و ناقد اور صحافی ہیں۔ان کی درجن بھر کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ان کا نقطۂ نظر اصلاحی ہے۔وہ زندگی کو مثبت نظروں سے دیکھتے ہیں۔مذکورہ کتاب میں انہوں نے بہار و جھارکھنڈ کے تقریباً ۹۶ ادباء وشعراء کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ان میں مصنف، موءلف، مرتب اور مترجم کو شامل کیا ہے۔اس کتاب میں ادب اطفال کا جائزہ لیتے ہوئے بطوں کے لئے لکھی گئی کتابوں کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ادب اطفال میں یہ کتاب خاصی اہمیت کی حامل ہے۔

• ''**عید کے دن کا بادشاہ**'' رونق جمال کی بچوں کے لئے لکھی گئی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ جسے عرشیہ پبلی کیشنز نے شائع کیا ہے۔رونق جمال کا شمار بسیا نویسوں میں ہوتا ہے۔انہوں نے بچوں کے لئے کہا

نیوں کے چھ مجموعے، چار افسانوں کے مجموعے، تین افسانچوں کے مجموعے، ڈرامے، تراجم، مزاحیہ کہانیاں تنقید، بچکانچے وغیرہ میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے۔

’عید کے دن کا بادشاہ‘ رونق جمال کی بچوں کے لئے ۳۲ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ سبھی کہانیاں عید جیسے بڑے تہوار پر ہیں۔ ان میں بچوں کے اخلاق و کردار، پندو نصائح اور تعلیم کے لئے رغبت دلاتی کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں میں بچوں کی عمر، نفسیات اور دلچسپی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ان کہانیوں میں عید مبارک والی تتلی، پر بہار عید، عید کا تحفہ، عید کی خوشی، بر فیلی عید، عیدی کے بدلے، دوہری عید، عید کا فرشتہ، عید سے گفتگو، آؤ مل کر عید منائیں، عید اور ہمارے نبی وغیرہ کہانیاں بچوں کو ضرور پسند آئیں گی۔

☆اس برس کئی اہم ناول شائع ہوئے۔ جن کا مختصر جائزہ یہاں حاضر ہے۔

• ’’خواب اور انگارے‘‘ نعیم بیگ (لاہور) کا دوسرا ناول ہے، جسے عکس پبلی کیشنز نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ نعیم بیگ کا شمار ہمارے ان فکشن نگاروں میں ہوتا ہے، جنہوں نے بہت بعد میں لکھنا شروع کیا لیکن اپنے افسانوں اور ناولوں سے اردو ادب میں اپنی الگ چھاپ چھوڑی۔ اردو میں لکھنے سے قبل آپ انگریزی میں لکھتے تھے۔ اردو میں اب تک آپ کے دو افسانوی مجموعے ’’یوڈیم سالا‘‘، ’’پیچھا کرتی آوازیں‘‘ اور ایک ناول ’’ڈیوس، علی اور دیا‘‘ منظر عام پر آئے۔ آپ کے افسانوں اور ناولوں نے سماج کی تلخ حقیقتوں کا بیان افسانوی انداز میں کچھ اس طرح سامنے آیا، کہ پڑھنے والوں پر ایک سحر سا طاری ہو گیا۔ آپ نے نئی نسل کے اندر چھپی بے چینی اور اضطراب کو لفظوں کا جامہ پہنایا۔ سیاسی بد افعالیاں، بیروزگاری کی ماری نوجوان نسل کی مجبوراً ہجرت، کرپشن (مذہب اور فوج کا) ملک کو کھوکھلا کرنے والے سماج دشمن عناصر کو نعیم بیگ نے طشت از بام کیا۔

نعیم بیگ کا یہ ناول دراصل اپنے ملک کے سماجی نظام اور مردوں کی اجارہ داری پر گہرا طنز ہے۔ یہ صرف پاکستانی سماج کا چہرہ نہیں بلکہ ہر اس ملک کی کہانی ہے، جہاں مظلوموں اور بے قصوروں پر ظلم و جور روا ہے۔ یہ ناول انسانی نفسیات کا ناول ہے، جو شروع ضرور بلوچستان کے باشندوں، شہناز بلوچ سروپ بلوچ، صبا بلوچ اور یونیورسٹی کے ماحول سے ہوتی ہے۔ قتل و غارت گری کے واقعات اسے ایک مرڈر تھرل، میں بدل دیتے ہیں۔ یہ معاملہ صرف بلوچستان کا ہی نہیں، بلکہ اسپین کی بارسلونا یونیورسٹی کا بھی ہے۔ جہاں سوشلسٹ انقلاب کی جدوجہد میں مصروف سروپ بلوچ کو بھی سماج دشمن موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ تعلیم اور جہالت، سوشلسٹ نظام اور فاشسٹ نظام کے درمیان

اندھیرے اجالے کے مانند جنگ جاری ہے،اور اس جنگ میں کتنوں کے خواب چکنا چور ہوتے ہیں۔نفرتیں کیسے پرورش پاتی ہیں۔پورا سماج انہیں مکڑ جالوں میں گرفتا ہے۔ناول ایک اقتباس دیکھیں۔:

''جب تم سچ اور اپنے خون کی آمیزش سے در و دیوار پر نقش بناؤ گے تو انہیں یقین آ جائے گا۔وہ نقش در حقیقت ان کے دلوں پر بنیں گے۔انہوں نے اب تک اینٹوں،غلام جسموں کے گودے،مندر اور مسجد کے رکھوالوں کی نفرت انگیز افراتفری کے سوا دیکھا ہی کیا ہے۔''

[ناول،خواب انگارے،نعیم بیگ]

• ''دھنورا''،اسلم جمشید پوری کا پہلا ناول ہے۔جو کولاژ تکنیک میں گاؤں دیہات کے منظر اور پس منظر میں لکھا گیا ہے۔اس ناول میں مرکزی کردار کی شکل میں گاؤں،دھنورا ہے۔باقی سبھی کردار آتے ہیں،اپنا رول ادا کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔یہ اردو ناول میں ایک تجربہ ہے۔ناول کے بارے میں نوجوان محقق و ناقد ڈاکٹر ابراہیم افسر لکھتے ہیں۔:

''ناول ''دھنورا'' کا اندازِ پیش کش اتنا دل کش،شستہ اور رواں دواں ہے کہ ہر باب میں قاری اپنے آپ کو ڈوبا ہوا محسوس کرتا ہے۔گاؤں کی جزئیات،شادی بیاہ،کھیل تماشے،کاروباری لین دین،کھیتی باڑی کے طریقے،نوکری چاکری کے لیے گاؤں سے باہر نکلنا،گھر کے بام و در میں ہونے والی گفتگو ،جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے دوسرے گاؤں کا سفر،مندر میں ہونے والی آرتی،گاؤں کی عورتوں کے مسائل،ہجرت کا کرب،اپنے لوگوں سے بچھڑنے کا درد اور مالی مسائل وغیرہ کا پروفیسر اسلم جمشید پوری نے جس خوب صورتی کے ساتھ بیان کیا ہے ''[ناول دھنورا کا تجزیاتی مطالعہ،ڈاکٹر ابراہیم افسر،سہ ماہی عالمی فلک،شمارہ نمبر ۱۰۔۹ دھنباد،ص ۱۰۳]

•''**ایک معدوم کہانی**''،سیمی کرن (پاکستان) کا نیا ناول ہے۔جسے فکشن ہاؤس،لاہور نے شائع کیا ہے۔سیمی کرن کا یہ ناول اپنی انفرادیت کے سبب کافی مشہور ہو رہا ہے۔اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اسی سال یہ ناول ہندوستان سے بھی شائع ہوا ہے۔سیمی کرن پاکستان کی ایک مقبول فکشن نگار ہیں۔اس سے قبل سیمی کرن کے کئی افسانوی مجموعے سامنے آ چکے ہیں۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ''شجر ممنوعہ کے تین پتے'' ۲۰۱۵ میں شائع ہوا۔ان کا دوسرا مجموعہ'' بات کہی نہیں گئی''۲۰۱۷ میں اور تیسرا مجموعہ''مربعوں کی دائرہ کہانی''۲۰۱۹ میں شائع ہوا۔اور اب ان کا ناول'ایک معدوم کہانی' شائع ہوا ہے۔سیمی کرن نے اپنے فکشن میں مقامی اور عالمی مسائل کو

ہمیشہ اولیت دی ہے۔ان کا تازہ ناول وقت کو استعارہ بنا کر لکھا گیا ہے۔دراصل اردو میں وقت کو موضوع بنانے والی فکشن نگار قرۃ العین حیدر ہیں۔ان کا ناول 'آگ کا دریا' ہو یا ان کا افسانہ 'روشنی کی رفتار' ہو، دونوں میں وقت کا تصور الگ ہے۔کبھی ماضی بعید تو کبھی مستقبل بعید کی بات ہوتی ہے۔بہت دنوں بعد سیمی کرن کے ناول نے وقت یعنی زمانے کو ایک یونٹ مان کر لکھا ہے۔ناول کی مرکزی کردار روحا کئی صدی قبل کی دنیا میں پہنچ جاتی ہے۔اور ڈائنا سور، آدم خور چھپکلیوں کا زکر کرتی ہے۔یہ سب دنیا سے اب معدوم ہو گئے ہیں۔دراصل یہ ناول ہی معدومیت پر ہے۔تمام دنیا کی سیر کرا کے ناول نگار آخر میں فیصل آباد واپس آتی ہے۔کرونا جیسی بیماری سے جوڑ کر ناول میں معدومیت کو ایک وجہ دی گئی ہے۔ناول نگار نے اپنے ناول میں یہ دو ڈائریوں کی مدد سے باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ زندگی کبھی معدوم نہیں ہوتی۔انہوں نے کرداروں کی زندگی کے حوالے سے بات کی ہے۔اس ضخیم ناول میں وقت کی طرح زندگی بھی بہت پھیلی ہوئی ہے جس میں معدوم ہو کر بھی نمو کرنے کی صلاحیت ہے اور یہی خوبی عورت میں بھی ہوتی ہے، وہ جہاں اپنی زندگی کو مقصد کے لئے معودم کر دیتی ہے، لیکن ایک وقت خاص کے بعد پھر نمو کر جاتی ہے۔

• **''محصور پرندوں کا آسمان''** نئی نسل کی افسانہ نگار حمیرا عالیہ کا پہلا ناول ہے، جسے عرشیہ پبلی کیشنز نے شائع کیا ہے۔حمیرا عالیہ کا اپنا انداز ہے۔انہوں اس ناول کے ذریعہ خود کو ثابت کیا ہے۔ان کے یہاں پختگی ہے۔وہ اچھی زبان لکھتی ہیں۔ان کا بیانیہ پر اثر ہے۔مذکورہ ناول 'محصور پرندوں کا آسمان' کی پوری کہانی میں جے این یو کے ماحول کی بہترین عکاسی کی ہے۔جے این یو کی انقلابی فضا ،ہر طرح کی آزادی، مذہبی یگانگت، ملک کے سیاسی ماحول کے کیمپس پر اثرات، جہاں عورتوں مردوں میں تفریق نہیں، پڑھنے کے لئے بڑی بڑی لائبریری مطلب جے این یو ایسی درسگاہ ہے، جہاں ہندوستان کا مستقبل تیار ہوتا ہے۔حمیرا عالیہ نے اپنے ناول میں جے این یو کیمپس کا آنکھوں دیکھا حال تخلیقی زبان میں بیان کیا ہے۔رابی (رابعہ) اور جمال کا آپس کا تعلق، پہلے قربت پھر محبت میں تبدیل ہو جا تا ہے۔جو روز بروز شدت اختیار کر جا تا ہے۔جمال کی طلبہ یونین کی مصروفیات، رابعہ کے گھر والوں کو ایک مذہبی لڑکے کے رشتے کا ملنا اور رابعہ کی شادی۔اس کے بعد کئی سال تک رابعہ کا اپنے شوہر کے ظلمو ستم برداشت کرنا۔ادھر جمال کے ایک جلسے میں پاکستان زندہ باد کے نعرے لگنا اور جمال کا جیل جانا۔دونوں کا انھیرے کا طویل سفر۔مگر پھر صبح کا اجالا ہوتا ہے۔رابعہ اپنے شوہر سے خلع لے کر ایک نئے دن کا آغاز کرتی ہے اور جمال کو جیل سے باہر نکالنے کے لئے

کاشش میں لگ جاتی ہے۔دونوں شادی کر لیتے ہیں۔ناول نگار نے مذہب کے نام پر عورت کے استحصال اور پولس انتظامیہ کو بے نقاب کیا ہے۔''محصور پرندوں کا آسمان' ایک اچھا ناول ہے۔

• ''سسٹم'' عبدالصمد کا تحریر کردہ تازہ ناول ہے، جسے کتاب دار نے شائع کیا ہے۔عبدالصمد ہمارے ان فکشن نگاروں میں ہیں، جنہوں نے ہمیشہ نیا لکھا ہے۔ملک کی تازہ صورت حال ان کے ناولوں سے منعکس ہوتی ہے۔وہ جوں جوں عمر کی سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں، ان کی تخلیقیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔تقریباً ہر سال ان کا ایک ناول یا افسانوی مجموعہ یا کوئی کتاب منظر عام پر آتی ہے۔اس سےقبل اک کا ناول 'کشکول' شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے، جو کورونا جیسی مہلک بیماری میں فقیروں کی سرگرمیوں کو عمدگی سے اجاگر کرتا ہے۔

مذکورہ ناول 'سسٹم' بھی حلاتِ حاضرہ کا عکاس ہے۔اس ناول میں پولس محکمکی بدعنوایوں کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔مرکزی کردار 'میں' ہے جو محکمہ پولس میں سپاہی ہے۔ایک سپاہی کے ذریعہ پورے پولس ڈپارٹمنٹ کے طریقہ ء کار یعنی سسٹم پر سوال اٹھائے گئے ہیں۔مال کے بٹوارے کا نظام سمجھایا گیا ہے۔اس کی بیوی زلیخا ایک مذہبی عورت ہیاور رشوت کو اپنے ، اپنے بچوں اور پورے گھر کے لئے زہر سمجھتی ہے۔اور ساری زندگی عسرت میں گذار دیتی ہے، جبکہ ناول کا مرکزی کردار رشوت لیتا ہے۔انور اس کا کہانی کار دوست ہے۔راجو ایک گھاگ سیاست داں ہے۔اور 'میں' کا دوست بن جاتا ہے۔اس کے ریٹائر منٹ کے بعد اسے اپنے یہاں رکھ لیتا ہے۔یہاں سیاست کے گھناؤنے سسٹم کی پرتیں کھلتی ہیں۔پورا ناول پولس محکمے اور سیاست کی بدعنوانیوں عمل اور مال کے بٹوارے کے گرد گھومتا ہوا زندگی کے کئی رخ کی نقاب کشائی کرتا ہے۔

• ''شہر ذات'' شاہد اختر کا نیا ناول ہے، جسے عرشیہ پبلیکیشنز نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔شاہد اختر اردو فکشن کا ایک مستند نام ہے۔ان کے افسانے اور ناول انفرادیت رکھتے ہیں۔اس سے قبل ان کے تین افسانوی مجموعے، برف پر ننگے پاؤں، مونٹی، خوا بگینے اور ایک ناول شہر میں سمندر آ کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

مذکورہ ناول 'شہر ذات' دراصل انسان کی باطنی حالت اور کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔یہ ناول جتنا معاشرکی تبدیلیوں کو ظاہر کرتا ہے، اتنا فرد کی نفسیات اور اس کے اندرون کو بھی پیش کرتا ہے۔ناول کا مرکزی کردار خرم ہے۔ دوسرے کرداروں میں انترا، خرم کی ماں، ماموں ، بھائی جان، جمیلہ بھابھی وغیرہ ہیں۔خرم کی اچانک موت سے قاری بھی پریشان ہو جاتا ہے۔مگر یہ ایک

فطری موت ہے۔ ناول کے بارے میں شعیب نظام لکھتے ہیں۔:

''پورا ناول شروع سے آخر تک قاری، کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے اور خرم کے کردار کے ذریعہ باہر سے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو بہت فنکاری سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول جتنا خارج کو اپنے احاطے میں لیتا ہے، اس سے زیادہ داخلی دنیا میں اتھل پتھل مچا تا ہوا اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ اسی لئے اس کا عنوان بھی شہزات ہے'' [شہزات، شاہد اختر، ص،۱۱]

• **''مٹی آدم کھاتی ہے''** شاہد حمید (پاکستان) کا مشہور و معروف ناول ہے، جس کا نیا ایڈیشن عرشیہ پبلی کیشنز نے شائع کیا ہے۔ اس کے کئی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں اور کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ شاہد حمید ہمارے معتبر و مستند فکشن نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کے افسانے ہوں یا ناول، سب میں موجودہ عہد کی دنیا کی زندگی، اس کے نشیب و فراز، ماحول کی عکاسی، انسانی نفسیات کا اظہار، ماحولیات، مسلمانوں کی شناخت، سیاسی چپقلشیں، سماجی حقیقتیں وغیرہ پائی جاتی ہیں۔ ان کے ناول مٹی آدم کھاتی ہے، میں زندگی کے بے ثباتی کے فلسفے کو بیان کیا ہے۔ شاہد حمید کا اسلوب متاثر کن ہے

• **''آبیاژہ''** ڈاکٹر ریشا قمر کی مرتب کردہ کتاب ہے، جسے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیا ہے۔ دراصل یہ ضخیم کتاب مشہور و معروف فکشن نگار پروفیسر غضنفر کے تمام ناولوں کا مجموعہ ہے۔ ریشا قمر نے غضنفر کے ناولوں کو یکجا کیا ہے۔ اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا کام ہے۔ ناولوں کا کلیات پہلی بار منظر عام پر آیا ہے۔ ریشا قمر کچھ نہ کچھ نیا کرنے میں نہ صرف یقین رکھتی ہیں بلکہ عمل بھی کرتی ہیں۔ اس سے قبل ان کی کئی کتابیں 'رفعت قلم، ارژنگِ قلم (دو جلدیں) کرناٹک میں اردو: ماضی اور حال (خواجہ اکرام الدین کے ساتھ) منظر عام پر آچکی ہیں۔ یہ کتاب بھی آپ کے نئے ذہن اور فعالیت کی غماز ہے۔ ''آبیاژہ'' میں غضنفر کے سبھی ناول، پانی، کینچلی، کہانی انکل، دویہ بانی فسوں، وش منتھن، مم، شوراب اور مانجھی شامل ہیں۔ ریشا قمر کا بیس صفحے کا مقدمہ بھی شامل ہے، جس میں انہوں نے غضنفر کے ناولوں کی اہمیت و افادیت پر گفتگو کی ہے۔ اس مجموعہ ناول کے بارے میں سید محمد اشرف لکھتے ہیں۔: **''معاصر اردو ادب میں غضنفر کے علاوہ شاید ہی کوئی ادیب ہو جس نے چھوٹے بڑے نو ادبی ناول ادب کو دیے ہوں، بات صرف تعداد کی نہیں، معیار کی بھی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ غضنفر سے زیادہ کسی ہم عصر نے اتنی رنگا رنگ اصناف میں طبع آزمائی نہیں کی ہے، افسانہ، ڈرامہ، غزل، نظم، مثنوی، تحقیقی مقالے، مضامین، خاکے، خود نوشت اور ناولا۔۔ غرض یہ کہ**

اپنے پچاس سالہ ادبی سفر میں شاید ہی کوئی میدان ہو جہاں غضنفر نے اپنی خلاقی کے علم نہ نصب کئے ہوں۔'' [آبیاژہ، غضنفر کے ناولوں کا مجموعہ، مرتب، ڈاکٹر ریشا قمر ص ۱۱]

☆اس برس کئی ناولٹ بھی شائع ہوئے۔

• ''قسم''، مشہور و معروف فکشن نگار محمد بشیر مالیر کوٹلوی کا تحریر کردہ ناولٹ ہے، جسے کتابی دنیا نے شائع کیا ہے۔ بشیر مالیر کوٹلوی کے کئی افسانوی مجموعے، ناول، افسانچے اور کئی تنقیدی کتب شائع ہو چکی ہیں۔ بشیر مالیر کوٹلوی کی شناخت فن کی باریکیوں پر گہری نگاہ رکھنے موالوں میں ہوتی ہے۔ انھوں نے افسانچہ سے لے کر ناول تک تخلیق کیا ہے۔ وہ افسانچہ، افسانہ، ناولٹ، ناول کے فن پر گھری نگاہ رکھتے ہیں اور چھوت چھوٹی باتوں پر دسترس کے ساتھ ان اصناف کے امتیاز کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ 'قسم' آپ کی تازہ ترین تخلیق ہے۔ جس میں آپ نے یوروپ خاص کر انگلینڈ کے شب و روز، وہاں کی زندگی، عورتوں کی آزادی اور حقوق، عیسایوں اور مسلمانوں کی شادی، بچوں کا آزادانہ ماحول، اس کے برعکس پاکستان کی زندگی، عورتوں کی آزادی پر مذہبی قدغن، عورتوں میں مذہب کا پاس، سیاسی ماحول اور خصوصی طور پر نائن الیون اور لندن بم دھماکے کے بعد عام مسلمانوں کو اس کا قصور وار اور ذمہ دار ماننا۔ بشیر مالیر کوٹلوی نے عمدگی سے عثمان، زبیدہ، انجم، زرینہ، خورشید، ٹونی، جوزف ڈیسوزا، کے ذریعہ مغربی ممالک کا ماحول، خاص کر مسلمانوں کے خلاف پھیلتی نفرت کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ناولٹ کا آخری حصہ جب جوزف پستول لئے ہوئے عثمان کے گھر قتل کے ارادے سے داخل ہوتا ہے۔ لیکن عثمان کا سلوک اس کی قسم کو تبدیل کر دیتا ہے۔ آخری حصہ آپ بھی دیکھیں۔:

''تم۔۔تم دونوں جھوتے ہو۔۔جھوٹ بولتے ہو تم۔۔۔تم لوگ مسلمان ہو ہی نہیں سکتے۔۔۔کیوں کہ مسلمان اس قدر سچے، ایماندار، اور بہتر انسان ہو ہی نہیں سکتے۔۔مسلمان تو صرف معصوم انسانوں کی جان لینا جانتا ہے۔۔قتل عام کرنا جانتا ہے۔۔جھوٹے ہو۔۔جھوٹے ہو تم لوگ۔۔۔!!''

[ناولٹ، قسم، بشیر مالیر کوٹلوی، ص ۱۰۷]

• **''کوشل خاتون''** شفق سوپوری کا تازہ ناولٹ ہے۔ اس سے قبل ان کے دو ناول، نیلما اور فائرنگ رینج: کشمیر ۱۹۹۰، دو ناولٹ موسیٰ اور دریا ہے چشم گریہ ناک، ایک افسانوں کا مجموعہ راگ راگنی اور ورجت سُر، کئی شعری مجموعے، تحقیق و تنقید کی کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ آپ کشمیر کے معروف تخلیق کار ہیں۔ آپ کی تخلیقات میں ایک عجیب سا درد و کرب ہوتا ہے۔ کشمیریوں اور مظلوموں کی آواز اٹھانے میں آپ کو مہارت ہے۔

''کوشل خاتون'' کی شکل میں ان کا نیا ناولٹ بازار میں آیا ہے۔ایک نئے مسئلے کو ان کے اسلوب نے ایسا گرفت میں لیا ہے کہ لگتا ہے وہ عام مسئلہ ہے۔گھر گھر کی کہانی ہے۔ماں باپ کی توجہ جب اپنے بچوں خاص کر بچیوں کی طرف نہیں ہوتی ہے،تو ایسے گل کھلتے ہیں۔ایک دو کمروں میں کئی کئی بچوں کے ساتھ رہنے میں ایسے ایسے جنسی مسائل پیدا ہوتے ہیں،جو والدین نے سوچے بھی نہیں ہوتے۔لڑکیوں کی بے راہ روی ایک خطرناک نتائج سامنے لاتی ہے۔اور والدین کا سر شرم سے جھکتا ہی نہیں بلکہ وہ کہیں منھ بھی دکھانے لائق نہیں رہتے۔شفق سوپوری نے کوشل خاتون،کی شکل میں آنکھیں کھول دینے والا کردار اور واقعات قلمبند کئے ہیں۔

• ''**بجھتے جلتے چراغ**''عارف نقوی کا تازہ ناولٹ ہے،جسے بڑے اہتمام سے ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیا ہے۔عارف نقوی زود گو قلم کار ہیں۔انہوں نے ادب کی کئی اصناف میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے۔یہ ان کا پہلا ناولٹ ہے۔اس میں بھی ان کا ترقی پسند نظریہ بالکل واضح ہے،جو ان کی شاعری،افسانوں،سفرناموں،خاکوں اور تحقیق وتنقید میں نظر آتا ہے۔

اس ناولٹ کی کہانی جرمنی،ترکی،عراق،لکھنو کی تہذیب وتمدن کو پیش کرتی ہے۔آدھی سے زیادہ کہانی لکھنو کے ارد گرد گھومتی ہے۔ماریہ اور ساجد دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ساجد لکھنو کا رہنے والا ہے۔ہم سب بخوبی جانتے ہیں کہ عارف نقوی کا تعلق لکھنو سے ہے۔ان کا بچپن لکھنو کی گلیوں اور محلوں میں گذرا ہے۔اس ناولٹ کے مرکزی کردار ساجد میں کبھی کبھی عارف صاحب کی جھلک نظر آتی ہے۔ساجد،ماریہ سے قبل لکھنو میں میری سے پیار کرتا ہے۔دونوں شادی کے رشتے میں بندھ جاتے ہیں۔ایک بچی بھی ان کے آنگن میں کھیلتی ہے۔اس کے بعد ساجد کی زندگی میں معاشی حالات کروٹ لیتے ہیں۔ساجد پہلے عراق،پھر ترکی اور بالآخر جرمنی پہنچ جاتا ہے۔جہاں اس کی ملاقات ماریہ سے ہوتی ہے۔دونوں میں پیار ہو جاتا ہے۔عارف نقوی نے بڑی ہنرمندی سے لکھنو جرمنی کی نئی نسل کی زندگی،دہشت گردی اور اس کو اسلام سے جوڑے جانے کو متاثر کن اسلوب میں بیان کیا ہے۔

• ''**اپنا اپنا سچ**''دیپک بدکی کا نیا ناولٹ ہے،جسے جی این کے پبلی کیشنز نے سائع کیا ہے۔دیپک بدکی کا یہ پہلا ناولٹ ہے۔اس سے قبل دیپک بدکی کے قلم سے آٹھ افسانوی مجموعے،دو افسانوں کے مجموعے،دس تنقیدی کتب،ایک سوانح،ایک تحقیقی کتاب نکل چکی ہیں۔اور اب یہ ناولٹ 'اپنا اپنا سچ'۔دیپک بدکی کی تخلیقات میں کشمیری پنڈتوں کا درد و کرب جھلکتا ہے۔اور ایک ایسی ہجرت کا غم بھی

آشکار ہوتا ہے، جو انہیں اپنی زمین سے اجڑنے کا سبب بنی تھی۔
ناولٹ ،اپنا اپنا سچ ، میں انہوں نے کشمیر کی قدیم تاریخ ، جب ہندو مسلمان ثیر وشکر کی طرح ایک ہوکر رہتے تھے، کا بیان کیا ہے۔ کشمیر ہندوؤں کا تھا یا مسلمانوں کا۔ دونوں اپنی اپنی کہانی بیان کرتے ہیں۔ دونوں اپنی جگہ صحیح ہیں۔ معاملہ سیاست کا ہے۔ ۱۹۴۷ جب ملک تقسیم ہوا اور ایک بار حضرت بل سے موئے مبارک غائب ہو گیا تھا۔ ان دو مواقع پر پورے علاقے نے فرقہ وارانہ فسادات نہ صرف دیکھے بلکہ جھیلے۔ ناگرائے اور ان کی بیوی ہیمالا اور بیٹے اگنی شیکھر نے ہجرت کے دردناک عذاب کا سامنا کیا۔ پورے ناولٹ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا امٹ میل جول، فرقہ واریت، ہجرت کے تماشے وغیرہ کو دیپک بدکی نے تاریخی نقطۂ نظر سے ناولٹ کے قالب میں کامیابی سے ڈھالا ہے۔
• ''سبز پوش خاتون'' طٰہٰ نسیم کا تاریخی ناولٹ ہے۔ جسے ہنی بکس نے شائع کیا ہے۔ تاریخی ناول لکھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ اردو ناول کی روایت میں تاریخی ناول نگار انگلیوں پر شمار کرنے بھر ہیں۔ نئی نسل کے فکشن نگاروں میں طٰہٰ نسیم کو یہ امتیاز حاصل ہے۔ آپ کی درجن بھر کتب شائع ہو چکی ہیں۔ آپ نے ادب اطفال میں خاصا لکھا ہے۔ مذکورہ ناولٹ ''سبز پوش خاتون'' دراصل ۱۸۵۷ کے بطن سے پیدا حالات میں ایک خاتون کی بہادری کی کہانی ہے۔ یہ کہانی دہلی کی ایک بہادر دوشیزہ روشن کی ہے، جس نے اپنی جنگی صلاحیتوں اور منصوبہ بندی سے انگریزوں کے چھکے چھڑا دیے۔ روشن نے جنگی آلات ،گھوڑا ،اور تلوار چلانے کی مشقیں کی ، پھر اپنے وفادار ساتھیوں کا ایک ٹولہ بنا کر ہر محاذ پر انگریزوں کے دانت کھٹے کئے۔ بارہا انگریزوں کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔ روشن کی پلاننگ اتنی زبر دست ہوتی تھی کہ انگریز بہت زمانے تک یہ سمجھ نہیں پائے کہ ان کو نقصان کس نے پہنچایا ہے۔ طٰہٰ نسیم کو روشن جیسے کردار کو سامنے لانے کے لئے مبارکباد۔
• ''بالکونی'' ماریشش کی نوشین نور محمد کا ناولٹ ہے جسے انجمن فروغ اردو ماریشش سے شائع ہوا ہے۔ نوشین نور محمد گاندھی انسٹی ٹیوٹ کی طالبہ ہیں۔ ماریشش کی تاریخ میں یہ پہلا ناولٹ ہے۔
مذکورہ ناولٹ میں کورونا جیسی مہلک بیماری سے ناولٹ کی کہانی پروان چڑھتی ہے۔ نتاشا اس ناولٹ کا مرکزی کردار ہے۔ جو بچپن سے ہی ہکلاتی ہے، مگر بہت مترنم آواز میں گاتی ہے۔ گاتے وقت اس کی زبان ٹھیک ہو جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ وہ کافی شہرت اور پیسہ کما لیتی ہے۔ جس سے وہ اپنا علاج کراتی ہے اور ٹھیک ہو جاتی ہے۔ اس کے والد اس کی ہکلاہٹ کی وجہ سے شرمندگی محسوس کرتے

ہیں۔اور اس سے کتراتے ہیں۔اسے بھی اپنے والد سے نفرت ہو جاتی ہو۔کورونا کا زمانہ آجاتا ہے۔نتاشا کورونا کے زمانے میں کافی خدمت خلق کرتی ہے۔ایک اچھا جذباتی ناولٹ ہے۔نوشین سے بہت سی توقعات ہیں، آئندہ وہ اس سے اچھا ناول لکھیں گی۔

(مذکورہ کتب کے علاوہ کچھ کتب کے صرف نام دیے جارہے ہیں یہ سبھی ۲۰۲۲ میں شائع ہوئیں۔''گھپ اندھیرے میں کالی بلی کی تلاش'' مرتب: نصیر احمد ناصر (پاکستان)،سلونی۔افسانوی مجموعہ (قرب عباس،)،فتراک۔افسانے (قمر جمالی)،مغمومصنوبر۔اگاتھا کرسٹی (ترجمہ۔یعقوب یاور) آخر یڈان۔ماریو پوژو (ترجمہ۔یعقوب یاور) جہنم۔ڈین براؤن (ترجمہ۔یعقوب یاور) ڈاکٹر ژواگو۔بورس باسترنک (ترجمہ۔یعقوب یاور) نئی ماں۔مریم کریم اہلاوت (ترجمہ۔شمس اقبال) ریشمی اور شیرو (پرویز شہر یار) ہم عصر ناولوں کا اجمالی جایزہ (ڈاکٹر محمد شارب) منٹو اقور واجدہ تبسم کے نسوانی کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ (ڈاکٹر کہکشاں پروین) ارسلان اور بہزاد) کلو۔افسانے (ثمینہ نذیر۔پاکستان) خاہ مخواہ کی زندگی (رفاقت حیات۔پاکستان)۔

☆بہت سے رسائل نے اردو کے فکشن اور فکشن نگاروں پر نمبر اور گوشے نکال کر فکشن کی خدمت کی ہے۔

• **دربھنگہ ٹائمز**، دربھنگہ (مدیر: منصور خوشتر) نے اس سال دو فکشن نگاروں مناظر عاشق ہرگانوی اور خالد جاوید پر نمبر اور گوشہ شائع کر کے واقعی کمال کر دیا ہے۔۱۹ نومبر ۲۲ میں خالد جاوید کو ان کے ناول ،نعمت خانہ کے انگریزی ترجمے کے لئے، جے سی بی ایوارڈ ملا۔اور دسمبر میں منصور خوشتر نے دربھنگہ ٹائمز میں خالد جاوید پر ایک گوشہ شائع کر کے کمال کر دیا۔یہ گوشہ اکتوبر تا دسمبر ۲۲ کے شمارے میں شائع ہوا۔گوشے میں خورشید اکرم، کوثر مظہری، مجیر احمد آزاد، نہال افروز، محمد عاصم بدر، خورشید حیات کے مضامین کے علاوہ ناول ''نعمت خانہ'' کا ایک حصہ شائع ہوا ہے۔بروقت گوشہ نکالنے میں دربھنگہ ٹائمز کا جواب نہیں۔دربھنگہ ٹائمز نے مناظر عاشق ہرگانوی کے انتقال کے بعد ایک اچھا خاصا گوشہ شائع کر کے انہیں سچا خراج پیش کیا ہے۔

• **''عالمی فلک''** دھنباد (مدیر: احمد نثار) نے اس سال اپنے شمارہ نمبر ۸-۷ میں حسین الحق پر گوشہ شائع کیا ہے۔حسین الحق بہار ہی نہیں، قومی اور بین الاقوامی شخصیت کے مالک تھے۔اردو افسانے اور ناول کے میدان میں اپنا جواب نہیں رکھتے ہیں۔۱۴۵ صفحے کے گوشے میں ۱۳ مضامین اردو کے اسکالرز کے ہیں۔اور حسین الحق کی ایک مشہور کہانی ''ناگہانی''، ایک مضمون ''اردو افسانے کے متنوع

اسالیب‘‘ شامل ہے۔گو شے میں عبد الصمد، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر غضنفر، پروفیسر صغیر افراہیم، مشتاق احمد نوری، معصوم عزیز کاظمی، سید احمد قادری، احمد صغیر، شہاب ظفر اعظمی، شعیب نظام، سید اشہد کریم، مرغوب فاطمی وغیرہ کے مضامین حسین الحق کی شخصیت اور ادب کے لئے اچھا خراج ہے۔

• ’’**دستک**‘‘ **بنارس ہندو یونیورسٹی**، شعبہء اردو کا ترجمان رسالہ ہے۔جس کے مدیر پروفیسر آفتاب احمد آفاقی ہیں۔رسالے کا ۹ واں شمارہ (جنوری تا جون ۲۲) میں معاصر ناول نمبر ہے۔دستک نے اپنے خاص شماروں سے اپنی ایک الگ شناخت قائم کی ہے۔

معاصر ناول نمبر کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حسے میں ناول کے فن پر بات کی گئی ہے۔اس حصے میں چھ مضامین شامل ہیں۔جس میں عابد علی عابد، احسن فاروقی، نورا

لحسن ہاشمی، کلیم الدین احمد، وارث علوی، سرور الہدیٰ، فیضان الحق کے مضامین شامل ہیں۔دوسرا حصہ تنقید ہے، اس میں قدوس جاوید، علی احمف فاطمی، سفینہ بیگم وغیرہ کے مضامین شامل ہیں۔تیسرا حصہ ناولوں کے تجزیے پر مشتمل ہے۔اس حصے میں ۱۳ ناولوں کے تجزیے شامل ہیں۔جس میں علی احمد فاطمی، منظر حسین، شافع قدوائی، انتخاب حمید، رضی الرحمٰن، آفتاب احمد آفاقی، شاہ حسین احمد، ہمایوں اشرف جیسے اسکالرز کے

مضامین شامل ہیں۔ان مضامین کے مطالعے سے معاصر ناول کو سمجھنا قدرے آسان ہے۔

• ’’**ثالث**‘‘ (مدیر: اقبال حسن آزاد) مونگیر سے شائع ہونے والا معروف سہ ماہی رسالہ ہے۔نئے افسانے کے فروغ دینے، عالمی پلیٹ فارم عطا کرنے اور نئی نسل تیار کرنے کے لئے ثالث کے کردار سے کسی کو انکار نہیں۔اس سال ثالث نے شمارہ نمبر ۲۱۔۲۲ میں شوکت حیات نمبر شائع کر کے معروف فکشن نگار کو اچھا خراج پیش کیا ہے۔

تقریباً ۵۰۰ صفحات پر مشتمل شوکت حیات نمبر میں شوکت حیات کا بھرپور تعارف، بیس تنقیدی مضامین، سات خاکے، چار تجزیے، دو انٹرویوز، شوکت حیات کے خطوط، تنقیدی مضامین، منتخب افسانے (۷) ایک ناولٹ ’سرپٹ گھوڑا‘ کی شمولیت سے جہاں شوکت حیات کی زندگی اور فن پر روشنی

پڑتی ہے، وہیں اقبال حسن آزاد کی ادارت کا بھی پتہ چلتا ہے۔اس ضخیم نمبر کے لئے اقبال حسن آزاد مبارک باد کے مستحق ہیں۔یہ نمبر شوکت حیات پر کام کرنے والوں کے لئے جڑی بوٹی سے کم نہیں۔

• ''ورثہ''نیو یارک (مدیر:نصیروارثی) نے اپنے اکتوبر تا دسمبر ۲۲ کے شمارے کو گوپی چند نارنگ نمبر کی شکل میں شائع کیا۔واضح ہو کہ ورثہ، نیو یارک ،امریکا سے شائع ہونے والا بین الاقوامی سہ ماہی رسالہ ہے۔جس نے خود کو واقعی عالمی ثابت کیا ہے۔یہ رسالہ نہ صرف اپنے مواد کے سبب بلکہ اپنی پہنچ کے اعتبار سے بھی بینالاقوامی ہے۔معروف ناقد ومحقق پروفیسر گوپی چند نارنگ اس رسالے کے سر پرستِ اعلیٰ تھے۔نارنگ صاحب ایک بڑے فکشن ناقد بھی تھے۔فکشن پر ان کی کتابیں آج تک رسرچ اسکالرز کی رہنمائی کرتی ہیں۔

ورثہ کے نمبر میں ۲۷ مضمامین شامل ہیں۔نارنگ صاحب کی تصاویر،ان کی تحریر کے نمونے وغیرہ سے سجا یہ نمبر گوپی چند نارنگ پر کام کرنے والوں کے لئے اکسیر سے کم نہیں۔اس میں مرزا خلیل احمد بیگ،اشفاق حسین،مسعود سراج ادیبی،ستیہ پال آنند،ابن کنول،ف س اعجاز،شہناز قادری،لطیف احمد،فاطمہ حسن،رئیس وارثی،اسود گوہر،مصطفیٰ خان ،ریشا قمر،سنجیدہ سلطانی،نصیروارثی،صدف نقوی،راشدمیاں، وغیرہ کے مضامین اس اہم نمبر میں شامل ہیں۔

☆ اس سال ہمارے بہت سے فکشن نگار اور فکشن ناقدین ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔مگر ان کے کارہائے نمایاں ہمارے ساتھ رہیں گے۔کتابیں،تصاویر،سیمینار،ورکشاپ میں دیے گئے ان کے بیان ادب میں ہر موڑ پر ہمارے ساتھ ہوں گے۔ہم انہیں کبھی بھلا نہیں پائیں گے۔گوپی چند نارنگ ،شموئل احمد،ا،اسلم آزاد،ا،کرامت علی کرامت،جعفر رضا،متین اچل پوری،فیاض رفعت،جعفر رضا،سیما صغیر،بشریٰ رحمٰن،قیصر نذیر خاور وغیرہ ہم سے جدا ہو گئے۔

☆ اس سال فیس بک ،وہاٹس ایپ ،یوٹیوب ،ویڈیوز کے ذریعہ اردو کے فروغ میں بہت ست اداروں نے بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔بزمِ افسانہ ،وہاٹس ایپ پر چھائی رہی۔یہاں ہر دوسرے روز کسی نا کسی ایونٹ کے تحت ایک افسانہ اپ کیا جاتا رہا۔دو دن تک افسانے پر تنقید کا سلسلہ جاری رہتا اور افسانہ نگار کے تاثرات پر ہی سلسلہ جاری رہتا۔پھر نیا افسانہ۔ہندو پاک کے بڑے چھوٹے سبھی افسانہ نگار اس میں شرکت کرتے۔تنقید کرنے والوں کی تعداد کبھی کبھی کئی درجن ہو جاتی۔بزم افسانہ کی منتظمین کو مبارکباد۔

پاکستان میں چاک فکشن فورم نے آن لائن اور آف لائن افسانے کے پروگرام کر کے خاصا ہنگامہ بپا کر رکھا ہے۔اس فورم کو وہاٹس ایپ پر بھی دیکھا اور پڑھا جا سکتا ہے۔اس میں بھی افسانے اور تنقید پیش کی جاتی ہے۔حلقہء ذوق ،کراچی نے بھی روز پروگرام کے کے اردو کے فراغ

میں حصہ لیا ہے۔ بنات (بین الاقوامی نسائی ادبی تنظیم) گروپ میں خواتین کی تخلیق کاروں کی تخلیق (افسانے، خواب، یادوں کے جھروکے) پیش کی جاتی ہیں۔ اردو چینل ممبئی نے بھی فکشن پر کئی کتابیں اپ لوڈ کر کے اور آف لائن پروگرام کر کے خود کو ثابت کیا۔ اردو کارواں، ممبئی نے ہر سال کی طرح امسال بھی ''عشرہ ءاردو'' پروگرام آن لائن اور آف لائن کر کے اردو والوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر نے کی کوشش کی۔ اردو کاواں ، نے سال بھر بھی مختلف پروگراموں کے ذریعہ اردو خدمت انجام دیں۔ آیوسا کے بینر تلے ادب نما (شعبہ ءاردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ) کے ادبی پروگرام سال بھر ہر جمعرات کو پابندی سے منعقد ہوتے رہے۔ آوارگی وتھ دانش، جاوید دانش، کناڈا، ہر ہفتے زوم کے ذریعہ نئے نئے مہمانوں کے ساتھ ادبی پروگرام منعقد کرتے رہے۔ ارشد احتشام نظامی (امریکا) بھی پابندی سے ہر ہفتے زوم کو ذریعہ پروگرام کرتے رہے۔ گلشن افسانچہ، بزم ثار، افسانہ اور افسانچہ، وہاٹس ایپ گروپ پر افسانے اپ لوڈ کے سال بھر چرچا میں رہے۔ عالمی افسانہ فورم، وولر ادبی گروپ، انہماک انٹرنیشنل گروپ کے ذریعہ فیس بک پر افسانے ، افسانچے اور مائکرو فکشن کے مختلف پروگرام منعقد کرتے رہے۔ دنیائے افسانچہ کے تحت پرویز بلگرامی نے مختلف موضوعات کے پر مبنی یوٹیوب پر افسانچوں کی قرات جاری رکھی۔ افسانوں کی پڑھت کا نیا سلسلہ شروع ہوا جو پاکستان میں خاصا مقبول ہو رہا ہے۔

☆ اس سال پروفیسر خالد جاوید کے ناول ''نعمت خانہ'' کے انگریزی ترجمہ ''Paradise of Foods'' کو پہلے جے سی بی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ایوارڈ میں دوسری زبانوں کے ناول بھی شامل تھے۔ مگر یہ اعزاز اردو کے حصے میں آیا۔ اس میں ڈاکٹر خالد جاوید کو پچیس لاکھ روپے اور مترجم ڈاکٹر باراں فاروقی کو دس لاکھ روپے کی رقم بطور انعام ملی۔ خالد جاوید اس عہد کے ممتاز فکشن نگار ہیں۔ ان کے افسانے اور ناول موجودہ عہد کی ترجمانی کرتے ہیں اور خالد جاوید زندگی کے بارے میں اپنا فلسفہ رکھتے ہیں۔ ان کے معروف ناولوں میں، موت کی کتاب، ایک خنجر پانی میں، اور افسانوی مجموعے برے موسم میں، تین کہانیاں وغیرہ اردو ادب میں الگ مقام رکھتے ہیں۔

انیس اشفاق کے ناول ''خواب سراب'' کو اس سال کے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کے لئے منتخب کیا گیا۔ انیس اشفاق نے اپنی تحقیق وتنقید سے ادب میں اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے۔ لیکن گذشتہ دو دہائیوں میں انیس اشفاق نے خود کو ایک فکشن نگار کے طور پر بھی مستحکم کیا ہے۔ ان کے کئی ناول دکھیارے، پری ناز اور پرندے نے کافی دھوم مچائی ہے۔

اس سال ساہتیہ اکادمی کا مترجم کے ایوارڈ کے لئے رینو بہل کو منتخب کیا گیا۔جن کے کئی افسانوی مجموعے اور ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔محمد بشیر مالیر کوٹلوی کو پنجاب سرکار کے ذریعہ شرومنی ایوارڈ،شعبہ ء اردو ، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے ذریعہ چھٹا منظر کاظمی نیشنل فکشن ایوارڈ دیا گیا۔بشیر مالیر کوٹلوی ۱۹۷۰ کے بعد کے ایک اہم فکشن نگار ہیں ،جن کے چھ افسانوی مجموعے،دو ناولٹ،ایک افسانچوں کا مجموعہ اور کئی تنقیدی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

شعبہ ء اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے ذریعہ چھٹے منظر کاظمی نیشنل فکشن تنقید ایوارڈ سے پروفیسر قدوس جاوید، جموں کو سرفراز کیا گیا۔شمیم نکہت فکشن ایوارڈ صدیق عالم (کولکا تہ) کی خدمت میں اور لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ جناب عارف نقوی (جرمنی) کو پیش کیا گیا۔اس موقع پر پروفیسر ابن کنول نے معاصر اردو فکشن موضوع پر پر مغز مقالہ پیش کیا۔

شعبہ ء اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے ذریعہ معروف فکشن نگار سید محمد اشرف کو سرسید نیشنل یوارڈ ۲۰۲۲ برائے ادب دیا گیا۔

• '' منٹو اور واجدہ تبسم کے نسوانی کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ'' ڈاکٹر کہکشاں پروین کی تحقیقی وتنقیدی کتاب ہے، جسے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیا ہے۔کہکشاں پروین کی اس سے قبل کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ پانچ افسانوی مجموعے، دو تحقیقی وتنقیدی کتب، دو مضامین کے مجموعے ایک نثری نظموں کا مجموعہ شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔

مذکورہ کتاب میں ڈاکٹر کہکشاں پروین نے منٹو اور واجدہ تبسم کے نسوانی کرداروں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔مصنفہ نے منٹو اور واجدہ تبسم کا انتخاب مناسب طور پر کیا ہے۔منٹو نے جس طرح جنسیت کے ذریعہ سماج کے داغدار چہرے کو سامنے لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ان کے بعد یہی کام وجدہ تبسم نے کیا ہے۔واجدہ تبسم نے حیدر آباد کے نواب اور اہل ثروت بد کردار لوگوں کو بے نقاب کرنے کے لئے افسانے اور ناولوں میں تخلیقی اظہار کیا ہے۔مصنفہ نے ان دونوں کے اس زمرے کے مشہور افسانوں کے تجزیے بھی پیش کئے ہیں۔منٹو کے افسانے ہتک،ٹھنڈا گوشت،کھول دو،کالی شلوار،موذیل،بو،ننگی آوازیں،ممی اور واجدہ تبسم کے افسانے ذرا ہور اوپر،نکو اللہ،نولکھا ہار،اترن، پیش بندھی کے تجزیے نے اس کتاب کو مزید کارآمد بنا دیا ہے۔

☆☆☆

Ekkeesvin Sadi ke Khad-o-khal aur Urdu Shairi by Dr. Afshana

(Srinagar)cell-8082396933

ڈاکٹر افشانہ (سرینگر)

اکیسویں صدی کے خدوخال اور اردو شاعری

اردو ادب کے ادوار میں مختلف رجحانات وجود میں آئیں لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ یہ اپنی حد بندیوں کے بند نظریات، مرکزیت نامے یا فارمولے وضع کرنے کی بنیاد پر زوال پذیر ہوئے۔ جہاں ادب کے مارکسی نظریہ نے دنیا کی بیشتر زبانوں کے ادباء اور شعرا کی ایک پوری کھیپ کو اسلوب اور ہیت کے ایک ہی بندھے ٹکے کھونٹے سے باندھ کر اُن کی فنکارانہ صلاحیتوں پر معنویت کی ایک موٹی تہہ چڑھا دی گئی وہی دوسری طرف جدیدیت کے زیر اثر ردعمل معرض وجود میں آیا کہ ادب کی تخلیقی سمتوں کے حوالے سے کچھ مخصوص عقائد و نظریات سے انحراف کر کے اجتماعیت پر انفرادیت کو فوقیت دی گئی۔ جدیدیت کے تصور نے ہماری صدیوں پرانی روایت اور ذہنی نہجوں کو ہم سے چھین تو لے ہی لیا ساتھ ہی کچھ ایسے احساسات سے بھی زندگی کو روبرو کرایا جو تنہائی، مایوسی اور جنبیت سے تعبیر ہے۔ اُس پُرطُرہ یہ ہے کہ انفرادیت پسندی جو جدیدیت کا انسان اور انسانیت کو سب سے خراب تحفہ ہے نے انسان کو موت جیسی اَن چاہی شے سے اور بھی زیادہ خوف زدہ کر دیا ہے۔ جدیدیت میں فرد کی اجنبیت، تنہائی، شکستِ ذات کا ذکر، سیاست اور احساس بھرم کی یلغار ہوئی۔

مابعد جدید دور میں جہاں نئی پیڑیاں جدیدیت سے انکار کرتی ہیں وہاں ترقی پسندی کی جکڑ بندی، ادعائیت اور خوش آیند تصورات کے کھوکھلے پن سے بھی خوب واقف ہیں اور اس کو بھی رد کرتی ہیں۔ گوپی چند نارنگ کے مطابق:

''مابعد جدیدیت تھیوری سے زیادہ صورت حال ہے۔ یعنی جدید معاشرے کی تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی حالت، نئے معاشرے کا مزاج، مسائل، ذہنی رویے یا معاشرتی و ثقافتی فضا یا کلچر کی تبدیلی جو کرائسس کا درجہ رکھتی ہے۔'' [۱]

بیسویں صدی کی سائنسی ترقی اور دانشوری نے جہاں رنگِ حیات کو یکسر تبدیل کیا وہی اس تبدیلی کے منفی اثرات انسانی اقدار اور جذبات کی جمالیات پر بھی پڑے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے

جہاں موجودہ صدی میں ترقی کے اتنے ہفت خواں طے کیے کہ انسانی آنکھ کو حیرت سے دیکھنے کے سوا کچھ نہیں سوجھتا، وہی انسان زندگی کے کئی اقدار سے بے خبر بھی ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ جدیدیت کے دور میں جو چیزیں حاشیے پر چلی گئی عکسِ مابعد جدیدیت صورتِ حال کے تحت وہ مرکز کی طرف آنے کے لیے اپنے ہاتھ پاؤں مارنے لگی ہے۔ گویا کہ پہلے سے چلے آرہے بہت سے نظریات وتصورات جن کو انسان پہلے آنکھیں بند کرکے قبول کر لیتا تھا، اب چیلینج کی زد میں آگئے ہیں۔

غرض جب مابعد جدید صورتِ حال کے تناظر میں اردو ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو نئی نسل خصوصاً جو ۱۹۸۰ء کے بعد کے آس پاس سامنے آئی۔ ان کے یہاں ایک طرف اردو کی مثبت روایت سامنے تھیں تو دوسری طرف ترقی پسندی اور جدیدیت کے زوال کا منظرنامہ بھی تھا۔ نتیجے میں نئے لکھنے والوں نے زندگی کی حوصلہ مند قوتوں کو نئے افکار کی روشنی میں آزادانہ طور پر برتنے کی سعی شروع کی۔ اس لیے محسوس ہوتا ہے کہ یہ نسل مابعد جدیدیت کے تصورات سے کچھ زیادہ قریب ہے۔ ظاہر ہے کہ اردو شاعری خصوصاً (غزل) میں مابعد جدید صورتِ حال کے نقطۂ نظر سے بحث ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ اُس کے نکات واضح طور پر کسی ایک عہد یا رجحان کی قید میں نہیں بلکہ یہ زمان ومکان کے بے حد وسیع تناظر میں اپنا کام سرانجام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بقولِ عشرت ظفر:

''ادبی سطح پر کوئی بھی تحریک ہو یا رجحان، غزل ہر رنگ میں توانائی کے تندوتیز آبشار کی مثال پیش کرتی رہی ہے۔ تمام ناقدین ادب نے ایماندارانہ طور پر اس کی توانائی کو تسلیم کیا ہے،۔ کلاسکیت میں اُس کی منفرد شوکت وشان، جدیدیت میں اس کا اظہار رنگ روپ نمایاں، اور اب مابعد جدیدیت میں اس نے اس انداز سے کروٹ لی ہے کہ چشم تماشا کے گرد حصار حیرت بہت تیزی سے قائم ہوتا جارہا ہے۔ اور اسی حصار میں غزل ایسے جلوؤں کے ساتھ اتر رہی ہے کہ بے کراں شاہراہوں پر نئے سنگ میلوں کی نقیب ہوتی جارہی ہے (یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ ترقی پسندوں نے اس سے انحراف کیا تھا مگر اس کی توانائی کو متاثر نہیں کرسکیا ورفنا کے گھاٹ اتر گئے۔'' ۲

موجودہ اردو ادب میں کئی طرح کی آوازیں ملتی ہیں۔ جنہیں ہم مابعد جدید صورتِ حال کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے منفرد لہجے سے اردو شاعری کو ایک نیا رنگ وآہنگ عطا کیا اور اسے اظہار کے نئے امکانات کی نوید دی۔ ان کی شاعری ہنوز اپنے تشکیلی دور سے گزر رہی ہے۔ ظفر اقبال، فصیح اکمل، ندیم صدیقی، بشیر بدر، عرفان صدیقی، فرحت احساس، حامدی کاشمیری وغیرہ وہ قابل ذکر نام ہیں جن کے یہاں زبان وبیان کا سلیقہ ٹیکنیکی نمایاں ہے۔

ہمارے شہروں میں کم قامتوں کا زور اتنا ہے اسی کا قتل ہو جاتا ہے جس کا سر نکلتا ہے
(فصیح اکمل)

اونچی اونچی بلڈنگیں اور چمنیاں یاں تو میرا گاؤں تھا وہ کیا ہوا (ندیم صدیقی)

شاعری اقدار کو شخصیت سے ہم آہنگ کر کے زندگی کے عمل میں اِن دونوں کے حسن کو سموئی رہتی ہے اور زندگی کی بدلتی ہوئی صورتوں میں اس کیفیت کو قائم رکھتی ہے جو ماضی سے حال کے وابسطہ ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔ جدیدیت کے دور میں جو چیزیں حاشیے پر چلی گئیں تھیں وہ پھر سے اپنے ہاتھ پاؤں مارنے یا پھیلانے کی تلاش میں سرگرداں ہیں یونی مابعد جدیدیت ماضی کی بازیافت پُر زور رہتی ہے۔ مابعد شعراء نے آفاقی قدروں اور طے شُدہ سچائیوں کے برعکس صفائی تہذیبی اور ثقافتی قدروں کی بازیافت پر زور دیا ہے جو کہ ہماری شاعری کی ایک قدیم اور اہم روایت بھی رہی ہے۔ جسے ہر دور کے شعراء نے اپنے اپنے ا]راف و اکناف کے حالات و واقعات کے مطابق ورثے کی حیثیت سے برتا ہے۔

نئی ہوا میں مہک ہے پرانے پتوں کی جو خاک ہو گئے پر شاخ سے جدا نہ ہوئے
(ظفر اقبال)

میں اپنی کھوئی ہوئی لوح کی تلاش میں ہوں کوئی علم مجھے چار سو پکارتا ہے
(عرفان صدیقی)

دکانیں شہر میں ساری نئی ہیں ہمیں سب کچھ پرانا چاہیے تھا (خاور اعجاز)

ظفر اقبال کے شعر میں پرانے پتوں کا جو استعاراتی پیکر بنتا ہے وہ پرانی اقدار اور اُن اقدار سے وابسطہ اشخاص کی تصویر ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے، ان قدروں کے حوالے سے روحانی اور اخلاقی سہارے پر اُن کے اعتماد کی مراجعت کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی تک شعراء جس طرح دیکھتے اور محسوس کرتے رہے ہیں اس طرح پیش کرنے کی دیانتدارانہ کوشش ان کا اولین عمل رہا ہے کسی فرضی چار دیواری کے اندر وہ بند رہنا نہیں چاہتے بلکہ اُن کو اچھی روایات کا علم بھی ہے۔ غرض ان شعراء سے جس شعری منظر نامے کی تشکیل ہوئی ہے۔ اُس میں ماضی کی بازیافت کو ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔

حوالہ جات: 1۔ گوپی چند نارنگ، اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ، ص: ۹۱۔
2۔ عشرت ظفر، مابعد جدید غزل، اور مابعد جدیدیت پر مکالمہ، ص: ۱۶۷۔
☆☆☆

Lal Arifa:Ek Azeem-ul-Martabat Shakhsiyat by Muzaffar Yousuf

(Anantnaag,jammu&kashmir)cell-7006044890

مظفر یوسف (اننت ناگ، جموں کشمیر)

للِ عارفہؒ: ایک عظیم المرتب شخصیت

وادی کشمیر نہ صرف خوبصورتی کے لحاظ سے مشہور ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ اس سرزمین پر عظیم ادبی شخصیات نے جنم لیا ہے جن میں حضرت شیخ نورالدینؒ اور للِ عارفہ مشہور و معروف ہی نہیں بلکہ کشمیری لوگ ان ناموں کو آج بھی عقیدت کے ساتھ لیتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان دو عظیم شخصیتوں کی تخلیقی صلاحیت سے کشمیری ادب کا باضابط آغاز ہوا ہے۔ للِ عارفہؒ کی عظمت و شان مدنظر رکھتے ہوئے حضرت شیخ نورالدینؒ اپنے کلام میں اس عظیم شخصیت کو اس طرح خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

تس پدمان پورچہ للے ییمہِ گلہِ گلے امریتھ چیوو
س سان اوتار للے تتھ ورے دِتم دوو

یعنی للِ عارفہ جس نے پدمان پور (پانپور کا قدیم نام) میں جنم لیا اور جس نے گھونٹ گھونٹ امریت پیا۔ یہاں پر حضرت شیخ نورالدینؒ نے للِ عارفہ کو اوتار کا لقب دے کر اس کی عظمت بیان کی ہے۔ للِ عارفہؒ اس وقت رونما ہوئی جب حضرت امیر کبیرؒ کشمیر میں اسلام کو پوری طرح سے رائج کرنے کے تبلیغی کام میں مصروف تھے۔ لیکن بدقسمتی سے اس عظیم ادبی شخصیت کی ابتدائی زندگی کے متعلق تاریخ بھی خاموش ہے۔ قیاس کیا جارہا ہے کہ اس کی پرورش عام برہمن کسان لڑکیوں کی طرح ہوئی ہوگی۔ ظاہری تعلیم کے متعلق بھی تاریخ خاموش ہے اور عقیدت مند لوگ اس کے ان پڑھ ہونے ہی کے معترف ہے۔ لیکن خاندان کے لحاظ سے اُس کو مذہبی تعلیم ملی ہوگی۔ جس کا احساس اُس کے کلام کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے۔ للِ عارفہ کہتی ہے ۔

اویژار ہا مالہ چھی پوتھن پران یُتھ طوطہ پران رام پنجرس
گیتا پر ان ہیمتاہ لبان پرم گیتا تہ پران چھس

یعنی بے سمجھ لوگ کتابیں پڑھتے ہیں ان پر عمل نہیں کرتے۔ جیسے طوطا پنجرے میں رام پڑھتا ہے۔ وہ گیتا صرف دکھاوے کے لئے پڑھتے ہیں۔ میں نے گیتا پڑھی ہے اور اس پر عمل بھی

کرتی ہوں۔

دہ تار سمسارس لول بورم پتو زونم کینہ نتہ کیاہ

ہاوسہ للہ لے علماہ پورم پر پرکورم تہ پورم نہ زانہہ

یعنی میں نے چند دن دنیا سے محبت کی۔آخراس کی حقیقت معلوم ہوئی کہ اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔میں نے بڑے شوق سے علم حاصل کیا لیکن دل کو پڑھنے سے تسکین حاصل نہیں ہوئی۔ان شلوکوں سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لل عارفہ پڑھی لکھی تھی،جس طرح اس نے اپنے کلام میں سنسکرت الفاظ کو نگینوں کی طرح جڑا ہے۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ لل دید نے درسی تعلیم پائی تھی۔اگر چہ ہم عصر مورخین نے اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے تاہم بعد کے نزدیک ترین مورخین جن میں جونہ راج،شری وراور شوکہ پنڈت خاص طور پر قابل ذکر ہیں وہ لل عارفہؒ کے متعلق خاموش ہیں۔اس کے چند وجوہات یوں ہیں:

ا۔لل عارفہ مجذوبانہ حالت میں عریاں گھومتی پھرتی تھی۔مورخین نے دیوانہ تصور کر کے اس کا تذکرہ غیر ضروری سمجھا ہوگا کیونکہ ایک برہمن گھرانے کی لڑکی کا اس حالت میں گھومنا پھرنا سماج کے لے معیوب خیال کیا جاتا تھا۔

۲۔جونہ راج وغیرہ جو لل عافہ کے بعد اس زمانے کے نزدیک ترین مورخین تھے،سلطان زین العابدین بڈشاہ کے درباری شعراء اور خاص مشیر تھے۔انہوں نے سنسکرت نظم میں اس وقت کے سیاسی حالات قلمبند کے ہیں،ایک جانب بادشاہ کی خوشنودی کے لئے سیاسی حالات تحریر کئے ہیں ،دوسری جانب صنف شعر کا خاص خیال بھی تھا۔حالانکہ کشمیر کی سیاسی تاریخ میں حضرت امیر کبیرؒ کی آمد ایک اہم تاریخی واقعہ ہے،جس کا تذکرہ ان مورخین نے بلکل نظر انداز کر دیا ہے۔اسی سے ان کی تاریخی بصیرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

پی۔این۔کے بامزائی اپنی کتاب "culture and political history of kashmir" میں لل عارفہ کی ادبی زندگی کے متعلق اس طرح رقمطراز ہیں۔

" In the 14th century when Lalleshwari appeared on the scene, she realised that the times demanded the propagation of her doctrine in the language of the masses. She poured forth her heart, rich in spiritual and mystic

experience , in kashmir verse. Her language is easier to follow and in some cases comes very near to that spoken now. Her sayings which became popular were learnt by heart by her followers and in this way were passed down from generation to generation. "

ہمارے سامنے بابا نصیب الدین غازیؒ، بابا داود مشکوتی اور خواجہ اعظم دیدہ مری ہی لل عارفہؔ کے نزدیک ترین تذکرہ نگار اور مورخ ہیں۔ انہوں نے لل عارفہ کے متعلق ہمیں تحریری طور پر روشناس کرایا ہے۔ان کے بعد پنڈت بیربل کاچرو اور پیر حسن شاہ کھویہامی نے لل عارفہ کا تذکرہ اپنی تواریخ میں کیا ہے۔ ان مقامی مورخین کے بعد ملکی اور غیر ملکی تذکرہ نگار جن میں بہلر، سر جارج گریرسن اور رچارڈ ٹیمپل وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ باوجود ان دستاویزات کے زیادہ اہم اور معتبر حالات و واقعات خود لل عارفہ کے کہے ہوئے شلوک ہیں، جو اس کے حالات زندگی کے متعلق قابل اعتبار اور صحیح ہیں۔

لل عارفہؔ کی ازدواجی زندگی کا حال نہایت ہی عبرت ناک ہے۔ سسرال میں لل عارفہ کو سخت تکلیف تھی۔ ساس نے اس کو کبھی دن بھر کام کاج کے بعد پیٹ بھر کھانا نہ دیا اور نہ ہی لل عارفہ کو سکون اور چین سے زندگی گزارنے دی، ساس اس کو ہر وقت کوستی تھی چنانچہ اس کے برتن میں گول پتھر رکھ کر اس پر کھانا رکھ دیتی تھی جس سے باقی اہل خانہ کو یہ دکھائی دیتا تھا کہ برتن کھانے سے بھرا ہے۔لل عارفہ کھانے کے بعد چپکے سے پتھر کو دھو کر واپس برتن میں رکھتی تھی۔ چنانچہ یہ راز ایک دن فاش ہوا جبکہ لل عارفہ کے سسرال میں دعوت پر گوشت اور مچھلیاں پکی تھیں صبح کو حسب عادت جب لل عارفہ دریا پر پانی بھرنے گئی تو سہیلیوں نے اس سے کہا کہ رات کو للؔ نے ہمیں پوچھا تک نہیں خود پیٹ بھر گوشت و رمچھلیاں کھالیں ،للؔ نے جواب میں کہا۔

ہونڈ مارتن یا کونڈ   للِ نلہ وٹھ ژلہِ نہ زانہہ

یعنی بھیڑ کو ذبح کریں یا مچھلیاں پکائیں لل کے لے پتھر کا بٹہ کبھی نہیں ٹل سکتا۔ کہتے ہیں کہ للؔ کے سسر نے بھی اتفاقاً یہ کلام سُنا تو گھر میں جا کر بات کی تحقیق کی تو اس نے اپنی بیوی کو تنبیہہ کی لیکن ساس اور خاوند نے اس پر اور زیادہ سختیاں کیں ،ایک دن لل دریا پر پانی بھرنے گئ۔ پانی لانے میں ذرا دیر ہوئی تو اس کا خاوند غصے میں اس کو دیکھنے نکلا۔ راستے میں اس نے للؔ کو سر پر پانی کا

مٹکا لئے ہوئے دیکھا تو غصہ کی حالت میں اس نے چھڑی پانی کے مٹکے پر زور سے ماری۔ مٹکا ٹوٹ گیا لیکن پانی للؔ کے سر پر معلق رہ گیا۔ للؔ نے پانی کو ایک طرف جا کر ڈالا وہ ایک چھوٹی سی جھیل کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ جگہ اس وقت بھی لل تر اگ کے نام سے مشہور ہے۔ اس بات کا چرچا عام ہوا تو لل نے دنیا کو خیر باد کہا۔ دراصل یہی اسباب قادر مطلق نے اس کے ترک دنیا کے لئے مہیا کئے تھے اور وہ دنیا چھوڑ کر عقبیٰ کی تلاش میں نکل پڑی، خود للؔ کہتی ہے۔

مایہ ہیونہ پرکاش کنے   پیں ہیونہ تیرتھ کانہہ
دیس ہیونہ باندو کنے   بھیس ہیونہ سکھ کانہہ

یعنی عرفان کے برابر کوئی روشنی نہیں، تلاش حق کے برابر کوئی تیرتھ نہیں، پرماتما کے برابر کوئی رفیق نہیں اور خوف خدا کے برابر کوئی سکھ نہیں۔ دوسری جگہ لل عارفہؔ کہتی ہے۔

گورس پر ژھام ساسہ لٹے   یس نہ کینہہ ونان تس کیاہ ناو
پرژھان پرژھان تھچس تہ لوسس   کینہہ نس نشہ کیاہ تام دراو

یعنی میں نے گورو سے ہزار بار پوچھا جس کا کچھ نام نہیں اس کو کیا کہتے ہیں؟ میں پوچھتے پوچھتے تھک گئ۔ کچھ ہے جو سب کی اصل ہے لیکن اس کا بیان کرنا عقل سے باہر ہے۔ معرفت الٰہی کی جستجو میں للؔ دنیا کی قید و بند سے آزاد ہو کر برہنہ پھرنے لگی چنانچہ اپنی برہنگی کے متعلق کہتی ہے۔

گورن دپنم کُنے وژن   نیبر دپنم اندا ژن
سُے مے للِ گوم واکھ تہ وژن   توے ہیوتم ننگے نژن

یعنی گورو نے مجھے ایک ہی طریقہ بتایا اور کہا کہ باہر سے اندر چلی جا اسی سے مجھ میں کچھ ایسی کیفیت طاری ہو گئکہ میں برہنہ ادھر اُدھر گھومنے پھرنے لگی۔ عام روایت ہے کہ لل عارفہ جب عریاں پھرنے لگی تو قدرت نے اس کے پیٹ سے ایک تھیلی جیسی کوئی چیز نیچے کو لٹکا دی جس سے اس کی شرمگاہ پر پردہ رہا۔ اسی لئے عوام الناس میں لل عارفہؔ کے نام سے مشہور ہوئی۔

۷۷۳ ہجری میں سید حسین سمنانیؒ کشمیر تشریف لائے جن کا مزارِ مقدس جموں کشمیر کے کولگام ضلع میں واقع ہے۔ اُس وقت اسلام کشمیر میں شاہی شان سے یہاں آ رہا تھا۔ اس لئے کہیں شوق سے کسی جگہ لحاظ سے اس کی اور اس کے ماننے والوں کی آو بھگت ہو رہی تھی۔ وہ کشمیر کی طبیعت کے لئے کئ قابل قبول باتیں لے کر آیا تھا۔ اس لئے اس کو یہاں پھلنے پھولنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ چونکہ لل عارفہؔ کا اپنا ذہن سماج سے الگ تھا اور وہ اسی سماج سے وابستہ تھی۔ لہذا اس کی فطرت تہذیب کے بیشتر

عناصر سے متاثر ہوئی۔اس نے سید حسین سمنانیؒ کی بڑی آؤبھگت کی ۔ کہتے ہیں کہ کئی منزلوں تک ان کے استقبال کو گئی ۔اسی طرح میر سید علی ہمدانیؒ جیسے عظیم بزرگ سے اس کی ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں ۔میر سید علی ہمدانیؒ اور لل عارفہؔ کی پہلی ملاقات کا واقعہ بہت دلچسپ اور مشہور ہے۔اس سلسلے میں دو روایتیں زبان وعام ہیں۔محمد الدین فوق ''خواتین کشمیر'' میں لکھتے ہیں:

''لل عارفہؔ عریانی کے عالم میں رہا کرتی تھی۔ایک دفعہ جب کہ میر سید علی ہمدانیؒ اس کو سامنے سے نظر آئے تو اس نے اپنا بدن چھپا لیا۔اپنے اعضاء ایک دوسرے سے لپیٹ لئے۔زانوؤں کو پیٹ سے چپکا لیا۔میر سید علی ہمدانیؒ نے کہا اے خدا کی دیوانی! یہ کیا حالت ہے، کیا تجھ کو اب تک اپنے برہنہ ہونے کا علم نہ تھا؟لل عارفہ نے کہا،اب تک میرے پاس سے عورتیں ہی گزرتی رہی ہیں،ان میں کوئی مرد اور کوئی آنکھ والا نہ تھا۔تو مجھے مرد خدا اور صاحب بصیرت نظر آیا اس لئے میں تجھ سے اپنا بدن اور ستر چھپا رہی ہوں۔''

اس طرح سے لل عارفہؔ نے کشمیری زبان وادب میں نہ صرف اپنی تخلیقی صلاحیت سے اعلیٰ مقام حاصل کیا بلکہ وہ روحانی تجربات جن کو اُس نے اپنے کلام (واکھ) میں پیش کیا۔لل عارفہؔ کے پیش کئے ہوئے ان ہی روحانی تجربات سے وہ آج تک کشمیری لوگوں کے دلوں پر چھائی ہوئی ہے۔

کتابیات:

۱۔عبدالاحد آزادؔ۔کشمیری زبان اور شاعری۔سرینگر۔۱۹۵۹ء

۲۔پروفیسر جیالال کول۔لل دید۔جموں کشمیر کلچرل اکاڈمی۔سرینگر۔۱۹۸۴

۳"culture and political history of kashmir"۔پی۔این۔کے۔بامزائی۔وجے کے گوپتا۔۱۹۹۴ء

☆☆☆

Hindustan mein jashn-e-nauroz ki saqafati aur tahzibi ahmiyat: ek ajmali jaeza by Dr. Jahangir Iqbal(HOD Persian,Dept.of Persian language and literature,kashmir university,srinagar)cell-7006267565

ڈاکٹر جہانگیر اقبال (صدر، شعبہ فارسی، شعبہ زبان وادبیات فارسی، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر)

ہندوستان میں جشن نوروز کی ثقافتی اور تہذیبی اہمیت؛ ایک اجمالی جائزہ

تلخیص: نوروز کے معنی نئے دن کے ہیں جو کہ شمسی سال کا پہلا دن بھی ہے اور عیسوی حساب سے ۲۱ مارچ کو پوری دنیا میں خاص طور پر فارسی زبان بولنے والے ممالک میں ایک جشن یا تہوار کے طور پر بڑے جوش وخروش کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں بھی یہ دن قدیم زمانے سے منایا جاتا ہے کیونکہ ہندوستان اور ایران کے قدیم زمانے سے روابط رہے ہیں جس کی وجہ سے جشن نوروز کو اس سر زمین میں بھی تقویت اور افادیت ملی۔ ہندوستان میں اس دن کو تہوار کے طور پر مناتے ہے جس میں ایرانی ثقافتی اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس مقالے میں ہندوستان میں نوروز کے تاریخی پس منظر کو پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ساتھ ہی نوروز کی ہندستان میں تہذیبی اور ثقافتی اہمیت کو پیش کیا جائے گا۔ اُمید ہے کہ اس سے تشنگان ادب میں پذیرائی حاصل ہوگی۔

کلیدی الفاظ: نوروز، تاریخی پس منظر، تہذیبی اہمیت، ثقافتی اہمیت، زرتشتی، نوروز جمشید، پارسی۔

تعارف: جشن نوروز کا تہوار اسلامی جمہوریہ ایران اور اس کے ہمسایہ ممالک افغانستان، آذربائیجان، تاجیکستان، ازبکستان افغانستان، پاکستان، کشمیر اور ہندوستان میں قومی عقیدت اور جوش و ولولہ کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ ایرانی قوم عید نوروز کو سال کے اہم تہوار کے طور پر مناتی ہے۔ عید نوروز فقط ایران تک محدود نہیں بلکہ جہاں جہاں تک فارسی زبان کے اثرات ہیں وہاں نوروز کا جشن منایا جاتا ہے۔ اسلامی تاریخ کے لحاظ سے نوروز ہی کا دن ہے جب پہلی بار دنیا میں سورج طلوع ہوا، درختوں پر شگوفے چٹخنے لگے، حضرت ادم علیہ السلام زمین پر اترے، حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کوہ جودی پر اتری اور طوفان نوح ختم ہوا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کو توڑا اور نبی آخرالزمان حضرت محمد مصطفی "صلی علیہ وآلہ وسلم" پر وحی کے نزول کا آغاز ہوا۔

ایران کے معروف دانشور، ریاضی داں اور منجم ابو ریحانی کے نزدیک نوروز خلقت کی

پیدائش کا جشن ہے اور ایسا دن ہے جو لوگوں کو اس بات پر تیار کرتا ہے کہ اپنی پرانی چیزوں کو نئی چیزوں میں تبدیل کر کے خود کو آراستہ اور اپنی روح کو تازگی عطا کرے۔نوروز اکیس مارچ مطابق یکم فروردین یعنی نئے سال کے آغاز جشن کا دن ہے جو بہت ہی قدیم جشن شمار ہوتا ہے، نئے سال کی تحویل اور بہار کے معتدل لمحات کے ساتھ جشن نوروز کا آغاز ہوتا ہے۔

عمر خیام نے نورز نامہ میں ایران کے قومی جشن نوروز کو موضوع بنا کر خداوند متعال کی حمد وستایش کے بعد لکھا ہے کہ میں نے اپنے ایک دوست کی خواہش پر اس تہوار کے بارے میں اپنی والہانہ عقیدت وثقافتی رنگارنگی کی عکاسی کی ہے۔لکھا ہے کہ جمشید نے اس کا نام نوروز رکھا اور جشن منایا۔اس کے بعص دوسرے بادشاہوں اور لوگوں نے ان کی پیروی کی۔

جشنِ نوروز کا آغاز آج سے ہزاروں برس قبل ہوا ترقی کے مختلف مدارج طے کرتے ہوئے اب یہ تہوار بین الاقوامی شہرت اختیار کر چکا ہے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 2010ء میں نوروز کو بین الاقوامی فیسٹول قرار دیا، اسی مناسبت سے ایران نے خصوصی ڈاک ٹکٹ کا اجرکیا جس کا تہران میں 27 مارچ 2010 کو" نوروز کے پہلے بین الاقوامی دن" کی مناسبت سے منعقدہ تقریب میں ایرانی صدر نے اجراء کیا۔جشن نوروز نہ صرف ثقافتی ترقی کی علامت ہے بلکہ یہ قوموں کے درمیان دوستانہ تعلقات کے فروغ، امن اور بھائی چارے کا بھی مظہر ہے۔

نوروز کا دن اقوام متحدہ سے منسلک ثقافتی ادارے یونیسکو میں رجسٹرڈ بھی ہے۔جبکہ 30مارچ 2009ء کو کینڈین پارلیمنٹ نے اپنے اجلاس میں ایک بل پاس کرتے ہوئے نوروز کو قومی کلینڈر میں شامل کیا اس کے ساتھ ہی امریکہ کے ایوان نمائندگان نے بل پاس کرتے ہوئے نوروز کی ثقافتی اور تاریخی اہمیت کو تسلیم کیا۔نوروز ایک ایسا ثقافتی تہوار ہے جو علم دوستی، مساوات، باہمی تعاون اور بھائی چارے کی روایات اپنے ہمراہ رکھتا ہے۔قدیم فارس حکومت کے زیر اثر ہندوستان میں نوروز کے دن کو منانے کی روایت عام ہوئی اور عصر حاضر تک اس جشن کا رواج قائم ہیں۔

ہندوستان میں بہار کی آمد پر جشن منایا جاتا ہے جس کو ''بسنت میلہ'' یا ''جشن بہاراں'' کہا جاتا ہے۔موسم بہار کی آمد کے ساتھ اس جشن کو ہر سال منایا جاتا ہے جس میں کئی رنگارنگ پروگراموں کے علاوہ بچوں کے لئے تفریحی پروگرام، مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے درمیان کھیلوں کے مقابلے، پھولوں کی آرائش کے مقابلے، مشاعرے، چہروں پر نقاشی اور مہندی سجانے کے مقابلوں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔موسم بہار کے شروع ہونے سے پہلے ہی شجر کاری مہم کا بھی آغاز کر دیا

جاتا ہے اور یوں برصغیر کی زرخیز زمین بہار کی آمد کے ساتھ سرسبز نظاروں میں اپنی مثال آپ بن جاتی ہے۔نوروز کا تعلق کسی خاص فرقہ یا مذہب سے نہیں بلکہ یہ دن عالمی دن میں تبدیل ہو گیا ہے جو اقوام متحدہ کے ثقافتی ورثہ میں شامل ہو گیا ہے۔

جشن نوروز کا تاریخی پس منظر: مسلمان ہجرت پیغمبر اسلام کو آغاز اسلامی سال قرار دیتے ہیں اور ایرانی شمسی نظام یعنی زمین کا سورج کے گرد چکر مکمل ہونے کو سال آغاز شمار کرتے ہیں، ایرانی اس آغاز کو ثقافتی دن سمجھ کر مناتے ہیں اور یہ دن فقط ایران تک محدود نہیں بلکہ فارسی زبان جہاں جہاں بولی جاتی ہے وہاں اس کے اثرات زیادہ واضح نظر آتے ہیں جیسے تاجیکستان، افغانستان، آذربائیجان، اور ہندوستان اور پاکستان کے بعض لوگ اس کو جشن یا تہوار کے طور پر مناتے ہیں۔اس جشن کا وجود حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے بھی بہت پہلے ملتا ہے۔نوروز کی علامتیں آگ، روشنی اور سورج ہیں۔ان مظاہر قدرت کی عبادت اس خطہ ارض میں ''جس میں ایران، آذربائیجان اور موجودہ عراق وشام کے چند علاقے شامل ہیں تین ہزار سال قبل مسیح بھی کی جاتی تھی۔

مشہور ایرانی بادشاہ زرتشت کے دور میں نوروز کو خصوصی مقام حاصل ہوا۔زرتشت کے دور میں نوروز چار قدرتی عناصر پانی، مٹی، آگ اور ہوا کا مظہر اور علامت سمجھا جاتا تھا۔اس عقیدے اور حکومتی دلچسپی نے نوروز کو بہت رنگا رنگ اور پُر وقار بنا دیا۔مغربی چین سے ترکی تک کروڑوں لوگ نوروز مناتے ہیں جو شمسی سال کے آغاز اور بہار کی آمد کا جشن بھی ہے اور ایران، افغانستان، تاجکستان، ازبکستان، اور شمالی عراق کے علاوہ اس کے کچھ علاقوں میں کیلنڈر سال کا نقطہ آغاز بھی۔ جشن نوروز شروع ہونے کا سرکاری طور پر اعلان بھی کیا جاتا ہیں۔اس موقعے کے لیے شہر کی گلیاں اور بازار سجائے جاتے ہیں اور لوگوں کے چہروں پر خوشی اور شادمانی نظر آتی ہے۔

نوروز قدیم الایام سے ایران کے دو بڑے تہواروں میں سے ایک ہے جبکہ دوسرا 16 مہر (8 اکتوبر) کو منایا جاتا تھا جسے جشن ''مہرگان'' کہا جاتا تھا۔آج کل مہرگان نام کا جشن زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔نوروز ''پیشدادی'' سلسلے کے چوتھے بادشاہ "جمشید" کے دور میں ظہور پذیر ہوا اور اسی کے دور میں ایک قومی رسم کی صورت اختیار کر گیا۔مسعودی نے اپنی کتاب ''التنبیہ والاشراف'' میں لکھا ہے؛ (ہرمز فروردینکیپہلیتاریخ (21 مارچ) کودعوتعامدیکرلوگوں کیشکایاتسنتا اور ان کے مسائل حل کرتا تھا اور اس روز کو اس نے نوروز کا نام دیا اور نوروز ایک روایت میں تبدیل ہو گیا)۔

حکیمابوالقاسمفردوسینوروزکیظہورپذیرہونیکیداستانقلکرتیہوئیلکھتیہیں؛ ''جمشید مملکتکیامورسیآسودہخاطرہوا ''تختکیانی'' پررونقافروزہوا اور

ملکی حکام اور لشکری امراء اس کے تخت کے گرد اکٹھے ہوئے... جمشید نے اس روز کو جوفروردین کا پہلا دن تھا نوروز قرار دیا اور جشن منایا''۔

به جمشید گوهر افشاندند　　　مر آن روز را روز نو خواندند
چنین روز فرخ از آن روزگار　　　بمانده از آن خسروان یادگار

لوگوں نے جمشید پر گوہر افشانی کی اور اس روز کو نوروز کا نام دیا۔ یہ مبارک دن اسی دور سے بادشاہوں کی یادگار کے طور پر باقی ہے۔ پرانے وقتوں کے فارس میں جشن نوروز کا آغاز توپ داغ کر کیا جاتا تھا اور ریاست کا سربراہ قوم سے خطاب کیا کرتا تھا۔ ایران اور اکثر ایکو رکن ممالک میں یہ رواج اب بھی قائم ہے. روایات ہیں کہ نوروز ہی کے دن کائنات میں پہلی مرتبہ سورج طلوع ہوا تھا اور طوفان حضرت نوح ختم ہوا۔ ایران میں قدیم زمانے سے نوروز کے تیرہویں دن کو یوم فطرت کا نام دیا گیا ہے اور ایرانی عوام ہر سال دو اپریل کو یوم فطرت مناتے چلے آرہے ہیں۔ اس روایت کے تحت ایرانی عوام اپنے گھر والوں اور بال بچوں کے ساتھ صبح سے شام تک سرسبز وشاداب وادیوں، پارکوں اور قدرتی مناظر کے درمیان رہتے ہیں۔ اس موقع پر ایران کے لوگ پارکوں، تفریحی مقامات اور قدرتی وادیوں میں اپنے اپنے بال بچوں اور گھر بار کے افراد کے ساتھ پکنک مناتےہیں۔ بچے اور نوجوان پارکوں اور باغات میں کھیلتے کودتے دکھائی دیتے ہیں جبکہ بڑے بوڑھے حضرات قالین اور دریاں بچھائے ماضی کے قصے ایک دوسرے سے بیان کر کے لطف اندوز ہور ہے ہوتے ہیں۔ اس موقع پر لوگ طرح طرح کے کھانے تیار کرتے ہیں اور پارکوں، باغات اور قدرتی وادیوں کے درمیان دسترخوان بچھا کر ان نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ایران میں نوروز کا تیرہواں دن نوروز کی تعطیلات کا آخری دن ہے۔ روایات کے مطابق پہلا دن موسم بہار کی علامت ہوتا ہے۔ دوسرا گرمی، تیسرا خزاں اور چوتھا سردی کے موسم کی نشاندہی کرتا ہے۔ نوروز کی تین دن کے لئے چھٹیاں ہوتی ہیں اور آذربائیجان میں یہ دن سب سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے۔

نوروز کی تہذیبی اور ثقافتی اہمیت: شمسی کیلنڈر کے پہلے دن کے طور پر تصور کئے جانے والے دن یعنی نوروز کو ایرانی قوم میں بلا تفریق مذہب وملت خوش وخرم طریقہ سے منایا جاتا ہے۔ نوروز ایسا تہوار ہے جو لوگوں کے درمیان قومی یکجہتی اور بھائی چارےکا پیغام دیتا ہے۔ موجودہ دور میں جتنی زیادہ ضرورت اخوت، بھائی چارے اور آپسی اتحاد کی ہے اتنی کسی دوسری شے کی نہیں ہے۔ نوروز نہ صرف ایک تاریخی بلکہ ثقافتی تہوار بھی ہے، جس کے ذریعہ بھائی چارے کوفروغ ملتا ہے۔ ملک ایران میں ہر شہری

بلاتفریق مذہب وملت نوروز کے جشن میں شامل ہوتا ہے۔کسی بھی ملک کی تقریبات اس کی تہذیب کا ائینہ ہوتی ہیں۔جشن نوروز ایرانی تہذیب کا مظہر ہے اور ایران میں خاص طور پر اس طرح کے تہواروں کو محفوظ کر کے رکھا گیا ہے تا کہ ایرانی فن وثقافت اور اس کی تہذیب قائم رہے اور اس کے بہانے لوگ ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں اور بھائی چارہ میں اضافہ ہوتا ہے۔امن واتحاد قائم رکھنے میں نوروز جیسے تہواروں کا بہت بڑا رول ہوتا ہے۔ یہ نوروز عید نوروز ہے، جو انسانیت کو عام کرنے کا پیام دیتا ہے۔نوروز کا تہوار دنیا بھر کی طرح ہندوستان میں بھی منایا جاتا ہے۔قدیم زمانے میں پارسیوں کی ہندوستان آمد کی وجہ سے یہ جشن وتہوار یہاں منایا جانے لگا۔ ہندوستان میں پارسیوں کے علاوہ نوروز وادی کشمیر میں بڑے جوش وولولے کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ہندوستان میں نوروز کومنانے کا طریقہ کچھ تغیرات کے ساتھ بالکل ایرانی ہے۔

نوروز جمشید کی تیاری کا آغاز گھروں کی صاف صفائی سے کیا جاتا ہے دھول کو ہٹا کر نئے رنگوں سے گھروں کو سجایا جاتا ہے پھر مختلف نیک نشانوں کے ساتھ، یعنی ستارے، تتلیوں، پرندے اور مچھلی کی مختلف چیزوں پر نقش ونگاری کی جاتی ہیں۔ نئے ملبوسات اور سجاوٹ کا اہتمام کیا جاتا ہے جو اس تہوار کی مخصوص نشانی ہیں۔نوروز جمشید کیدن، لوگ نئےملبوسات جیسے رنگین ٹوپیاں، رنگین کپڑے پہنتے ہیں۔ اس دن جواہرات اور دیگر نوادرات کا کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔دروازے اور کھڑکیوں کوگلاب اور جیسمین کی لڑیوں سے زیب وزینت بخشی جاتی ہے۔خوبصورت ڈیزائن بنانے کے لئے رنگین پاؤڈر اور پرکشش پینٹ استعمال کیا جاتا ہے جو گھروں کے دروازوں اور دہلیز پر استعمال ہوتا ہے، یہ پیچیدہ ڈیزائن وآرائش اس تہوار کے تقدس کو ظاہر کرتی ہے۔اس کے علاوہ، مچھلی اور پھولوں کی شکلیں زیادہ پسند کی جاتی ہیں۔ہندستانی زرتشتیوں میں نوروز کے دن مہمانوں کو گلاب پاشی اور رماتھے کے تلک کے ساتھ استقبال کیا جاتا ہے۔

اس دن ناشتے میں مختلف اقسام کے لذیذ کھانے مہمانوں کو پیش کیے جاتے ہے۔جن میں خاص کر سمندر سے لی گئی چیزیں، تیل میں تلی ہوئی نوڈلس اور خشک میوہ جات کے ٹکڑے شامل ہوتے ہیں۔جوان اور بوڑھے اس سے لطف اٹھاتے ہیں۔ناشتے کے بعد، عبادت خانہ میں جانے کا وقت ہوتا ہے۔اس دن پارسیان ہند ایک خصوصی دعا شکرانہ کرتے ہے۔دعا کے بعد مقدس آگ کو پیش کیے جاتے ہیں اور اس کی پرستش کی جاتی ہیں۔اس مذہبی تقریب کے اختتام پر، تمام پارسیا آپس میں نئے سال کی مبارکباد کا تبادلہ کرتے ہیں''نیا سال مبارک ہو''۔پھر وہ لوگ گھر لوٹتے ہیں اور

خاص کھانے کے لیے دستر خان تیار کیا جاتا ہے مختلف فارسی پکوان، جیسے سیلی بوٹی (مٹن اور آلو)، مرغی کے فار ماس، پترانیما چچی (پتے پر ابلی ہوئی مچھلی)، پیلیف اور سلیب کا گوشت، خرگوش اور ساسنی ماچھی، مصالحے کے لئے الائچی وغیرہ۔ تاہم، سب سے اہم ڈش جو نوروز جمشید کے جشن کا ایک لازمی حصہ بنتی ہے آؤ، پیلاف (گری دار میوے اور زعفران سے بھرے ہوئے چاول) اس کے علاوہ، سادہ چاول اور مونگ کی دال بھی ہونی چاہئے۔ ان میں سب سے اہم فالودہ ہے۔ یہ ایک میٹھا مشروب ہے یہ نوڈلز اور دودھ کے ساتھ تیار کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر کیسرول ایک اور پسندیدہ مٹھائی ہے۔ سارا دن دوستوں اور رشتہ داروں سے ملنے کے ساتھ نیک خواہشات کا تبادلہ ہوتا ہے۔

پارسی مذہب کے لوگ اپنے گھروں کو نوروز کی عام روایت کے طور پر استعمال کرتے ہیں جیسے ''بہار صاف'' یہ دن تہوار سے پہلے نہایت صاف ستھرا دکھائی دیتا ہے۔ گھر کے تمام حصوں کے افراد گھروں کو صاف کرتے ہیں، فرنیچر کو صاف کرتے ہیں اور قالین دھوتے ہیں۔ اس تقریب کا خیر مقدم کرنا نئے موسم بہار کو تازگی کے ساتھ انجام دیا جاتا ہے۔ پارسیوں کا یہ بھی ماننا ہے کہ ماضی میں فوت شدہ افراد خانہ کی روح بھی نوروز کی رات، اپنے رشتہ داروں کو دیکھنے گھر لوٹ آتی ہیں۔ ساتویں نمبر کو زرتشت کے افراد کے لئے ایک جادوئی اور قابل ذکر تعداد سمجھا جاتا ہے۔ ساتویں نمبر کی علامت زندگی کے عناصر، یعنی آگ، زمین، پانی، ہوا، پودوں، جانوروں اور انسانوں کیساتھ منسلک کرتے ہیں۔ جمشید روایتی دسترخوان نوروز میں حرف س' کے ساتھ شروع ہونے والے سات خاص مواقع شامل ہیں، جیسے ہفتسن کے نام سے جانا جاتا ہے، جو نمائندگی کرتا ہے زندگی، صحت، دولت، کثرت، محبت، صبر اور پاکیزگی کی۔

کشمیری پنڈتوں میں جشن نوروز کا رواج: کشمیری پنڈت موسم بہار کے مختلف گوشوں میں نوروز مناتے ہیں وہ تاریخ، جو عام طور پر مارچ کے وسط اور اپریل کے وسط کے درمیان میں ہندو قمری تقویم کے حساب سے آتی ہے۔ کشمیری پنڈتوں کے ذریعہ بہار یکسینوکس ڈے (ایرانی نوروز کے ساتھ مل کر) یہ اسی طرح منایا جاتا ہے جس طرح قمری نوروز منایا جاتا ہے اور سانٹ کے نام پر واپس چلا جاتا ہے۔ تل بہارون کشمیری پنڈتوں کی ایک بہت اہم نوروز روایت ہے۔ ہفتسن ایرانی کی مانند چیزوں کو سجایا جاتا ہے۔ کسی ٹرے یا ڈش پر رکھی گئی اشیاء میں عام طور پر گندم یا چاول شامل ہوتے ہیں، دودھ اور اناج، پھل، اخروٹ، گلاب، سکے، قلم، سیاہی، ایک آئینہ (اندر سے بنا ہوا میٹھا کھیر) واقفیت، سوچ اور دیانت کی پاکیزگی)، مٹی کا چراغ یا روشن دیا (ستیہ پرا کا کینمائندگی،

روشنیچ)۔اس کے علاوہ، نئے کپڑے پہنے جاتے ہیں اور تحائف کا تبادلہ ہوتا ہے۔کچھ بالغ، خاص طور پر خواتین اس دن روزہ رکھتے ہیں۔

کشمیر کے مسلم عوام میں جشن نوروز کا رواج: نوروز کا پیغام سماجی میل جول، اتحاد، معاشرتی انصاف، خوش بختی اور انسانیت کی خوشحالی ہیکشمیر میں ایران کا اثر ورسوخ اتنا مضبوط تھا کہ کسی زمانے میں کشمیر ایران صغیر کے نام سے جانا جاتا تھا۔اگرچہ ایران اور کشمیر کے مابین تعامل اسلام سے پہلے کے زمانے سے ہے، لیکن ایران کی عظیم روایت کا آغاز ہی اس وقت سے ہوا ہے۔حضرت میر سید علی ہمدانی، کشمیر میں بانی اسلام تھے، جس کا ہر ایک پر گہرا اثر پڑا ہیزندگی کا دائرہ یہاں پر رکھا ہوا ہے۔کشمیرایرانیوں کے لئے پسندیدہ منزل بنی ہوئی ہے۔ایران سے نہ صرف مذہب بلکہ فن وصنعت بھیدستکاری، کھانا پکانے، ادب اور میلے بھی شامل ہیں۔کتابوں میں ایران کے اثر ورسوخ کے زوال کے وقت کی خرابیتاریخ کشمیر، جس کا سراغ ملتا ہے، آج صرف عظیم الشان اولیاء کے مقبرے میں مل سکتا ہے۔نوروز شاید ایرانی ثقافت کی جڑیں والا واحد تہوار ہے جواب بھی کشمیر میں باقی ہے۔ایران میں سال، کشمیر کی طرح چار موسموں پر مشتمل ہے۔ہر موسم میں، مختلف تقریبات ہوتی ہیں لیپ سال سے قطع نظراس کیکوئی مقررہ حیثیت نہیں ہوتی ہے، یہ سال بہ سال مختلف ہوتی ہے۔ان میں سے ایک، یہ فروردین (21 مارچ) یا نوروز کا پہلا تھا۔نوروز کے جشن منانے کے بہت سے واقعات کی امید کی ہیں ایک بہتر کل اور نئے سال کے لئے بلند امنگوں کا اظہار۔ بنیادی مقصد لوگوں پر ایک دوسرے کو دیکھنے کے لئے ہیاور نیک تمناؤں کا تبادلہ کرنا۔نوروز دو قدیم تصورات کی ایک علامتی نمائندگی ہے۔ایک اختتام اور دوسرا پنر جنم۔ایرانیوں کا ماننا ہے کہ ہر ایک کام جو ایک شخص نوروز پر کرتا ہے اس کا اثر باقی سال تک پڑتا ہے۔لہذا، اگر نوروز کا کوئی فرد رشتہ داروں، دوستوں اور پڑوسیوں کے ساتھ نرمی اور مہربانی کرتا ہے، نیا سال اس کے لئے اچھا رہے گا۔ دوسری طرف، اگر لڑائی جھگڑے ہوئے تو یہ اچھا سال نہیں ہوگا۔نوروز ایک شاندار چھٹی ہے اور ایرانیوں کا ماننا ہے کہ اس خصوصی دن پر بہت سارے عظیم واقعات رونما ہوئے ہیں۔یہ وہ دن ہے جب دنیا کو پیدا کیا گیا تھا، اور خدا تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تھا اس دن زمین پر پہلی بار طلوع آفتاب ہوا۔نوروز موسم بہار کے مضامین کے ساتھ موافق ہیجب دن اور دن برابر ہوں۔خیال کیا جاتا ہے کہ رسم ورواج کا مشاہدہ کرکیاس خصوصی دن پر، وہ قدرتی آفات سے محفوظ رہیں گے۔ایرانی تاریخ کہتی ہے کہ جمشید کے دور میں، ایران کے مشہور بادشاہ، ایک طوفان کا حملہ تین سال تک رہا یہ زمین پر ہوا۔موسم بہار

کے آغاز میں، بگولہ آہستہ آہستہ ختم ہو گیا۔لوگوں نے بڑا جشن کہا''نوروز'' تباہ کن طوفان کے بعد اور ایک طویل موسم سرما کے اختتام پر، غاروں اور پناہ گاہوں سے لوگ موسم بہار منانے باہر آئے تھے۔ نوروز غیر ملکی تسلط کے سماجی اور سیاسی اثرات کی ثقافتی مزاحمت کی علامت ہے اور ہمیشہ کی جاتی ہے۔غیر ملکی یلغار کے خلاف اپنی شناخت کے تحفظ کے لئے ایرانیوں کے لئے امن اور خوشحالی کا ایک ابدی پیغام مدد کرتا ہے۔اب کئی ہزار سالوں کے بعد، ایرانی اور متعدد دوسرے ممالک کے لوگ نوروز کو بے تابی سے منا رہے ہیں عمر، زبان، صنف، نسل، قومیت، قومیت یا معاشرتی حیثیت سے قطع نظر اور بغیر کسی حدود کیمنا یا جاتا ہے۔نوروز کا پر امید پیغام، سماجی میل جول، یکجہتی، اتحاد، معاشرتی انصاف، خوشی اور امن وخوشحالیہ انسانیت کے لئے ہے۔

نتیجہ گیری: ہندوستان اور ایران میں قدیم زمانے سے ہی مضبوط روابط رہے ہیں۔جن کی بدولت ایرانی ثقافت وتہذیب کے اثرات ہندوستان میں رونما ہوئے۔ ہندستانی ہر شبعہ ھای زندگی پر ایرانی اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔اس سے بڑھ کر کیا اثر ہوگا کہ ایرانی زبان ہندوستان میں تقریباً چار سو سال رسمی و درباری زبان رہی۔نوروز کی تاریخ بھی ہندوستان میں اُتنی ہی قدیم ہے جتنے ان دونوں ممالک کے روابط قدیم ہیں۔مغلوں کے پُر آشوب دور میں جشن نوروز کو شاہی طور پر منایا جاتا تھا اور یہ روایت مغلوں کے جانے کے بعد بھی جاری رہی۔دور حاضر میں بھی نوروز کو بلکل ایک جشن کی طرح منایا جاتا ہے۔جس میں ایرانی تہذیب وثقافت کے باضابطہ اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔

مآخذات:1۔عمر خیام، نوروز نامہ، رسالہ در منشاو تاریخ و اداب جشن نوروز ، بکوشش مجتبی مینوی، کتابخانہ کاوہ، تہران، ایران۔ 2۔ابوالحسن علی بن الحسن بن علی مسعودی، التنبیہ والاشراف، مترجم مولانا عبداللہ العمادی، قرطاس، کراچی۔3۔ابوالقاسم حسن بن علی طوسی المعروف بہ فردوسی، شاہنامہ فردوسی، نول کشور پرس، لکھنو۔4۔مریم وزیری، نوروز در ھند ارشیو نظریات، ۱۳۹۰ھ۔

۵۔ھاشم رضوی، جشن ھای گہنبار و فروردوگ۔ 6۔موبد اردشیر ادرگشپ، مراسم مذھبی و آداب زرتشتان۔7۔سید مظہر عباسی، نوروز کا تاریخی پس منظر۔

۸۔دیدھمری، محمد اعظم، واقعات کشمیر، تصحیح از پُروفسر شمس الدین احمد، علی محمد اینڈ سنز، سرینگر کشمیر۔

۹۔فوق، محمد الدین، تاریخ اقوام کشمیر، گلشن پبلیشرز، مدینہ چوک سرینگر، ۱۹۹۶۔

۱۰۔عبدالمعین انصاری، اوستا زرتشت مذھب کی الہامی کتاب، مندیکل ڈاٹ کام۔

☆☆☆

Asad Mohd.Khan ke Afsano ka jaeza by Dr. Safiya Sultan(Bhopal)

cell-9111500489

ڈاکٹر صفیہ سلطان (بھوپال)

اسد محمد خاں کے افسانوں کا جائزہ

اردو شعروادب کی عصری تاریخ میں وہ شخصیات جنھوں نے عالمی سطح پر اپنی ایک شناخت قائم کی ان میں اسد محمد خاں کا نام اہم بھی ہے اور معتبر بھی۔ اسد محمد خاں کی پیدائش سرزمین بھوپال کے اُس خانوادہ میں ہوئی جو صاحب سیف بھی تھے اور صاحبِ علم بھی۔ اسد محمد خاں کی پرورش انتہائی ناز و نعم سے ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مزاج میں ایک خصوصی تہذیب رچی بسی ہے۔ 1947ء میں ہمیں جہاں آزادی ملی وہیں ملک کی تقسیم کا درد بھی جھیلنا پڑا۔ اس المناک حادثہ کا اثر سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور ہنر پیشہ خاندانوں پر پڑا، جو اس بٹوارہ کی زد میں آ گئے۔ اس بکھراؤ کا شکار اسد محمد خاں بھی ہوئے مگر کھوئے نہیں۔ وہ علم کی تلاش اور خود اپنی شناخت بنانے کی طرف سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ گھر سے نکل کر انھوں نے زندگی کے عجب روپ دیکھے اور جن راستوں سے گزرے اس کو انھوں نے اپنے فن کے اظہار کے لیے وقف کر دیا۔

اسد محمد خاں ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''کھڑکی بھر آسمان''، ہے، جو 1982ء میں زیورطبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔ اس مجموعہ میں 44 نظمیں اور 14 کہانیاں شامل ہیں۔ دوسرا مجموعہ ''برج خموشاں'' 1990ء میں 14 نمائندہ کہانیوں کے ساتھ شائع کیا گیا۔ تیسرا مجموعہ ''غصے کی نئی فصل'' 1997ء میں آیا۔ چوتھا ''نربدا اور دوسری کہانیاں'' اس مجموعہ میں اسد محمد خاں کی کل 12 کہانیاں شامل کی ہیں لیکن یہ کہانیاں نہ صرف موضوع کے اعتبار سے کافی اپیلنگ ہیں بلکہ فن اور تکنیک کے لحاظ سے بھی کافی اہم ہیں۔

اسد محمد خاں کا پانچواں مجموعہ ''ٹکڑوں میں کہی گئی کہانیاں'' ہیں، یہ مجموعہ 2006ء میں شائع ہوا اور یہ مجموعہ سات حصوں پر مشتمل ہے، ہر حصّہ اپنے آپ میں منفرد ہے۔ اسد محمد خاں کی کہانیوں میں سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر کہانی ابتداء سے ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور وہ یکے بعد دیگرے کہانیاں پڑھتا چلا جاتا ہے۔ کہتے ہیں ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ اس

کا اطلاق اسد محمد خاں پر بھی ہوتا ہے۔ اسد محمد خاں کے علمی، ادبی سفر کا آغاز 1960ء میں شاعری سے ہوا۔ بنگلور کے ایک سہ ماہی رسالہ ''سوغات'' میں ان کی اوّلین کاوش منظرِ عام پر آئی۔ ان میں ایک گیت اور ایک نظم ''نومنزلہ بلڈنگ'' شامل ہوئی۔ بتاتے چلیں کہ سہ ماہی ''سوغات'' اپنے وقت کا بہت معیاری رسالہ تھا اور اس میں شائع ہونے والے شاعر اور ادیب ارسال پر فخر محسوس کرتے تھے۔ بہر حال گیت اور نظموں سے شروع ہونے والا یہ فکری تسلسل ٹی وی ڈرامے، خاکے اور کمرشیل رائٹنگ سے ہوتا ہوا افسانے تک آتا ہے۔ سب سے پہلا افسانہ ''باسودہ کی مریم'' تحریر کیا جاتا ہے جو ان کی ادبی شخصیت کا شاہکار افسانہ ہے۔

یہ افسانہ اسد محمد خاں کے دو افسانوی مجموعوں میں شامل کیا گیا ہے۔ ('برج خموشاں' اور 'کھڑکی بھر آسمان')۔ میں سمجھتی ہوں اسد محمد خاں 'باسودہ کی مریم' کے علاوہ کوئی دوسرا افسانہ نہ بھی لکھتے تو بھی یہ افسانہ انھیں اردو ادب میں زندہ رکھنے کے لیے کافی تھا۔ اس افسانہ میں مریم ایک مرکزی کردار ہے، جو گنج باسودہ سے تعلق رکھتی ہے۔ باسودہ بھوپال کے اطراف کا ایک قصبہ ہے۔ لہٰذا مریم نے تمام عمر خان صاحب کی ڈیوڑھی پر گزار دی اور ڈیوڑھی کے بچوں کو اپنی اولاد سے بڑھ کر چاہتی رہی، جس کا اکلوتا بیٹا باسودہ میں کینسر کے موذی مرض میں لمحہ لمحہ مرتا رہا اور وہ پیسہ پیسہ جوڑ کر مکہ مدینہ جانے کا خواب دیکھتی رہی۔ اسد محمد خاں نے اس کہانی میں درد و غم کے جن جن رنگوں کو پوری شدت سے برتا ہے، اس نے منظر میں جان ڈال دی ہے، بے ساختہ ڈائیلاگ میں ایک روانی اور تسلسل پڑھنے والے کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

''مریم کے خیال میں ساری دنیا میں بس تین ہی شہر تھے۔ مکہ، مدینہ اور گنج باسودہ''۔

لیکن وہ اپنی دانست میں مکہ مدینہ کو بھی ایک ہی شہر سمجھتی ہے جو اس کے حضورؐ کا شہر ہے۔ اس کے ممدو کا مرض بھی بڑھتا رہا اور مریم کے پاس جوڑی گئی تھوڑی سی رقم تھی وہ بھی بچے کے علاج پر خرچ ہوگئی اور بچہ بھی نہیں بچا تو اس کو دوہرا غم سمیٹنا پڑا۔ ایک تو یہ کہ سرکار کے روضہ پر حاضری نہیں دے پائی اور سارا پیسہ لڑکے کے علاج میں خرچ ہوگیا اور لڑکا بھی نہیں بچا۔

''مگر مریم چپ نہ ہوئیں، دو دن تک روتی رہیں اور ممدو کو کوستی پیٹتی رہیں''۔

یہاں مریم کی خودداری کی مثال دیکھنے کو ملتی ہے کہ:

''لوگوں نے سمجھایا کہ آخری دولہے میاں بھی تمہارا ہی بیٹا ہے، وہ اگر تمہیں حج کرواتا ہے تو ٹھیک ہے، مان کیوں نہیں جاتیں؟ مگر مریم تو بس احسان کرنا جانتی تھیں، کسی بیٹے کا بھی احسان اپنے سر کیوں

لیتیں۔انھوں نے تو اپنی کمائی کے پیسوں سے حج کرنے کی ٹھانی تھی'' ۔

اسد محمد خاں کی یہ کہانی جذبات اور احساسات کا ایک سیلاب پناہ ہے جس کو پڑھنے والا خود جل تھل ہو جاتا ہے۔ اسی زمانہ میں اسد محمد خاں کی دوسری کہانی ''مئی دادا'' منظر عام پر آئی تھی۔ یہ کہانی بھی ایک خانگی ملازم کی روداد ہے، جس نے تمام عمر اپنی وفاداریوں کو مالکوں کی چوکھٹ پر لٹا دیا، اس افسانہ میں اسد محمد خاں کے والد کے ساتھ ساتھ والدہ کا ذکر بھی، ان کی ذہنی وفکری آبیاری کے حوالہ سے موجود ہے۔ والدہ کا تعلق ایک باثروت خاندان سے تھا اور اپنی غیر مبہم اور حوصلہ مندی کے سبب ان کا ذکر افسانہ نگار کی کئی تحریروں میں ملتا ہے۔ مثلاً ''مئی دادا'' میں والدکا یہ تعارف دلچسپی سے خالی نہیں۔

''اماں تانگے میں بیٹھ کر ترنت اپنے بھیا کے یہاں پہنچیں اور میز پر سروتا مار مار کر بھائی کو حکم دے دیا کہ ابھی اسی وقت مئی دادا کو گھر آجانا چاہیے۔

میاں......آج ہمارے پشتینی اہلکار کو۔ ایک بوڑھے کو بند کر دیا ہے تم نے، تو کل ہمارے بچوں کو باندھ لے جاؤ گے۔ پرکھوں نے کیا اسی لیے اپنی تلواروں سے جنگل کاٹ کاٹ کے یہ ریاست بسائی تھی۔

اس روز میری اماں کا جلال دیدنی تھا۔ بولتی ہی چلی گئیں۔

غالبؔ کے شاگرد نواب یار محمد خاں شوکتؔ کی پوتی تھیں۔ ایک جید نواب زادے کی فکر مندی، ایک توانا شاعر کی طاقت لسانی اپنے جوہر دکھا رہی تھی''۔

ان دونوں افسانوں میں غور کیا جائے تو یہ دیکھنے کو ملتا ہے تو مریم ''میواتن'' تھی اور مئی دادا ذات کے ہندو تیلی، لیکن دونوں کرداروں نے افسانہ نگار اور ان کے خاندان کے دیگر افراد کو اپنے خلوص، محبت، وفاداری اور اخلاقی رویوں کے سبب کچھ اس طرح سے متاثر کیا کہ وہ ان کرداروں کو خاندان سے جدا نہیں سمجھتے تھے۔ تاہم افسانہ نگار کے ہاں مریم اور مئی دادا ایسے کردار عزت اور احترام کا مرکز بن جاتے ہیں۔ اسد محمد خاں کی ایک اور کہانی ''رگھو پا اور تاریخ فرشتہ'' ہے۔ تاریخ اور سیاست کے پس منظر میں ایک انتہائی متاثر کن کہانی قاری کو حد درجہ چونکا دیتی ہیں۔ تاریخ فرشتہ سے منسلک کہانی ہندوستانی تاریخ کے ایک المیاتی دور کی ترجمانی کرتی ہے۔

اسد محمد خاں کے خاندان اور حصارِ ذات کے حوالہ سے چند اور کہانیاں جو قاری کو اپنے لہجہ سے متاثر کرتی ہیں، ان میں ''طوفان کے مرکز میں''، ''غصے کی نئی فصل''، ''اپنے لوگوں سے سنی ایک شگفتہ کہانی'' اور ''ایک ٹکڑا دھوپ کا''، ''تیسرے پہر کی کہانیاں'' قابل ذکر ہیں۔ ذاتی تعارف کے

حوالہ سے جو کہانی قاری کو شدید طور پر متاثر کرتی ہے اور جو فکر و خیال کا ایک منفرد اور جدا ماحول پیش کرتی ہے اور جسے پڑھتے ہوئے افسانہ نگار کو بار بار داد دینا پڑتی ہے وہ ان کی کہانی ''طوفان کے مرکز میں'' ہے۔ یہ کہانی ماضی کے اُن دلچسپ اور ناقابل فراموش واقعات سے متصل ہے جو افسانہ نگار کے نزدیک ''طوفان کے مرکز میں'' موجود ہے۔

مجموعی طور پر اسد محمد خاں میں فکری اجزاء میں انسان دوستی، وقت کی جبریت، ملکی اور بین الاقوامی سیاست کے تاجرانہ رویے اور پھر انسان کی ادنیٰ اخلاقی حیثیت کے حوالہ سے ہونے والی مذکورہ گفتگو، افسانہ نگار کی کہانیوں کے فکری اجزاء کا کسی قدر احاطہ کرتی ہے۔ یہ وہ مشترک اوصاف ہیں جو ان کی کہانیوں میں جزوی اور کلی طور پر پھیلے ہوئے ہیں۔ افسانہ کا فکری ماحصل افسانہ نگار کی متعدد اور کہانیوں میں بھی بکھرا ہوا ہے مثلاً ان کی کہانی ''ترلوچن'' کا بنیادی موضوع بھی اس کہانی سے جڑا ہوا ہے۔ افسانہ نگار زندگی کے بے ربط تلخیوں اور سمجھ میں نہ آنے والی کئی ایک تکلیف دہ وارداتوں سے دکھی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ زندگی اپنے لیے اور دوسروں کے لیے خوشگوار، قابل برداشت اور ایک نبھاؤ کے ساتھ گزرے۔

اسد محمد خاں کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں۔ وہ ایک شاعر، انشاء پرداز کے ساتھ بہترین افسانہ نگار، مترجم، ٹی وی سیریل اور فلم رائٹر کے ساتھ صحافی بھی ہیں۔ ان کے لکھے ناٹکوں کے اسٹیج شوز ہندوستان کی بڑی درسگاہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ڈرامہ کلب کے ذریعہ پیش کیے جا چکے ہیں۔ اسد محمد خاں نے یوں تو ایک درجن سے زائد ناٹک لکھے ہیں لیکن ان کے چار ناٹک عوام میں بہت مقبول ہوئے ہیں۔ ان ناٹکوں میں ''خوشبو''، ''دستک'' اور ''رنگ حنا'' کے نام قابل ذکر ہیں۔ اسد محمد خاں کا ناٹک ''چوکیدار'' 1983ء میں لکھا گیا اور دو سال بعد یہ زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔ اس ناٹک کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی دوسرے ناٹک کو حاصل نہ ہو سکی۔

☆☆☆

Urdu Rubayi ki Tareef aur Ghazal,Qasida,Masnavi aur Marsiya mein Ahem Sinf Kaun:Ek jaeza by Surya Prakash Rao(Asst. Prof.Dept.of Urdu,Bareilly College,Bareilly)cell-6392140207

سوریہ پرکاش راوء(اسسٹنٹ پروفیسر،شعبہءاردو بریلی کالج بریلی)

اردو رباعی کی تعریف اورغزل،قصیدہ،مثنوی،اورمرثیہ میں اہم صنف کون

(ایک جائزہ)

ہر ادب اپنے آپ میں منفرد ہوتا ہے یا اپنا مقام الگ رکھتا ہے۔وہ انگریزی ادب ہو ،ہندی ادب ہو،یا پھر اردو ادب ہو۔ادب کی تعمیر اس کے مختلف اصناف سے ہوتی ہے۔جو حقیقت کے اظہار پر مبنی ہوتی ہے۔فنکار اور ادیب اپنی صلاحیت سے کام لے کر نیئے ادب کی تخلیق کرتے ہیں۔مثلا شاعری اور نثر۔شاعری اور نثر کی بنا پر ہی اردو ادب کی بنیاد قائم ہے۔اردو شاعری کی بھی مختلف قسمیں ہیں جیسے قصیدہ،غزل،مثنوی،مرثیہ،قطعہ،رباعی،ترکیب بند،ترجیع بند،شہر آشوب، واسوخت وغیرہ وغیرہ۔نثر کی بھی مختلف قسمیں ہیں مثلاً فکشن اور تنقید۔

اردو ادب یا شاعری کا نام ہماری زبان پر آتے ہی خاص کر غزل کا لفظ جب ہمارے زبان پر آتا ہے۔یا اس لفظ کا ذکر جب ہم کسی دوسرے افراد کی گفتگو میں سنتے ہیں تو فوراً ہمارے ذہن میں کسی حسین وجمیل ماہ رو،نازک بدن،آفریں صورت یعنی خوب رو کی تصویر بن جاتی ہے۔اور ہمارے خیال میں اس کا ایک حسین پیکر تیار ہو جاتا ہے۔اور ہم اپنے آپ کو چند لمحوں کے لیے ان حسین خیالوں میں مست ومخمور پاتے ہیں۔جیسا کہ غزل کی تعریف ہے۔غزل کے معنی محبوب سے حسن وعشق کی،راز و نیاز،شوخی وشرارت بھری باتیں کرنا ہے۔مولانا الطاف حسین حالی نے ”مقدمہء شعروشاعری“ میں لکھا ہے کہ:

”بعض خیالات جو دو مصرعوں میں بالکل یا زیادہ خوبی کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتے،ان کو قطعہ یا رباعی کے لباس میں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔“ (صفہ نمبر ۱۲۹)

مگر ایسا نہیں ہے کہ جو بات دو مصرعوں میں نہ کہی جا سکے اس کو رباعی اور قطعہ میں ہی کہی جا سکتی ہے۔وہ ہر شاعر کا اپنا قوت صلاحیت ہے کہ وہ اس خیال کو رباعی میں بیان کرنا چاہتا ہے یا قطعہ میں۔یا کسی بھی صنف شاعری میں۔غزل،قصیدہ،مثنوی،مرثیہ وغیرہ فارسی ادب کے راد ستے سے

اردو ادب میں داخل ہوئے ہیں۔اسی طرح رباعی بھی فارسی ادب کے راستے سے اردو ادب میں دا خل ہوئی ہے۔غزل کو اردو ادب میں وہ مقام اور مقبولیت حاصل ہوا جو کسی دوسرے صنف شاعری کو نصیب نہ ہوسکی۔رباعی کو بھی نہیں۔رباعی کا عروج ایران میں ہوا اور وہاں کے فارسی رباعی گو شعراء نے مثلاً بابا طاہر، سرمد، اور عمر خیام وغیرہ نے اس صنف شاعری میں طبع آزمائی کی۔اور رباعی کو ایک بلند مقام عطا کیا۔رفتہ رفتہ رباعی جب اردو ادب، کی طرف رجوع کرنے لگی ہے تو یہاں کے شعراء نے بھی اس صنف کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔جن میں فراق گورکھپوری، جوش، آتش، دبیر، حالی، اقبال وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

کلاسیکی شاعری میں غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ کی طرح رباعی بھی اردو ادب میں اپنی منفرد مقام رکھتی ہے۔رباعی عربی زبان کا لفظ ہے۔رباعی عربی زبان کے لفظ''ربع''سے نکلا ہے۔جس کے معنی چار کے ہیں،یعنی رباعی میں چار مصرعے ہوتے ہیں۔اس لیے چار مصرعوں والی نظم کو رباعی کہتے ہیں۔رباعی کو ترانہ، چومصرعہ، چوبولا، چہار بیتی، دوبیتی، چہار مصراعی دیگر ناموں سے بھی جانا جاتا ہے۔

رباعی ایک مختصر نظم ہے۔رباعی کے لیے ایک خاص وزن درکار ہے۔وہ یہ ہے کہ شاعر کو ان چار مصرعوں میں ہی میں اپنی بات کہنی پڑتی ہے۔اوران چار مصرعوں میں پہلا، دوسرا، چوتھا مصرع ہم قافیہ وہم ردیف ہو۔مثال کے لیے فراق کی ایک رباعی دیکھیے:

ہر جلوہ سے اک درس نمو لیتا ہوں — چھلکے ہوے صد جام وسبو لیتا ہوں
اے جان بہار تجھ پہ پڑتی ہے جب آنکھ — سنگیت کی سرحدوں کو چھو لیتا ہوں

اس مختصر سی نظم میں شاعر کو یہ کمال حاصل ہوتا ہے کہ وہ جس بھی مضمون کو رباعی میں پیش کرتا ہے۔وہ پوری طرح واضع ہو جائیں۔اور رباعی کا چوتھا مصرع اس کی جان ہوتی ہے۔جس کو شاعر اس طرح سے بیان کرتا ہے کہ پورا مفہوم اس مصرعے میں سمٹ آتا ہے۔بلکہ یوں کہیں کہ پوری طرح سے اس کا مفہوم واضع ہو جاتا ہے۔رباعی میں چوبیس اوزان ہوتے ہیں۔رباعی میں قافیہ ورد یف کی پابندی لازمی ہے۔ہیتی طور پر دیکھا جائے تو رباعی کے تین مصرعے پہلا، دوسرا، اور چوتھا مصرعے میں قافیہ وردیف کا ہونا بہت ضروری ہے۔بقول فرمان فتح پوری:

''رباعی شاعرانہ اصطلاح میں اس صنف کا نام ہے جس میں چار مصرعوں میں ایک مکمل مضمون ادا کیا جاتا ہے۔رباعی کا وزن مخصوص ہے۔پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعے میں قافیہ لانا ضروری ہے۔

تیسرے میں اگر قافیہ لایا جائے تو کوئی عیب نہیں۔" (اردو شاعری کا فنی ارتقاء)

رباعی اور اس کے فن کو زیر بحث لائیں تو ہمیں علم ہوتا ہے کہ جس طرح سے غزل، قصیدہ، مثنوی، اور مرثیہ کا شاعر شعر کہنے سے قبل اپنے ذہن میں ایک پس منظر تیار کرتا ہے۔ یعنی ایک خاکہ بناتا ہے۔ اور اپنے ذہن میں ایک موضوع کو لے کر اس کو پیش کرتا ہے، یعنی قصیدے کا شاعر قصیدہ کہنے سے قبل ماحول سازی کرتا ہے پھر اصل موضوع پر آتا ہے۔ جس میں موسموں کا ذکر، عشقیاں خیال کا اظہار، اور فلسفیانہ گفتگو شامل ہیں وغیرہ۔ یا دنیا جہان کی باتیں کرتا ہے۔ پھر اپنے اصل موضوع پر آتا ہے۔ اسی طرح سے غزل کا شاعر غزل کہنے سے قبل غزل کے پابند اصول کو ذہن نشین کرتے ہوئے شاعری کرت ہے۔

قصیدے سے ہی غزل نکلی ہے۔ اور قصیدہ میں مطلع اور مقطع کا شعر ہوتا ہے۔ پر اس کا ہر شعر جداگانہ ہوتا ہے۔ اور اپنے معنی الگ دیتا ہے۔ بالکل غزل کی طرح۔ اسی طرح غزل میں جب غزل کا شاعر غزل کہتا ہے تو وہ سب سے پہلے اس بات پر غور کرتا ہے کہ غزل کا پہلا شعر مطلع ہوتا ہے جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں۔ اور غزل کا آخری شعر مقطع کہلاتا ہے جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے اور وہ اس اصول کا پابند نظر آتا ہے۔

اسی طرح مثنوی اور مرثیہ میں بھی اس کا ذکر ہوتا ہے فرق یہ ہے کہ مثنوی میں مثنوی کا شاعر ماحول شازری کرتے وقت اس کو نعت، منقبت سے شروع کرتا ہے۔ نہ کہ کسی عشقیہ شعر کے ساتھ۔ پھر اس کے بعد اپنا اصل قصہ بیان کرتا ہے۔ مثنوی کا فن یہ ہے کہ اس کے ہر مصرعے میں قوافی ہونا لازمی ہے۔ مثنوی جب سے لکھی جا رہی اس وقت سے اس کا اصل مضوع حسن و عشق ہی رہا ہے۔ پر شاعر مثنوی کے درمیان میں کچھ فلسفیانہ گفتگو بھی کر لیتا ہے۔ مگر رباعی بھی دیگر صنف شاعری کی طرح اردو ادب میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔

☆☆☆

Farsi zaban ke tazkeron mein rishiyat aur sufiyat ke anasir by
Dr.Wahid Ahmad Sheikh(HOD Persian,Degree college Sopore,J&K)
cell- 700608699
ڈاکٹر واحد احمد شیخ (رئیس شعبۂ فارسی، ڈگری کالج، سوپور)

فارسی زبان کے تذکروں میں ریشیت اور صوفیت کے عناصر

تعارف: کشمیر میں تصوف اور ریشیت ایک ہی سکے کے دو رُخ رہے ہیں اس بات میں کوئی تردد نہیں ہونا چاہے کہ یہ سرزمین ریشیت کا گھوارہ زمانہ قدیم سے رہا ہے۔ جب اسلام وادی کشمیر میں وارد ہوا تو سب سے پہلے صوفی بزرگ حضرت بلبل شاہ صاحبؒ سے منسوب ہیے جنہوں نے یہاں کے بدھ مذہب سے منسوب رتنچن شاہ کو مشرف بہ اسلام کیا اور اس کا نام سلطان صدرالدین رکھا۔ ا؎

ریشی لفظ کہنے کا مراد یہ ہے کہ جس بزرگ ہستی کے ساتھ یہ لفظ لگا ہوا ہو وہ اللہ کی نظروں میں محبوب اور عوام الناس کے دلوں میں جاگزین ہے اور کشمیر کے اس سلسلۂ عالیہ کے امام عالی مقام ہیں ہمارے مرشد پاک جناب حضرت شیخ نور الدین نورانی ؒ ہیں۔ آپؒ ایک مرد کامل، اَن تھک مجاہد، دلدادۂ توحید، عاشق رسول ﷺ اور کتاب وسنت کے عظیم ماہر و مبلغ کا نام نامی ہے۔ خوارق السالکین المعروف بہ تاریخ ہادی کے صفہ نمبر ۱۳۴ پر درج ہے کہ

”آفتاب روی زمین شیخ نورالدین کشمیریؒ ازین دیار سر برآوردہ وچوں از ازل پاک بودہ در ریاضت شاقہ مشغول بود۔ بزرگانِ متقدمین مثل حضرت شیخ فریدالدین شکر گنجؒ وحضرت شیخ بہاء الدین زکری ملتانیؒ از راہ باطن در ترتیب ایشان سعی بلیغ کرد بمرتبۂ توحید وعرفان رسید چون عارف معارف ربانی حضرت میر سید محمد ھمدانیؒ دریں دیار لطیف تشریف شریف ارزانی فرمودہ“ ۲؎

ریشی طریقے کو خلاص من، پلاس من، پاس من (ریشیوں) کے بعد فرسودہ ہو چکا تھا۔ شیخ نورالدین ؒ نے تجدید وتزمین کے ساتھ آراستہ وپیراستہ کر کے قائم کر دیا اور نفس کو قتل کرنے اور بدن عنصری کو توڑ دینے کی طرف اپنی ہمت کا رُخ پھیر دیا اور قول وفعل میں سنت نبوی ﷺ کی متابعت کا علم لہرایا۔ ۳؎

ریشیان روی زمین کے تاج وخلایق کر رہبر حضرت شیخ نورالدین مٹن ٹیلے کی طرف سیر کو نکلے تھے اپنچ

(یعنی اسلام آباد) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ہمراہوں سے کہا: ''مجھے اس زمین سے خوشبو آرہی ہے اور بہت ہی خوش کن خوشبو ایک مرد صفا کیش کی جو اس جگہ سے ریشی کی صورت میں اُٹھے گے (یعنی انہوں نے بابا ہردی ریشی کے ضمن میں تذکرہ کیا ہے) ۴ ؎

بعدازآن ریشیت کے پرانے سانچوں سے نکل کر ایک نئی نہج پر کام شروع کیا گیا۔ریشیت رہبانیت سے نکل کر خدمت خلق تقویٰ، ورع، زہد و پرہیزگاری کی طرف متوجہ ہوئی۔کشمیر میں عام ریشی حضرات ریشی صوفیاء میں بدل گئے۔شہمیری دور میں میر سید علی ہمدانیؒ کی ملاقات جب شیخ نورالدین نورانیؒ سے ہوئی تو اس بات پر متعرض تھے کہ انہوں نے ہندوانہ رسوم کو فروغ دیا وہ اس بات پر آپ سے متفق ہوئے کہ انہوں نے لعاب دہن سے دیوار پر ''قل ھو اللہُ احد'' لکھ دیا۔فارسی تذکروں میں ریشیاء اور صوفیاء کا ذکر اغلب مقامات پر ملتا ہے۔شیخ نورالدین نورانیؒ علمدار کشمیر مادرزاد ولی تھے ظاہری طور پر انہوں نے کسی استاد یا کسی خاص مرشد سے ایک حرف بھی پڑھا نہیں تھا بلکہ انہوں نے حضرت اویسی قرنیؓ کو اپنا روحانی مرشد اور رہنما مان لیا تھا جو کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے باطنی یاروں میں ایک تھے اسی طریقے پر قائم ہو کر عبادات شاقہ انجام دیتے تھے یوں فرماتے ہیں ؎

اُمیدوار مچھوس ہتہٕ وو برنس پتہٕ اویس قرنیؓ چھوم رہنمای ۵ ؎

اسی موضوع کے ضمن میں شیخ نورالدین نورانیؒ مزید یوں فرماتے ہیں ؎

سوکھس مول چھُے چٔنن تہٕ کھینن بندر موول چھُے اوخنن ستی

ریشن موول چھُے وارین تہٕ وَنن ککہٕ وَن موول چھُے پتھ کنین ستی

Opulence wilt seek thee viands delicious & drinks soft

Scholars appetitic wilt be in passion love for kip

Pleasance and woods art graceful gait for Rishis.

While partridge do enjoy a lot in assimilation of pabble & stone -(6)

کلیدی کلمات: صوفیت، زھد، ریشیت، پرہیزگاری، کشف وکرامات، تزکیہ نفس۔

مقالہ: کشمیر میں چک خاندان ۹۶۲ھ بمطابق ۱۵۵۴ء تا ۹۹۴ھ بمطابق ۱۵۸۵ء یعنی ۳۲ سال تک برسر اقتدار رہے ہے اس دوران چک خاندان کے آٹھ بادشاہوں نے عنان حکومت سنبھالی۔ ۷ ؎۔کشمیر میں چک دور کے عظیم شخصیت، مایۂ ناز، روحانی پیشوا اور عالم دین، پیر طریقت شیخ حمزہ مخدوم سلطان العارفینؒ کی فیوز وبرکات والی ذات تھی اور انہی کے حلقۂ ارادت سے کشمیر کے بڑے

بڑے علماء اور خلفاء مستفید ہو گئے جنہوں نے تبلیغ اسلام اور احکام دین کو بڑھایا۔ان میں سے اکثر وبیشتر قابل تحسین اور موجبِ فخر ہیں اور اپنی تالیف وتصنیفات سے خاص کر تذکرہ نویسی سے چک دور کے فارسی نثر کی آبیاری کی ۔ چونکہ اس دور کے تذکروں کی اہمیت وارزش اس لئے بھی اہم ہے کیونکہ ان میں اکثر تذکروں میں صوفی بزرگ حضرت شیخ حمزہ مخدومیؒ کے علاوہ اس زمانے کے متعدد ریشی حضرات کے حالات و واقعات، کشف وکرامات اور کمالات بطریق احسن درج ہیں۔اور زیادہ تر مصنفین کے چشم دید حالات و واقعات درج ہیں اس کے علاوہ ان تصانیف میں اس دور کے دیگر مشایخوں، عالموں، فاضلوں اور باکمال صوفی بزرگوں کے کشف وکرامات اور کمالات شامل ہیں۔ ۸۔زیر مقالہ میں چک دور کے اہم تذکروں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن میں شیخ یعقوب صرفیؒ کا تذکرہ ''روائح''، بابا داؤد خاکیؒ کا تذکرہ ''دستور السالکین'' درج ہیں اس کے علاوہ باقی تصانیف جو سراسر تصوف وعرفان کے لحاظ سے بہت اہمیت کے حامل ہیں جیسے ''تذکرۃ المرشد از خواجہ میرم بزاز، ''ہدایت المخلصین'' از بابا حیدر تیلہ مولی، ''تذکرۃ العارفین'' از بابا علی رینہ، ''چلچلۃ العارفین'' ازخواجہ اسحاق قاری، رسالہ سلطانیہ'' از شیخ احمد چاگلیؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۹۔

شیخ العالمؒ صائم الدھر اور قیام الیل پر ابتداء سے ہی قائم ودائم تھے۔عبادات شاقہ (محنت طلب) انجام دے کر وہ اولیاء کبار اور صالحین کاملین میں شامل ہو گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے عبادات شاقہ دنیای تصوف میں ضرب المثل بن گئی ہے ''من عرفہ نفسہ فقد عرف ربہ'' اور انہوں نے خود کو پہچان لیا تھا اور اسی پہچان میں ان کو اپنے رب کی بھی تحقیق ہوئی تھی پھر نورِ مطلق کو اپنے وجود میں جذب کر لیا تھا اور ہر شئے میں واجب الوجود کو موجود پایا تھا وہ نور الٰہی میں غرق ہو چکے تھے۔چنانچہ فرماتے ہیں ۔

لا الہٰ الا اللہ صحیح کُر موحی کرُ م پٹُن پاَ ن وجود تر آ وتِھ موجود سرُ م ہر موکھ وچھوم پٹُن پاَن

کلمہٴ محمدؐ تحقیق کرُ م سجود موجود میولم پاَن ۱۰۔

حضرت شیخ العالمؒ نے اپنی پوری زندگی خوف خدا میں بسر کی نفسی کشی، شب خیزی اور زہد وتقویٰ میں بے نظیر تھے ریشیوں، صوفیوں اور صالحوں میں ایک اعلیٰ مقام حاصل تھا اور خدا کے محبوب بندے اور سول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرغوب امتی تھے یہ ان کی عظمت وا لمیت کا یہ عالم تھا کہ یوں فرماتے ہیں ۔

دو ہس پُرم نفلہِ ہتھا رآتس رودس زا گئیِ

یُد وی تھآوم قبولیتھا ننہِ زَن ہُون اوسس آ گئے ۱۱۔

راقم نے چک دور کے اہم تذکروں میں تذکرۃ المرشد، تذکرۃ العارفین، چلچلۃ العارفین اور ہدایت المخلصین کے حوالے چند پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔

ا۔''تذکرۃ العارفین'' از بابا علی رینہ صوفیانہ نثر کا ایک بہترین مُرقع ہے اس تذکرہ کا آغاز شہمیری دور میں کیا گیا ہے اور چک دور میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس میں چک دور کے علاوہ شہمیری دور سے وابستہ عارفوں، عالموں، صوفیوں اور ریشیوں کے حالات و واقعات نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ مصنف نے اس تذکرے میں معاصرین صوفیاء کبارؒ کے سوا اپنے مُرشد بزرگوار شیخ حمزہ مخدومیؒ کے کشف و کرامات اور بعض اعلیٰ مقامات کا جن کے وہ عینی شاہد تھے کا تذکرہ کیا ہے۔ تذکرۂ موصوف تصوف و عرفان کے اسرار و رموز کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں مُبتدی سے لے کر ایک سالک و عارف کے قطب بن جائے کیلئے پوری رہبری اور رہنمائی کا سامان میّسر ہے یہ تذکرہ بارہ (۱۲) ابواب پر مشتمل ہے جن میں صوم وصلواۃ، عبادت و نوم، توبہ واستغفار، اقسام اصناف لیل ونہار، نوافل وختم، طالب معرفتِ وحدت، احوال و مقامات وکرامات اولیاء کشمیر، احوال و مقاماتِ عامہ و خاصۂ شیخ حمزہ مخدومیؒ، اذکار اور افکار و مراقبات، شامل ہیں۔ یعنی مذکورہ بالا عنوانات سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ مصنف نے اس مایۂ ناز تذکرے میں تصوف وسلوک کے اہم موضوعات کو زیر بحث لایا ہے جن کے ذریعے ایک سالک کیلئے طرح طرح کی عبادات و ریاضات کی تلقین کی گئی ہے۔ صوم وصلواۃ کی پابندی کے بیان میں لکھا ہے کہ ایک سالک کو نماز کی ادائیگی میں تغافل نہ برتے بلکہ اپنے وقت پر نماز کو ادا کرے، ساتھ ہی تہجد کی نماز بھی ادا کرتا رہے۔ رمضان کی روزں اور نفلی روزوں سے تقویٰ حاصل کرے، طلبِ جستجو اور معرفت کو حاصل کرے، مرشد کو تلاش کرے اور اُن کی رہبری میں ہی اسرار وحدت اور عرفان و معرفت سے بہرہ ور ہوسکتا ہے۔ ۱۲؎

اس تذکرہ کی اہمیت وافادیت میں مصنف نے باب ہفتم وہشتم میں کشمیری اور غیر کشمیری صوفیاء کرام، اولیاءِ عظام کے حالات و واقعات درج کئے ہیں۔ اس کے علاوہ کشمیر کے نامدار روحانی بزرگ علمدارِ کشمیر شیخ نور الدین ریشیؒ کے کمالات و مقامات کا اسقدر واضح تذکرہ کیا ہے کہ جس کو بیان کرنے کیلئے ایک الگ باب کی ضرورت ہے۔ اس کے بارے میں یوں تذکرہ کرتے ہیں ۔

''نقلست کہ حضرت شیخ المشائخ واولیاء حضرت شیخ نورالدین ریشیؒ دروقت خود یگانہ وقت در کشمیر بودند برجمیع طالبانِ این دیار درآن وقت مرشد ودستگیر بودند'' ۱۳؎

مصنف نے مذکورہ تذکرہ میں اولیاء کرام کے حالات و واقعات کرنے کے بعد شیخ ہردی

بابا ریشیؒ کے حالات وواقعات، کشف وکرامات قلمبند کئے ہیں۔ یوں فرماتے ہیں۔

''حضرت شیخ ہردی بابا ریشیؒ جو کہ مرید خاص خلفاء بااخلاص، مرشد الثقلین مخدوم شیخ حمزہؒ تھے۔ ان کے ممتاز عقیدت مندوں میں سے تھے۔ انہوں نے زیادہ تر اپنے مرشد کے کشف وکرامات، مقامات اور مراتبات تحریر کئے ہیں اوران کو خواجہ اویس قرنی ثانیؒ کے نام سے یاد کیا ہے'' ۱۴؎

اس کے علاوہ مخدوم صاحبؒ کے دیگر خلفاء خاص کا تذکرہ بھی ملتا ہے جن میں بابا داؤد خاکیؒ، شیخ احمد چاگلیؒ، باباحیدر تیلہ مولیؒ، اور بابا روپی ریشیؒ وغیرہ شامل ہیں۔

۲۔ تذکرۃ المرشد از خواجہ میرم بزاز بھی چک دور کا ہی ایک بہترین تذکرہ ہے اس میں خواجہ میرم بزاز نے اپنے مرشد حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ کے حالات وکمالات اور کشف وکرامات تفصیلاً درج کئے ہیں۔ اس کے علاوہ مصنف نے بڑے بڑے علماء وفضلاء صوفیاء اور ریشانِ کشمیر کے حالات و واقعات بھی قلمبند کئے ہیں اوران کے کمالات، بزرگی، عظمت اور برتری کا حال بھی درج کیا ہے۔ یہ تذکرہ ۹۹۷ھ میں تصنیف ہوا ہے ۱۵؎

خواجہ میرم بزاز نے مذکرہ تذکرے میں اپنے مرشدِ پاک کے رتبہ غوثیت وقطبیت اور محبوبیت کے درجوں تک پہنچنے کا مفصل خاکہ بیان کیا ہے اوراس میں خواجہ اسحاق قاریؒ، خواجہ حسن قاریؒ اور بابا ہردی ریشیؒ کے حالات وواقعات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اپنے مرشدِ پاک کے کمالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ خواجہ زین علی گنائی کشمیر کے دولتمند روساء، شیخ حمزہ مخدومیؒ کے مریدوں میں سے تھے۔ چنانچہ اسکے بیٹے نے بھی جو کہ ایک مہلک بیماری کا شکار ہوا تھا، حضرت مخدوم صاحبؒ کے ہاتھوں سے (اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے) شفاء پائی۔ ۱۶؎

۳۔ خواجہ اسحاق قاری نے 'چلچلۃ العارفین' کے نام سے ایک مشہور تذکرہ لکھا ہے جس میں انہوں نے دیگر خلفاء کی طرح تصوف وعرفان کے اسرار ورموز کے علاوہ اپنے مرشدِ پاک کے مراتب مقامات، کمالات اور کشف وکرامات کا تفصیلی جائزہ لیا۔ یہ تذکرہ سات ابواب پر مشتمل ہے جن میں ارادت خود جناب حضرت سلطان العارفینؒ، سلوک وطریقت، ریاضت وعبادت اور طاعت، طریق چہل چلیۂ وآداب آن، اخلاق، نفس ورضائی حق، عارفوں کی عبادات واطاعت، محوایات واستغراق رحمانی، مقامات وکرامات ومراتب شیخ حمزہ مخدومیؒ شامل ہیں۔ یہ تذکرہ ۹۸۲ھ میں تصنیف ہوا ہے ۱۷؎ خواجہ صاحبؒ نے اس تذکرے کا نام باب سیوم نے منسوب کر کے چلچلۃ العارفین رکھا ہے چل دراصل چہل (۴۰) یعنی عارفوں کے چالیس چلوں کے طور طریقے اور آداب وخلوت کے بیان میں

ہیں مگر حقیقت میں مصنف نے راہِ سلوک کے مختلف مقامات کی وضاحت کے ساتھ ساتھ تصوف وعرفان کے مسائل پر تفصیلاً روشنی ڈالی ہے۔اسکے علاوہ دیگر ریشوں،صوفیوں اودرویشوں کے حالات وکرامات زیرِتحریر لائے ہیں۔مصنف نے اس تذکرے میں شریعت اور طریقت کی وضاحت کرتے ہوئے راہِ سلوک کے ایک طالب کیلئے ہدایات اور پند ونصائح کا خلاصہ بھی پیش کیا ہے مثلاً یہ کہ جب سالک اپنے نفس کو دنیا کی تمام آلائشوں اور کدورتوں سے صاف وپاک رکھے اور اپنے سارے وجود کو ذاتِ باری تعالیٰ کی عبادت میں غرق کردے تو یہ حقیقت اُس کے سامنے آجاتی ہے کہ وہ جس ذاتِ حق کی تلاش میں ہیں۔اس ضمن میں یوں ارشاد فرمایا ؎

ای دوست بہر مکان می جُستم ہر دم خبرت زین وآن می جُستم

دیدم بہ تو خویش تو خود من بودی خجلت زدہ ام گرتو نشان می جُستم ۱۸؎

نفس پر قابو پانے کے ضمن میں یوں فرماتے ہیں کہ ایک سالک کو چاہے کہ نفس کے خلاف ہوکر اپنے اندر کے دل کو منور کردے یعنی خود کو نفسانی ،شہوانی اور شیطانی خصلتوں سے پاک کردے اور نفس لامہ اورنفس امارہ کو توڑ کر نفس مطمینہ حاصل کرے تاکہ اخلاق حمیدہ کو حاصل کرسکے۔یوں فرماتے ہیں ؎

ترا با نفس کافر کیس کاریست بدام آور کہ اوطرفہ شکاریست ۱۹؎

اس ضمن میں شیخ نورالدین نورانیؒ یوں فرماتے ہیں

نفسی کڈس اُٹی اُٹی نفسی کورس پشیمان

نفس چھُی مدہوس ہانکل ژٹی نفس یمہِ روٹ سوی ووت لامکان

Scandalized am i , through my bases self

Disgraced have been i , through my carnal appetities

Unconscious thy soul is allow not it to trample thy conscience.

Divinity attained he, who subdued it , by and by ۲۰؎

مصنف نے مرشد پاک کے کمالات اور کشف وکرامات کے علاوہ ہردی بابا ریشیؒ ،باب روپی ریشیؒ ،بابا حیدر تیلہ مولیؒ ،شیخ احمد چاگلیؒ اور بابا داوٗد خاکیؒ کے کشف وکرامات کا بھی ذکر کیا ہے۔چک دور کی ایک اہم تصنیف ’’ہدایت المخلصین‘‘ میں بابا حیدر تیلہ مولی نے صوفیوں ،درویشوں ،عالموں اور فاضلوں کے حالات وکشف وکرامات ضبط تحریر میں لائے ہیں علاوہ ازین اپنے مرشد کامل کے حالات ووقعات اور کشف وکرامات پر نہایت تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ہدایت

المخلصین کی عبارت کو جگہ جگہ قرآنی آیات و احادیث سے مزین کرنے کے علاوہ اس میں اپنے شاعرانہ ذوق کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔اس تذکرے میں پانچ ابواب موجود ہیں جن میں اعمال مُبتدی، اشغال مُبتدی، اذکار مُبتدی، مرشد پاک کی صحبت وشوق وصلاح وتقویٰ اور پند ونصائح، حالات وواقعات شیخ حمزہ مخدومیؒ موجود ہیں۔چونکہ اس تذکرے کا اصل موضوع تصوف وعرفان ہے علاوہ ازین اخلاقیات کا درس بھی ملتا ہے کبھی آپ عشق حقیقی میں موجزن نظر آتے ہیں اور کبھی مُرشد کی عظمت کا بیان کرتے ہیں۔مذکورہ تذکرے کے حوالے سے مصنف نے محبت وعشق حقیقی اور عاشق کے بارے میں تفصیلات پیش کئے ہیں اور اپنے بیان کی تائید میں جگہ جگہ قرآنی آیات واحادیث کے حوالہ جات دئے ہیں۔عشق حقیقی کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

درمحبت ساز کردن از جوان دیگراست　　　باخداھم ناز کردن ازمیان دیگراست

عابدم ھم زاھدم ھم عاشقم ھم عارضم　　　کاملم ھم اصلح اماچہ زآن دیگراست ۲۱ ؎

راہِ سلوک اور تصوف وعرفان کے اسرار ورموز اور نِکات مہمہ کے علاوہ اپنے پیر طریقت کے کشف وکرامات کے ذکر میں اور دیگر معاصرین درویشوں اور صوفیوں کے بارے تذکرہ کیا ہے اور تذکرہ کے آخر میں شیخ حمزہ مخدومیؒ کی دعاؤں اور اوراد ووظائف کا ذکر بھی درج ہیں۔یوں رقمطراز ہیں ؎

پیرِ ما ھم شاھد ومشھود بود　　　پیرِ ما ھم عابد ومعبود بود

پیرِ ما محبوب حقِ انبیاء است　　　پیرِ ما براولیاء مقصود بود ۲۲ ؎

منابع وماخذات:

۱۔کشمیر میں فارسی شاعری کی ابتداء وارتقاء از ڈاکٹر سیدہ رقیہ، چاپ شالیمار آرٹ پریس،ص۔۸۵

۲۔کلام شیخ العالم از پیرزادہ عبدالخالق طاہری چاپ سٹی بک سنٹر،سرینگر۔ ص۔۶،۹

۳۔(واقعات کشمیر از خواجہ محمد اعظم دیدہ مری(تحقیق وترجمہ پروفسر شمس الدین احمد) چاپ اسلامک ریسرچ سنٹر سرینا گر،ص۔۱۰۳،۱۰۴)

۴۔صحیفۂ سلطانی از پروفسر شمس الدین، چاپ سرینگر ص ۱۲۱

۵۔سوانح حیات حضرت شیخ سلطان العارفین مولف ومترجم ابوالسجاد، چاپ سلطانیہ بک ڈیپو سرینگر۔ص ۴۱، ۴۲، ۱۷ اور کشمیر کے ریشی صوفیاءؒ از ڈاکٹر جی۔ایم۔شادابؔ، چاپ، جے۔کے۔بک شاپ نواکدل سرینگر،ص۔۳۳،۶۶،۶۷

۶۔Alchemy of light By LALCOKE P-277 ،P- 455

G.N.ADFAR,Publish - KITABGAR

۷۔(کشمیر میں چک دور کی فارسی نثر از پروفیسر سیدہ رقیہ، چاپ پیارا پرینٹگ پریس،ص۔۱۱،کشمیر میں فارسی شاعری کی ابتداءاور ارتقاءاز پروفیسر سیدہ رقیہ، چاپ پشالیمار پرینٹگ پریس،ص۔۱۳۳، ۱۳۴)8۔تذکرۃ علماء وادباء (روضتہ الاحباب) از ڈاکٹر سیدہ رقیہ، چاپ پیارا پرینٹنگ پریس سرینگر۔ص۔۱۲۳ 9۔چک دور کی فارسی نثر از ڈاکٹر سیدہ رقیہ، چاپ پیارا پرینٹنگ پریس سرینگر۔ص ۲۸۔۳۰ 10۔کشمیر میں فارسی شاعری کی ابتداء وارتقاء از ڈاکٹر سیدہ رقیہ، چاپ پیارا پرینٹنگ پریس سرینگر۔ص۔۱۰

۱۱۔ایضاً،ص۔۱۵

۱۲۔ ایضاً،ص۔۲۰

۱۳۔ ایضاً،ص۔۱۳۸

۱۴۔ایضاً،ص۔۱۳۹

۱۵۔(کشمیر میں چک دور کی فارسی نثر از پروفیسر سیدہ رقیہ، چاپ پیارا پرینٹگ پریس،ص۔۸۶)

۱۶۔ایضاً،ص۔۱۴۱

۱۷۔(کشمیر میں چک دور کی فارسی نثر از پروفیسر سیدہ رقیہ، چاپ پیارا پرینٹگ پریس،ص۔۱۵۲)

۱۸۔کشمیر میں فارسی شاعری کی ابتداء وارتقاء از ڈاکٹر سیدہ رقیہ، چاپ شالیمار آرٹ پریس،ص۔ ۹۰۔۹۲اور چلچلتہ العارفین از خواجہ محمد اسحاق قاری کشمیری، چاپ جے۔کے۔آفسٹ پرنٹرز دہلی۔

۱۹۔کشمیر میں فارسی شاعری کی ابتداء وارتقاء از ڈاکٹر سیدہ رقیہ، چاپ پیارا پرینٹنگ پریس سرینگر۔ ص۔۱۵۷،

۲۰۔ایضاً ، ص۔۱۶۱

۲۱۔ Alchemy of light By G.N.ADFAR,Publish - KITABGAR P- 455 LALCOKE ,

۲۲۔کشمیر میں فارسی شاعری کی ابتداء و ارتقاء از ڈاکٹر سیدہ رقیہ، چاپ پیارا پرینٹنگ پریس سرینگر۔ص۔۱۱۴،۱۱۵

☆☆☆

Fani ki Masnavi "Masdar-ul-Aasaar"mein Ekhlaqi Aqdaar ki Akkasi

by Dr.Syed Shafi(Srinagar) cell-7051022600

ڈاکٹر سید شافی (سرینگر)

فانی کی مثنوی ''مصدر الآ ثار'' میں اخلاقی اقدار کی عکاسی

اخلاق اور اخلاقی اقدار کی پاسداری کسی بھی خوشحال اور پر امن معاشرے کی بنیاد اور قلب تشکیل دیتی ہے۔ اخلاقی قدریں واضح طور پر صحیح اور غلط کو الگ کرتی ہے۔ اور یہ کردار سازی کی بنیاد ہیں کیونکہ یہ لوگوں کو سوچنے اور برتاؤ کرنے کے انداز کو قابو کرتی ہے۔ عام طور پر، اخلاقی اقدار کو عالمگیر سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ دنیا بھر میں لوگ ان سے اتفاق کرتے ہیں اور ان کی حمایت کرتے ہے۔ اخلاقی اقدار کے بارے میں حضرت محمد ﷺ فرماتے ہے، ''میں صرف اچھے اخلاق اور کردار کو کامل کرنے کے لئے بھیجا گیا ہوں'' [۱] دنیا کے تمام مذاہب میں اخلاقی اقدار اور کردار کو اہمیت دی گئ ہے۔ اور مذکورہ موضوع پر مختلف زبانوں میں ادب تخلیق کیا گیا ہے۔ فارسی ادب اخلاقیات کی عکاسی کے لئے وسیع پیمانے پر جانا جاتا ہے۔ فارسی ادب کے ہر دور میں اس موضوع پر تصنیفات ملتی ہے۔ اس سلسلے میں بہت سے مصنفین قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ہم نے ملا محسن فانی کشمیری اور ان کی ایک مثنوی مصدر الآ ثار کا انتخاب کیا ہے۔

فانی، شیخ محمد محسن کا قلمی نام تھا۔ وہ اک فارسی عالم اور شاعر تھے۔ وہ سترھویں صدی کے دوران تعلیم یافتہ خاندان میں پیدا ہوے تھے۔ [۲] فانی کشمیری سترھویں صدی عیسوی کے سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور ماہر فلسفی مصنف اور شاعروں میں سے ایک ہیں۔ انھوں نے مدرسہ قطبیہ میں شیخ یعقوب صرفی سے تعلیم حاصل کی [۳]۔ فانی مغل شہنشاہ شاہجہان کے دربار سے منسلک تھا۔ [۴] ان کی تحریریں بنیادی طور پر اخلاقی نوعیت کی ہیں۔ ان کا ایک دیوان ہے جس میں غزلیں، قصیدے، رباعیاں ہیں اسکے علاوہ چار، مثنویاں ہیں جن میں سے ایک مصدر الآ ثار ہے۔ فانی نے اس مثنوی کی تالیف ۱۶۵۶ء میں کی تھی۔ ۱۰۶۷ اشعار پر مبنی یہ ایک مذہبی مثنوی ہے۔ فانی نے نظامی کی مثنوی مخزن الاسرار کی پیروی کی ہے۔ [۵]۔

اس کا مقصد اخلاقی اقدار کی اہمیت کو واضح کرنا ہے جیسا کہ ملا محسن فانی نے اپنی ادبی

تصانیف کے ذریعہ بیان کیا ہے۔اخلاقیات اوراخلاقی اقدار اصولوں کا مجموعہ ہے جس میں سچائی ، ایمانداری، سالمیت،شفافیت، احتساب،معروضیت، احترام، قانون کی اطاعت اور وفاداری جیسے اہم اجزاء ہیں۔ فانی نے اخلاقیات کے تقریباً تمام اجزاء اور پہلوؤں کو بیان کیا ہے۔فانی نے اپنی مشہور مثنوی مصدرالآثار میں اخلاقیات اوراخلاقیات کے پہلوؤں کوذیل میں بیان کیا ہے: ؎

سچائی: سچائی ایک منصفانہ معاشرے کی بنیادرکھتی ہے۔سچائی کے دو پہلو ہیں۔اپنے آپ سے سچا ہونا اوردوسروں کے ساتھ سچا ہونا۔فانی نے سچائی کے اصول پرایک اعلیٰ قدررکھی جیسا کہ وہ کہتے ہیں:۔

تا بتوانی سخن بدمگوی　　　　بدشوداز گفتن بدنیک خوی[۶:ص ۲۵۴]

فانی کشمیری سچائی کومطلق حقیقت سمجھتے تھے۔انہوں نے سچے ہونے پرزوردیا ہے۔کہتے ہے کہ جب تک ہو سکے برا نہ کہو۔ برا کہنے سے نیک آدمی بھی برا بن جاتا ہے۔ایک دفعہ اور لکھتے ہیں: ؎

خرقۂ کذب این ھمہ برخودمپوش　　　　ژندہ تلبیس بیفگن زدوش[۶:۲۷۶]

جھوٹ کا لباس مت پہنواوراسے اپنے کندھوں سے اتاردو۔یعنی فانی اس شعر میں بھی جھوٹ سے دورین اختیارکرنے کی تاکیدکررہے ہیں۔اس کے علاوہ فرماتے ہیں: ؎

دوست شوداز سخن بدعدو　　　　دشمنت ازحرف نکویت نکو[۶:۲۵۴]

سچ سے آپ کے دشمن، دوست بن جاتے ہیں لیکن جھوٹ آپ کے دوست کودشمن بنادیگا۔ فانی اس شعر میں سچ کی طاقت اورقوت کو بیان کرتے ہوے کہتے ہیں کہ سچ سے رشتے بھی بدل سکتے ہیں اورامن اوردوستیاں قایم ہوسکتی ہیں۔اس لئےاس اخلاقی اقدارکی تبلیغ کرتے ہیں۔

۲:عاجزی/انکساری: عاجزی کا مطلب یہ ہے کہ اپنے دل کی نرمی اور مہربانی سے کام کرے اور بدلے میں کسی چیزکی توقع نہ رکھے۔عاجز ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تکبر یاغرورنہ کریں اوراپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے میں بلندمقام پرنہ رکھیں۔اس ضمن میں فانی فرماتے ہیں: ؎

ای شدہ مغروربہ فضل وکمال　　　　غلغلہ انداختہ از قیل وقال[۶:۲۶۰]

ای وہ کہ جوفضل وکمال حاصل کرنے کے بعدمغرورہوگیا۔تم نے اپنے قیل وقال کے شورشرابا یافساد برپاکردیا۔جب بھی کسی شخص کوکوئی اچھی اورقیمتی چیزعطا کی جاتی ہے وہ تکبراورغرورکرنے والا بن جاتا ہے۔جوکہ انتہاپسندی کی نشانی ہے۔مغرورشخص دوسری بری عادات کوفروغ دیتا ہے اوراپنی بےمعنی دنیامیں کھوجاتا ہے۔فانی ایک اورشعر میں فرماتے ہے: ؎

گاہ دم از شعر و معما زدہ ساغر صہبای دوبالا زدہ[۲۶۰:۶]

گہہ زدہ از صیغہ ترکیب وحرف کردہ ببر خرقہ از نحو صرف[۲۶۱:۶]

اعلی کردار کا احساس لوگوں کے احساسات کو محدود کرنے اور اعمال پر قابو پانے سے ہوتا ہے۔ بہت سی چیزیں تکبر اور غرور کے تکمیل کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ علم بعض اوقات لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ وہ دوسروں سے زیادہ لایق یا برتر ہیں۔ جیسا کہ فانی اس شعر میں فرماتے ہیں: ؎

گاہ دم از علم و معانی زدہ درھمہ جا تیغ زبانی زدہ

گاہ بیان کردہ از علم فضول معنی قال اللہ قال الرسول[۲۶۱:۶]

علم اگر چہ تھوڑا ہی ہو تو وہ غیر اخلاقی کردار کی اعلی ڈگری کی قیادت کر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک شخص حتمی سچائی اور طاقت (اللہ) کے احکامات کو بھی مسترد کر سکتا ہے۔

۳: خاموشی: فانی کے مطابق کچھ چیزوں میں خاموشی اختیار کرنا، بات کرنے سے بہتر ہے۔ کیونکہ خاموشی اکثر تقریر سے بہتر ہو سکتی ہے۔ کیونکہ بعض اوقات کچھ باطنی افکار اور راز جو کہ دراصل اپنی فطرت میں نا قابل بیان ہوتے ہیں۔ اور ان کو الفاظ میں ڈھالنے کی کوشش ان کو نیچا دکھاتی ہے۔ اس ضمن میں فانی لکھتے ہے: ؎

مھر خاموشی بلب خود نہ دررہ معنی قدمی پیش نہ[۲۳۴:۶]

خاموشی کہ مہر اپنے ہونٹوں پہ لگا دوں اور معنی کی راہ میں قدم اٹھاو۔ اس شعر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کبھی کبھار کسی بات کو الفاظ کے ذریعہ سے زیادہ خاموشی کے ذریعہ معنی دیا جا سکتا ہے۔ خاموشی کسی بھی عمل کے مقصد کی پاکیزگی کی حفاظت کرتی ہے جو رحم دلی، محبت، پرہیز گاری یا خدا کے خوف سے کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ ہمیشہ خاموشی نہیں ہے جو اخلاقی طور پر اچھے کردار کی تعمیر کرتی ہے کبھی کبھار یہ بالکل برعکس ہے: ؎

مہر خموشی بلب خود منہ تیغ زبان را سخن آب بدہ[۲۵۹:۶]

اپنے ہونٹوں پہ خاموشی کہ مہر نا ڈالو۔ اپنی زبان کی تلوار کو الفاظ کے پانی سے سیراب کرو۔ یعنی کچھ معاملات میں خاموشی اختیار کرنا ظلم یا زیادتی کا باعث بنتا ہے۔ اسلئے خاموشی کا صحیح جگہ استعمال کرنے کے طریقے کو سیکھنا ہے اصل اخلاقی اقدار میں شامل ہوتا ہے۔ اس طرح صحت مند اخلاقی اقدار تشکیل پاتے ہیں۔

۴: دنیاوی خواہشات کو ترک کر دینا: دنیاوی خواہشات کی تلاش اور اس میں لالچی ہونا بد اخلاقیات

کے پہلو پیدا کرتا ہے۔اس سے خودغرضی کوتقویت ملتی ہے۔جیسے کہ محسن فانی اس شعر میں فرماتے ہیں:۔

سنگ دل ازصورت بت سادہ کن ازبی نقش صمدآمادہ کن[۲۷۶:۶]

اپنے پتھر دل کو بتوں کی صورت سے پاک کردواور صمد جسکا کوئی خدوخال ہیں اس سے اپنے دل کوآمادہ کرلو۔یعنی ظاہر پرستی سے باز آ کر سادگی اور بی نیازی اختیار کرو۔اور ایک جگہ لکھتے ہے:۔

پاک کن ازنقش صنم سینہ را سادہ زینگار کن آئینہ را[۲۷۸:۶]

پاک شواز خواہش بی جاۓ نفس تارہی ازموجہ دریای نفس[۲۹۰:۶]

اپنےنفس اور دل کوخواہشات سے پاک کردو تاکہ ایک سادہ اور شفاف راستہ پا سکو۔ سادگی ،صبر،شکرایک پاکیزہ زندگی گزارنے کے طریقے ہیں اور لالچ انسان کو کمزور اور مادی چیزوں سے لگاو رکھتا ہے۔دنیاوی خواہشات کو چھوڑ کر روحانی بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ذرائع پر خدا کی مدداور آزادی کودعوت دیتا ہے۔

۵:خودشناسی: تمام انسانی کوششوں اور روحانی راستوں کا مقصد خودشناسی ہے۔اپنی انا کو آفاق نفس کے ساتھ جوڑ دینا ہے۔اس ضمن میں شاعر فرماتے ہے:۔

آب بر ریزاین کرۂ خاک را خاک نشین کن ہمۂ افلاک را[۲۳۱:۶]

اس زمین پہ پانی ڈال کرتمام آسمانوں کوخاک نشین کردے۔یعنی اپنےنفس کوقابو کرکے تمام افلاک کواپنے قابو میں کیاجاسکتاہے۔اگراندرون خالص ہےتو درون میں خوداس کی عکاسی ہوگی۔

برسر خودجاےخس وخارکن جوہر خاکی خوداظہار کن[۳۰۸:۶]

جب تک حقیقت کا ادراک نہیں ہوتا وجود کی سچائی تخلیق کی مقصد کی سچائی جسم،روح،اور کائینات کی تقدیر کی سچائی اورانسان بےلوث مخلوق بننے کے لئے جدوجہدنہیں کرتا۔اخلاقیات کی سطح کو بلند نہیں کیاجاسکتاہے۔

خلاصہ: اخلاقیات یعنی اس طرح کا سلوک کرنا جودنیا کوایک بہترجگہ بنائے خاص طور پراگر ہرکوئی اس بات پرعمل کرے۔اخلاقی اقدار حدود کاتعین کرتی ہیں۔جوکسی فرد کوخود اور دوسروں کے بارے میں مناسب طرزعمل کا مظاہرہ کرنے میں مدد کرتی ہیں۔اخلاقی اقدار ہماری زندگی میں ترجیحات کاتعین کرتی ہیں۔اخلاقیات ایک لحاظ سےایک اچھی مثال قائم کررہی ہےادب کے ذریعے اخلاقی اقدار کو زندہ کرنے اور پھیلانے کی اشدضرورت ہے۔جس نے معاشرے میں اخلاقی اقدرا کوترجیح دینے

میں کبھی اہمیت نہیں کھوئی۔اسی ضمن میں فانی کی مثنوی مصدرالآثار ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔جس میں سے چند اشعار کا انتخاب کر کے اس مقالے میں مثال کے طور پر پیش کیے گیے ہیں۔فانی نے سچائی، خاموشی، ترک خواہشات دنیاوی، خود شناسی جیسے اخلاقی اقدار کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ اشعار کی صورت میں بیان کیا ہے اور انکی اہمیت اور افادیت واضح کر دی ہیں۔

حوالہ جات:

۱: حکیمی محمد رضا (۱۳۹۱ھ)۔الحیات، ترجمہ احمد ارم، فرہنگ اسلامی تہران، ج ۶، ص ۶۷۵۔

۲: دغلت، محمد حیدر مرزا (۱۳۸۴ھ)، تاریخ رشیدی، میراث مکتوب تہران، ج ۳، ص ۱۰۴۹۔

۳: خوشگو، بانداربنداس (۱۳۹۰ھ)، سفینۂ خوشگو، مجلس شوریٰ اسلامی، موضع و مرکز اسباد، ص ۳۴۸۔

۴: اخلاص، بہار کشن چند (۱۹۷۳ء)، ہمیشہ بہار، کراچی، ص ۱۸۳۔۱۸۵۔

۵: صفا، ذبیح اللہ (۱۳۳۴ھ)، تاریخ ادبیات در ایران، انتشارات فردوس، تہران، ج ۳، ص ۸۸۔۱۲۸۵۔

۶: عابدی، سید امیر حسن (۱۹۶۴ء)، مثنویات فانی کشمیری، اکیڈمی آف آرٹس، کلچر اینڈ لینگویجز سری نگر۔

☆☆☆

Wali Mohd. Aseer Kishtwari ki adabi tareekh navisi by Dr.Zahoor Ahmad Makhdoomi(Asst. Prof Urdu,Govt.Degree college Sopore Jammu&Kashmir)cell-9086805001

ڈاکٹر ظہور احمد مخدومی (اسسٹنٹ پروفیسر اُردو گورنمنٹ ڈگری کالج سوپور کشمیر)

ولی محمد اسیرؔ کشتواڑی کی ادبی تاریخ نویسی

(''صوبہ جموں کے اُردو قلمکار'' کی روشنی میں)

ولی محمد اسیرؔ کشتواڑی کی شخصیت بظاہر کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ وہ بیک وقت شاعر، ادیب، نقاد، محقق، تاریخ نگار اور سب سے بڑھ کر ایک اعلیٰ، سادہ اور شریف الطبع انسان ہیں۔ میرے والدِ محترم مرحوم نظام الدین سحرؔ صاحب کے ساتھ آپ کا ادبی تعلق تھا۔ والدِ مرحوم کی وساطت سے ان کی کئی اُردو کتابیں مطالعے میں آئیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں گوناگوں صلاحیتوں سے مالا مال کیا ہے۔ دورِ حاضر کے اُردو قلمکاروں میں اسیرؔ صاحب کا نام انتہائی وقار اور اعتبار سے لیا جاتا ہے۔ حال ہی میں انھیں اُن کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں ساہتیہ اکادمی نئی دہلی نے ان کی کشمیری کتاب ''توازن'' پر ''ساہتیہ اکادمی ایوارڈ'' ۲۰۲۱ء سے نوازا ہے۔ اسیرؔ صاحب کی اب تک چار درجن سے زائد کتابیں انگریزی، اُردو اور کشمیری میں تصنیف وتالیف ہوئی ہیں اس کے علاوہ انھوں نے دوسرے ادیبوں اور مصنفین کی تصنیفات وتالیفات پر کم وبیش دو درجن مقدمے، دیباچے اور پیش لفظ بھی لکھے ہیں۔ تاریخ نویسی میں انھیں کمال دسترس حاصل ہے۔ زیرِ نظر کتاب ''صوبہ جموں کے اُردو قلمکار'' (حصہ اول ودوم) سے پہلے تاریخ نگاری میں ان کی کئی اہم کتابیں ''تصویرِ ضلع ڈوڈہ''، ''ضلع ڈوڈہ کی ادبی و ثقافتی تاریخ''، ''فوکس آن جموں اینڈ کشمیر''، ''تاریخ اشاعتِ اسلام''، ''تاریخ اولیائے جموں وکشمیر''، ''جُمی صوبک کاشر قلمکار''، ''کشیر تہ جمس منز کاشر زبان وادب'' اور ''ذکر وفکر'' شائع ہو چکی ہیں جن کو ملک اور بیرون ملک کے ادیبوں اور نقادوں نے نہ صرف پسند کیا بلکہ ان پر اظہار خیال بھی کیا ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اُردو زبان وادب سے وابستہ قلمکار، شاعر، ادیب، محقق وصحافی اپنی معیاری تخلیق وتحقیق کے ذریعے اُردو زبان وادب کی بے لوث خدمت انجام دیتے ہوئے اس شیریں

زبان سے اپنی والہانہ وابستگی کا عملی ثبوت فراہم کررہے ہیں۔''تذکرۂ میر'' سے لے کر اب تک مختلف ادیبوں اور شاعروں کی ادبی خدمات پر سینکڑوں کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور یہ سلسلہ تاہنوز جاری وساری ہے۔اُردو زبان وادب کے فروغ میں صوبہ جموں سے وابستہ ادیب اور شاعر بھی ادب کی خدمت میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔اُردو زبان وادب کے فروغ میں جموں صوبے میں اُن کا اہم رول رہاہے۔زیرِنظر کتاب''صوبہ جموں کے اُردو قلمکار'' سے پہلے اس موضوع پر کئی کتابیں پہلے ہی شائع ہوچکی ہیں مگر وہ سب نامکمل اور مختصر تھی جن میں پروفیسر ظہور الدین کی انگریزی کتاب "Development of Urdu Language and Literature in the Jammu region"،عبدالقادر سروریؔ کی''کشمیر میں اردو''،منشورؔ بانہالی کی''بانہال گیٹ وے آف کاشمیر'' طالب حسین رندؔ بھدرواہی کی''کہکشاں''،فریدیہ بزم ادب ڈوڈہ کی''انوارِ فریدیہ''اور''ضلع ڈوڈہ کی ادبی وثقافتی شناخت''،بشیر بھدرواہی کی''بھدراوہ کی تاریخ وثقافت''،محمد ایوب شبنم کی''ادبیات پونچھ''،پروفیسر شہاب عنایت ملک کی''بھدرواہ کے نمائندہ اردو شعراء'' کے علاوہ مصنفِ موصوف کی چار کتابیں''تصویرِ ضلع ڈوڈہ''،''ضلع ڈوڈہ کی ادبی وثقافتی تاریخ''،''فوکس آن جموں اینڈ کشمیر''اور''ذکر وفکر'' قابل ذکر ہیں۔ولی محمد اسیرؔ کشتواڑی کی شہکار کتاب''صوبہ جموں کے اُردو قلمکار'' (حصہ اول)۲۰۲۱ء میں اقراء پبلشرز بہروٹ راجوری جموں کشمیر کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے۔میگزین سائز میں طبع شدہ کتاب ۵۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔اس کتاب میں جموں صوبے کے(۳۳) تینتیس قلمکاروں کی علمی وادبی خدمات کا مفصل جائزہ پیش کیا گیا ہے۔کتاب کا انتساب اسیرؔ صاحب نے اپنی مرحومہ ہمشیرہ حنیفہ بانو کے نام کیا ہے جس میں ان کی وفات کی تاریخ اور مغفرت کی دعا کی گئی ہے۔کتاب کا''پیش لفظ'' اُردو زبان وادب کے مایہ ناز اُستاد پروفیسر شہاب عنایت ملک نے تحریر کیا ہے جس میں انھوں نے اسیرؔ صاحب کی علمی وادبی خدمات کو سراہا ہے۔ مصنف کا تعارف کراتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں:

''اسیرؔ کشتواڑی وادیٔ چناب کی وہ بلند قامت ادبی شخصیت ہے جن کے ادبی کارناموں کی شہرت بہت سارے ملکوں کی سرحدیں پھلانگ چکی ہے۔وادیٔ چناب کے اس سدا بہار ادیب،شاعر،نقاد،محقق اور تاریخ نگار کے کئی ادبی شہہ پارے معرض وجود میں آکر دنیائے ادب میں منفرد مقام بناچکے ہیں۔ ملک اور بیرون ملک کے بیشتر نقادوں اور دانشوروں نے ان کی تحریروں پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہیں اردو اور کشمیری زبان کا نہ صرف ایک سچا عاشق قرار دیا ہے بلکہ ان کے ادبی فن پاروں کی پرکھ کر

کے انھیں اعلیٰ مقام بھی عطا کیا ہے۔'' ا؎

''اپنی بات'' میں مصنفِ کتاب اسیرؔ کشتواڑی نے ضلع جموں کی مختصر تاریخ بیان کی ہے اس کے علاوہ جموں صوبے کے قلمکاروں، ادیبوں اور شاعروں پر اب تک لکھی جانی والی کتابوں کے مصنّفین کا بھی ذکر کیا ہے جن میں پروفیسر ظہور الدین، عبدالقادر سروریؔ، منشورؔ بانہالی، طالب حسین رندؔ بھدرواہی، بشیرؔ بھدرواہی، محمد ایوب شبنمؔ اور پروفیسر شہاب عنایت ملک قابل ذکر ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ''صوبہ جموں کے اُردو قلمکار'' کو ضبطِ تحریر میں لانے کے بارے میں اسیرؔ صاحب لکھتے ہیں:

''۱۸۵۰ء سے لے کر اب تک اُردو زبان وادب پورے جموں، کشمیر اور لداخ میں اپنے قدم مضبوطی سے جمائے رکھے ہیں اور اس دورانیے میں بڑے بڑے عالم، فاضل، مؤرخ، صحافی، ترجمہ نگار، محقق، نقاد، شعراء وادباء اور قلمکار منصۂ شہود پر آئے جن کے نام اتنے زیادہ ہیں کہ ان کو اس نوشت میں جگہ دی جاسکتی۔........... چنانچہ صوبہ جموں کے اردو، شعراء وادباء، ناقدین، محققین، صحافیوں اور قلمکاروں اور ان کے ادب پاروں کو متعارف کرانے کی غرض سے میں دردست کتاب لکھنے پر آمادہ ہو گیا ہوں جس کے چند حصوں میں شائع ہونے کی توقع ہے۔'' ۲؎

زیرِ نظر کتاب کا پہلا مضمون ''صوبہ جموں میں اُردو زبان وادب کا ارتقاء'' (پروفیسر ظہور الدین کی تصنیف کے تناظر میں) موضوع پر ہے۔ اس میں مصنفِ کتاب نے سب سے پہلے پروفیسر ظہور الدین کا مختصر تعارف اور ان کی علمی وادبی خدمات کا جائزہ پیش کرتے ہوئے ان کی کتاب "Development of Urdu Language and Literature in the Jammu region" جو ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی ہے کا جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ اسیرؔ صاحب کے مطابق دراصل اس کتاب کا متن پروفیسر ظہور الدین نے ڈی۔لٹ کے لئے ترتیب دیا تھا جسے بعد میں انھوں نے کتابی شکل دی ہے۔ یہ کتاب نو ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے بارے میں اسیرؔ صاحب لکھتے ہیں:

''زیر نظر کتاب "Development of Urdu Language and Literature in the Jammu region" کو فنی چابکدستی کے ساتھ اختتامیہ کے سمیت کل نو ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ببلوگرافی (کتابیات) پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ تاریخ نگار نے اس کتاب کو حتمی شکل دینے میں ۱۳۷ کتابوں، رسالوں، مسودوں اور سرکاری وغیر سرکاری دستاویزوں کو اپنی تحقیق کی بنیاد بنایا ہے۔ ترتیب، کمپوزنگ، چھپائی، کاغذ، جلد بندی اور سائز کے

اعتبار سے یہ تاریخ دیدہ زیب اوردلکش ہے۔اس میں شامل کیا گیا مواد ہر لحاظ سے معلوماتی اور چشم کشا ہے۔ یہ کتاب جموں، خطے میں اُردو زبان وادب کی تاریخ کے تقریباً تمام اہم گوشوں پر روشنی ڈالتی ہے جس سے آئندہ آنے والے تاریخ نگاروں، اسکالروں اوراس موضوع پر کام کرنے والوں کو کافی رہنمائی مل سکتی ہے۔ ۳؎

صوبہ جموں سے وابستہ جن سربہ آوردہ ادیبوں، شاعروں، قلمکاروں، محققوں، ناقدوں، تاریخ نگاروں اورصحافیوں پر مصنفِ کتاب اسیرؔ کشتواڑی صاحب نے (حصہ اول) میں قلم اٹھایا ہے ان میں کامگارؔ کشتواڑی، رساؔ جاودانی، دیوان نرسنگھ داس نرگسؔ، چراغ حسن حسرتؔ، تحسینؔ جعفری، نشاطؔ کشتواڑی، اللہ رکھا ساغرؔ، عشرتؔ کاشمیری، قدرت اللہ شہاب، ٹھاکر پونچھی، ڈاکٹر سکھ دیو سنگھ چاڑک شعورؔ، وفاؔ بھدرواہی، غ۔ن۔ گونی بھدرواہی، میکشؔ کاشمیری، سعید اللہ ملک حزیںؔ، عرشؔ صہبائی، پشکرناتھ، طاؤسؔ بانہالی، بشیرؔ بھدرواہی، خورشیدؔ کاظمی، پنڈت ودیارتن عاصیؔ، بشیر ابن نشاطؔ کشتواڑی، مرزا محمد یاسین بیگ، ڈاکٹر جتندر اُدھم پوری، خالد حسین، طالب حسین رندؔ اور منشورؔ بانہالی شامل ہیں۔

زیرِنظر کتاب میں اسیرؔ صاحب نے ہر قلمکار کی سوانحی کوائف کے علاوہ ان کے ادبی سفر اور تصنیفی وتالیفی کام کی قدر وقیمت اوراہمیت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ان شخصیات کے متعلق دوسرے محققوں اور تنقید نگاروں کی آراء کو بھی پیش کیا ہے۔ اُردو زبان وادب کے معروف ادیب مرحوم رساؔ جاودانی کا تعارف وہ اس طرح پیش کرتے ہیں:

''مرحوم رساؔ جاودانی شعروادب کی دنیا میں اپنی گراں قدر اردو اور کشمیری شعری خدمات کی بدولت نہ صرف ریاست جموں وکشمیر اور ہندوستان بلکہ پورے برصغیر ہندو پاک میں اچھی طرح متعارف رہے ہیں۔رساؔ صاحب نے دہلی، لاہور اورامرتسر وغیرہ کی سیاحت فرمائی اوروہ جموں میں پہلی بار جس اُردو مشاعرے میں شریک ہوئے اُس میں برج موہن دتاتریہ کیفیؔ اور روشؔ صدیقی جیسے چوٹی کے شعراء بھی شامل تھے۔'' ۴؎

اسی طرح رساؔ جاودانی کی اُردو شاعری پر ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کی آراء کو بھی، اس طرح پیش کیا ہے:

''رساؔ جاودانی ایک فطری شاعر ہیں ان کا کلام تکلف اور آوردہ سے پاک نظر آتا ہے۔ وہ غزلیں بھی کہتے ہیں اور نظمیں بھی۔ان کی نظمیں معانی اور مطالب کے لحاظ سے نظیرؔ اکبر آبادی کے ہم دوش ہیں۔

ان کی عمر بھی نظیر کی طرح پڑھنے پڑھانے میں گذر گئی ہے۔ رسؔا صاحب کی غزلیں ان کی نظموں سے زیادہ پسندیدہ ہیں۔ ان کی غزل زیادہ تر سادگی اور سلاست کی آئینہ دار ہے۔ خواجہ میرؔ درد اور مصحفیؔ کا رنگ ان کے اشعار میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔'' ۵؎

اُردو زبان وادب کے مایہ ناز سپوت اور ''شہاب نامہ'' کے خالق کی ادبی خدمات کے اعتراف میں اسیرؔ صاحب لکھتے ہیں:

''قدرت اللہ شہاب نہ صرف ایک اعلیٰ آفیسر، عالی تبار افسانہ نگار، مضمون نویس، نقاد، ترجمہ کار اور ادیب ہی تھے بلکہ وہ ایک سچے مومن اور خدا دوست انسان بھی تھے۔ یہ ان کا اعجازِ بیان ہی تو ہے کہ ان کا لکھا ہوا ضخیم ترین ''شہاب نامہ'' تب سے اب تک بڑے شوق سے پڑھا جا رہا ہے۔ لفظوں کی جادوگری کی کرامات دیکھنی ہو تو ان کی تحریروں کو اطمینان سے پڑھ کر ذہنی سکون پائیں۔'' ۶؎

صوبہ جموں کے ان (۳۳) تینتیس قلمکاروں کی شخصیت، ادبی خدمات اور ان کی تصنیفی و تالیفی جائزے کے بعد آخر میں ڈاکٹر شہناز قادری کا مضمون ''ذکر وفکر کا تنقیدی جائزہ'' شامل کتاب ہے، جس میں انھوں نے اسیرؔ صاحب کی ایک اہم تحقیقی وتنقیدی کتاب ''ذکر وفکر'' پر موصوفہ کے خیالات اور ان کی آراء موجود ہیں۔ ''کتابیات'' کے حصے میں ۲۳۷ انگریزی، اُردو اور کشمیری کتابوں، رسائل وجرائد کا ذکر موجود ہیں۔ جن سے اسیرؔ صاحب نے زیر نظر کتاب کی ترتیب وتیاری میں مدد لی ہے۔ ترتیب، کمپوزنگ، چھپائی، کاغذ، جلد سازی اور سائز کے اعتبار سے یہ کافی دیدہ زیب، پرکشش اور دلکش ہے۔

اسیرؔ صاحب کی کتاب ''صوبہ جموں کے اُردو قلمکار'' (حصہ دوم) دسمبر ۲۰۲۱ء میں قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نئی دہلی کے مالی تعاون اور جموں وکشمیر اُردو فورم جموں کے زیرِ اہتمام زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ یہ کتاب ۵۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کا انتساب علمی دنیا کی دو نامور شخصیات پروفیسر مرغوب بانہالی اور پروفیسر ارشاد احمد حمال کے نام ہوا ہے۔ زیرِ نظر کتاب (۳۵) پینتیس قلمکاروں کے سوانحی جائزوں اور ادبی کارناموں پر مشتمل ہے۔ کتاب کے 'مقدمے' سے پہلے معروف محقق، نقاد وانشاء پرداز اور شاعر پروفیسر محمد زماں آزردہؔ کا مضمون بہ عنوان ''صوبہ جموں کے اُردو قلمکار حصہ دوم ایک اہم کارنامہ'' شامل کتاب ہے۔ جس میں انھوں نے مصنف موصوف کی ادبی کاوشوں کو نہ صرف سراہا ہے بلکہ زیرِ نظر کتاب کو آئندہ نسلوں کے لئے ایک بیش بہا خزانہ قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''صوبہ جموں کے اُردو قلمکار، حصہ دوم، جس کو میں تذکرہ ہی کہوں گا، آگے آنے والے محققین کے لئے ایک اہم Source کا کام دے گا۔ خاص بات یہ کہ اس میں شامل نوجوان قلم کار اسے اپنی حوصلہ افزائی پر محمول کرکے اپنا کام اور زیادہ جوش وخروش سے آگے بڑھائیں گے۔ نوجوان قلم کار اپنے آپ کو زیادہ ذمہ دار بھی سمجھنے لگیں گے اور آئندہ نہ صرف احتیاط سے کام لیں گے بلکہ جن موضوعات، اصناف، اسالیب اور رویوں کی طرف پہلے توجہ نہ دی تھی ان کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنائیں گے۔''

۷ ؎

''صوبہ جموں کے اُردو قلمکار'' (حصہ دوم) کے مقدمے میں مصنفِ کتاب اسیرؔ صاحب نے پہلے جموں کی مختصر تاریخ پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے علاوہ اس موضوع پر پہلے لکھی جانی والی کتابوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں اُردو زبان وادب اور خاص کر ادبی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لئے یہ خوشخبری سنائی ہے کہ آنے والے وقت میں اس موضوع پر اور بھی کچھ ضخیم حصے شامل ہوں گے۔ کتاب کے 'مقدمہ' میں اسیرؔ صاحب نے ریاستی ادبی اداروں کی غیر ذمہ دارنہ رویے پر اظہار افسوس کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''صوبہ جموں کے ادبی سرمایے کو محفوظ بنانا ایک ضروری امر ہے تاکہ آئندہ نسلیں اچھی طرح بہرور ہوسکیں۔ اس کام کو سرانجام دینے کے لئے کلچرل اکیڈمی کو آگے آنا چاہئے تھا مگر وہ آج کا مستقل سکریٹری نہ ہونے کی وجہ سے عملی طور پر بدنظمی کی شکار ہوگئی ہے۔ اب لے دے کے قومی کونسل برائے فروغ اُردو ہند کی ایک امید کی کرن باقی رہ گئی ہے۔ جو اُردو زبان وادب کی ترقی وترویج دینے کے لئے قابل ستائش کام کررہی ہے۔ مواد کو جمع کرنا اور اُسے ایک مناسب انداز میں پیش کرنے کا کام انتہائی کٹھن اور صبر آزما ہے مگر اُسے کتابی صورت دینے میں راقم کو ہر جگہ سے حسبِ توقع تعاون مل رہا ہے۔ اس طرح میں پُرانے اور بوسیدہ اوراق کو جمع کرکے اپنی کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کررہا ہوں۔'' ۸ ؎

کسی بھی قوم کا ادب یقیناً وہاں کے ادیبوں کی انفرادی کاوشوں کا ثمر ہوتا ہے اور مجموعی سطح کے مطالعے کے لیے ان ادباء کی نگارشات کا انفرادی سطح پر الگ سے مطالعہ اور جائزہ ممکن ہے جب تک نہ قابل ذکر ادبی فن پاروں کو صحیح تناظر میں پیش نہ کیا گیا ہو۔ ایسا کام نہ صرف صبر آزما ہے بلکہ بہت ہی کٹھن اور مشکل بھی ہے یہ کام کرکے واقعی اسیرؔ صاحب نے اُردو زبان وادب کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس کتاب میں اُردو زبان وادب سے وابستہ ایسے ادیبوں اور شعراء کے بارے میں

معلومات سامنے آ رہی ہیں جن کی تخلیقات اُردو زبان وادب کے لئے ایک بیش قیمت خزانے سے کم نہیں ہے۔ ان میں سے کچھ قلم کار گمنامی کی زندگی گزار کر اس دارِفانی سے رُخصت بھی ہوئے ہیں۔ اسیرؔ صاحب نے یہ بجا فرمایا ہے کہ یہ کام کسی فردِ واحد کے لئے کرنا بہت ہی دشوار ہے۔ ایسے علمی منصوبے کو منطقی انجام تک پہچانے کے لیے ریاست کے ادبی اداروں کو سامنے آنا چاہئے تھا مگر ان کی غفلت شعاری بہت ہی افسوس ناک ہے۔ زیرِنظر کتاب میں جن قلمکاروں کی سوانحی کوائف، ادبی سفر، ان کی تصانیف وتالیفات کا جائزہ اور قدر وقیمت متعین کی گئی ہے۔ ان میں اسعدؔ بھدرواہی، ضمیرؔ فریدی، بالمؔ بھدرواہی، فداؔ کشتواڑی، پروفیسر مرغوبؔ بانہالی، مالک رام آنند، تنویرؔ بھدرواہی، آسؔ بھدرواہی، رحمتؔ بانہالی، ڈاکٹر عبدالمجید بھدرواہی، غلام قادر مغل، ذوالفقارؔ پوگلی، ڈاکٹر صابر مرزا، خورشید احمد بسملؔ، تسکینؔ بڈانوی، امین صابونیہ، محمد ایوب شبنمؔ، ساغرؔ صحرائی، شاذؔ شرقی، پرتپال سنگھ بیتابؔ، بلراج بخشی، احمد شناس، آنندؔ لہر، امینؔ بانہالی، مولانا اثریؔ، بشیر احمد تشنہؔ، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، ڈاکٹر دلجیت ورما، یوگیندر پال طائرؔ، ڈاکٹر کرن سنگھ کرنؔ، ڈاکٹر ریش پال شرما، ڈاکٹر چمن لال بھگت، ڈاکٹر شہناز قادری، ڈاکٹر محمد آصف علیمیؔ اور طارق ابرارؔ قابلِ ذکر ہیں۔

''کتابیات'' کا حصہ ۱۴۴ اُردو اور کشمیری کتابوں، رسائل وجرائد پر مشتمل ہے جن کا مطالعہ زیرِنظر کتاب مرتب کرنے کے دوران اسیرؔ صاحب نے کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں آپ کی (۴۸) اڑتالیس تصانیف وتالیفات کی مکمل فہرست موجود ہے۔ کتاب کے گرد پوش کو اُردو اور کشمیری کی نامور شخصیات موہن لال آتش، ڈاکٹر عزیزؔ حاجنی، غلام نبی آتشؔ، عرشؔ صہبائی، امینؔ بنجارا، پروفیسر شمیم حنفی اور پروفیسر شہاب عنایت ملک کے اسیرؔ صاحب کی کتابوں پر کئے گئے تبصروں سے مزین کیا گیا ہے۔

زیرِنظر کتاب ''صوبہ جموں کے اُردو قلمکار'' کی ایک نمایاں خوبی جو اُسے ممتاز بنادیتی ہے وہ اسیرؔ صاحب کا طرزِ تحریر ہے۔ ان کے اسلوب میں روانی ہونے کے ساتھ ساتھ سادگی بھی موجود ہے۔ وہ اپنی بات اور نتائج کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لئے صاف اور واضح اسلوب کا استعمال کرتے ہیں۔ فارسی، اُردو اور کشمیری زبان وادب کے درخشاں ستارے پروفیسر مرغوبؔ بانہالی کے کلام پر بہت ہی موزون اور کم سے کم الفاظ میں اسیرؔ صاحب تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مرغوب صاحب کا سارا کلام دلچسپ اور فکر انگیز ہے جس کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے اکثر ذہنی ورزش کرنا پڑتی ہے۔ وہ غزل کے مزاج اور تقاضوں سے نہ صرف بخوبی آشنا تھے۔ بلکہ وہ منفرد انداز میں

دلکش اور دلفریب غزل گوئی میں یکتائے روزگار بھی تھے۔مرغوبؔ ادب برائے زندگی کے قائل تھے لہٰذا فن شاعری کی انسانی معنویت وافادیت پر بھی کافی زور دیتے رہے۔'' ۹؎

اسی طرح معروف محقق ونقاد اور افسانہ نگار ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی تحقیقی کاوشوں کو اپنے منفرد انداز میں کس طرح سراہتے ہیں:

''بحیثیت محقق ڈاکٹر مشتاق احمد وانی قائم کئے گئے تحقیقی ضوابط کی پوری پوری پاسداری کرتے آئے ہیں۔اُن کے دونوں تحقیقی مقالے ان کی علمی بصیرت اور پیہم جدوجہد کی زندہ مثالیں ہیں۔وادیٔ چناب کا اردو دان طبقہ اس پر انتہائی فخر کرتا ہے کہ اس خوبصورت خطے نے ڈاکٹر مشتاق احمد وانی جیسے ذہین اور محنتی اسکالر کو جنم دیا ہے۔اُن کا تحقیقی سفر ابھی بھی جاری ہے۔'' ۱۰؎

''صوبہ جموں کے اُردو قلمکار'' کا مطالعہ کر کے انسان حیرت زدہ ہوتا ہے کہ اسیرؔ صاحب نے جو محکمہ حساب وخزانہ سے ۳۴ برس تک وابستہ رہے اور کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہنے کے باوجود انھوں نے کیسے تاریخ کے اہم موضوع پر نہ صرف قلم اٹھایا ہے بلکہ حق ادائی بھی کی ہے۔اس بات کو پروفیسر محمد زمان آزردہؔ نے بڑے ہی خوبصورت اور ادبی انداز میں اس طرح پیش کیا ہے:

''ولی محمد اسیرؔ کے بارے میں ہمیشہ ہی یہ سوچ کر حیران رہتے آئے ہیں کہ حساب وکتاب،وصولی اور ادائیگی بحث میں پراوژن،ری اپروپرشن اور اپیروپریشن،حساب وکتاب کے معاملات میں کمی بیشی پر نظر رکھنا،ان کے پیشے کے معاملات کا حصہ رہے ہیں،یہاں تک کہ کسی بھی بل میں درج اعداد کو جب یہ بہ نظر غائر دیکھتے آئے ہیں تو کمی کرنے کا اختیار یہ کس طرح استعمال کرتے ہیں مگر کہیں اگر محسوس ہو کہ کہیں کسی سبب سے درج رقم اُس کے مقابلے میں کم ہے جو اصل ہونا چاہئے مگر مجال ہے جو یہ ایک پیسہ بھی بڑھائیں۔اس کے برعکس اپنے مضامین اور کتابوں میں اوروں سے سرزد ہونے والی کمیوں کو برابر پورا کرتے رہتے ہیں۔اکاؤنٹس اینڈ ٹریجریز کا ڈائریکٹر جنرل واقعی''اسیر'' نظر آتا ہے اور قلم کے استعمال میں ان کی فراخدلی کے سبب سے اسیرؔ بالکل آزاد نظر آتے ہیں۔فکر وتحقیق پر مبنی کئی ضخیم کتابیں دے کر انھوں نے پڑھنے والوں کو مالا مال کر دیا۔ ۱۱؎

وقت کے صحیح استعمال کا ہنر نو آموز اسکالروں کو اسیرؔ صاحب سے سیکھنا چاہئے۔زیرِ نظر کتاب سے پہلے ہی تاریخ نگاری کے حوالے سے ان کی کئی اہم کتابیں پہلے ہی شائع ہو چکی ہیں۔ آپ کے علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں پہلے ہی دنیائے ادب کے نامور محققوں اور نقادوں نے آپ کی ادبی خدمات کو نہ صرف سراہا ہے بلکہ انگریزی اور کشمیری زبان وادب سے وابستہ کئی نامور

شخصیات نے ان کی کتابوں پر سیر حاصل تبصرے بھی کئے ہیں۔ فارسی، اُردو اور کشمیری زبان وادب کے اُساتذ لاساتذہ پروفیسر مرغوبؔ بانہالی (مرحوم) اسیرؔ صاحب کے ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ولی محمد اسیرؔ کشتواڑی بذاتِ خود ایم۔فل یا پی ایچ۔ڈی نہیں ہیں لیکن یہ امر قابل فخر ہے کہ ان کی علمی ،ادبی تحقیقی اور تاریخی نگارشارت ایم۔فل اور پی ایچ۔ڈی کے اسکالروں کے لئے حوالہ جاتی کتب کا درجہ رکھتی ہیں۔ خطۂ ڈوڈہ کے ادبی چمن سے تعلق رکھنے والے اسیرؔ کشتواڑی نے ''تصویرِ ضلع ڈوڈہ'' اور ''ضلع ڈوڈہ کی ادبی شناخت'' جیسی معلوماتی اور عظیم کتب سے نہ صرف علم وادب کے خزانے کو مالا مال کیا ہے بلکہ انھوں نے نئی نسل کے لئے ایسا مواد بھی محفوظ کرلیا ہے جس کی ضرورت رہتی دنیا تک محسوس ہوتی رہے گی۔'' ۱۲؎

ممتاز نقاد، شاعر اور شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی کے سابقہ صدر پروفیسر عتیق اللہ اسیرؔ صاحب کے ادبی میلانات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اسیر صاحب کی ادبی ترغیبات کے ایک سے زیادہ محور ہیں لیکن ترغیبات کے اس اژدہام میں انھوں نے شعری احساس کو کند نہیں ہونے دیا۔ وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں اور شاعری ہی ان کا پہلا عشق بھی ہے اور خطہ ڈوڈہ (جموں وکشمیر) ان کی کمزوری۔ اسیرؔ کشتواڑی صاحب نے انتہائی انہماک وانکاز کے ساتھ نہ صرف اپنی تحقیقی ذمہ داریوں کو پورا کیا ہے بلکہ آئندہ ادبی تاریخ لکھنے والوں کے لئے ''ضلع ڈوڈہ کی ادبی شناخت'' کی شکل میں معلومات کا ایک وافر ذخیرہ بھی مہیا کردیا ہے۔ ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس سفر میں انھیں کئی آزمائشی مرحلوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔'' ۱۳؎

کسی بھی تخلیق کو منصۂ شہود پر لانے کے لئے جس جان سوزی اور صبر واستقامت کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسیرؔ صاحب کی شخصیت میں بدّ رجہ اتم موجود ہے۔ تاریخ وتنقید کے موضوع پر کتاب تحریر کرنے سے اکثر علم وادب کے ماہرین اپنا دامن بچاتے ہیں کیونکہ کسی بھی قلمکار پر لکھنے سے پہلے اس شخصیت کے بارے میں جاننا، معلومات حاصل کرنا اور اس کی لکھی ہوئی تصانیف وتالیفات کو حاصل کرنا اور ان کا بغور مطالعہ کرنا اور اس کے بعد اس کتاب کی قدر وقیمت متعین کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ صوبہ جموں کے اُردو قلمکاروں پر کتاب لکھ کر مصنف موصوف نے اُردو زبان وادب کی وقیع خدمت انجام دی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے ''صوبہ جموں کے اُردو قلمکار'' ایک اہم اور جامع کتاب ہے جس میں تاریخ، تحقیق اور تنقید تینوں کا امتزاج ملے گا۔ اس کتاب کے ہر صفحے سے اسیرؔ

صاحب کی محنت، ادبی لگن اور تاریخ جیسے موضوع سے ان کی طبعی مناسبت اُجاگر ہوتی ہے۔ یہ کتاب آنے والے محققین ، تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اور اسکالروں کے لئے ایک بیش بہا خزانے کی حیثیت رکھتی ہے جس کے لئے مصنف موصوف مبارکبادی کے مستحق ہیں۔اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ جتنی خدمت اسیرؔ صاحب نے اُردو زبان وادب کی ہے اتنی ان لوگوں نے بھی نہیں کی ہے جو اُردو زبان وادب کے فروغ کے لئے بلند بانگ دعویٰ کرتے پھرتے ہیں۔

کسی قوم کی ادبی تاریخ کا مرتب کرنا اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک تمام قابلِ ذکر ادبی فن پاروں اور مصنفین کو اُن کے صحیح حالات کے تناظر اور تاریخی تسلسل کے پس منظر میں سے نہ دیکھا جائے جس وجہ سے ادب تخلیق ہوا ہے۔اسیرؔ صاحب نے واقعی یہ صبر آزما کام کر کے نہ صرف اُردو زبان وادب کی بڑی خدمت کی ہے بلکہ صوبہ جموں کی ادبی تاریخ میں ناقابل فراموش اور بیش قیمت اضافہ کیا ہے اور اگر وہ یہ کام نہ کرتے تو آنی والی نسلیں ہماری بے حسی اور اس علمی وادبی سرمایے کے ضائع ہونے پر مستقبل میں ہمیں کوستی، یہی ایک بڑا کارنامہ اسیرؔ صاحب کے ادبی قد کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

حواشی

ا۔ ''صوبہ جموں کے اُردو قلمکار'' (حصہ اول):از ولی محمد اسیر کشتواڑی۔ص ۷

۲۔ایضاً،ص ۱۲۔3۔ایضاً،ص ۱۴

۴۔ ایضاً ص۴۹

۵۔ ''نظم ثریا'' از رساؔ جاودانی۔ص۶

۶۔ ''صوبہ جموں کے اُردو قلمکار'' (حصہ اوّل):از ولی محمد اسیر کشتواڑی۔ص ۱۶۵

۷۔ ''صوبہ جموں کے اُردو قلمکار'' (حصہ دوم):از ولی محمد اسیر کشتواڑی۔ص ۹

۸۔ ایضاً ص۱۷

۹۔ ایضاً ص۶۴

۱۰۔ ایضاً ص۴۲۲

۱۱۔ ایضاً ص۷

۱۲۔تبصرہ کتاب: تصویرِ ضلع ڈوڈہ از پروفیسر مرغوبؔ بانہالی

۱۳۔تبصرہ کتاب: ضلع ڈوڈہ کی ادبی شناخت از پروفیسر عتیق اللہ

☆☆☆

Kashmiri Ghazal ka safar 1950 ke baad by Ishtiaq Ahmad Malik

(Shopian,Jammu&Kashmir)cell-7006613790

اشتیاق احمد ملک (شوپیان، جموں و کشمیر)

کشمیری غزل کا سفر ۱۹۵۰ء کے بعد

عالمی سطح پر جب ترقی پسند تحریک زوال وانحطاط کی شکار ہونے لگی تو برصغیر کے ساتھ کشمیر میں بھی اس تحریک کے قدم ڈگمگانے لگے۔ تحریک ختم ہونے کے ساتھ ہی کشمیری ادب نے بھی اپنا رُخ دوسری جانب موڑ دیا۔ یہ نیا موڑ عالمی ادب میں پنپنے والی جدیدیت تھی۔ اب شاعروں نے خارجیت کو چھوڑ کر داخلیت پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ اُن کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ کسی تحریک کے سایے تلے اُن کی شاعری لافانی نہیں بن سکتی۔ لہذا انھوں نے اپنے احساسات اور جذبات کو شاعری خصوصاً غزلیہ شاعری کا موضوع بنایا۔ اس نئے مزاج کے نمونے ہمیں نادمؔ کی شاعری میں ملتے ہیں۔ نادمؔ کی ابتدائی دور کی غزلوں پر ترقی پسند تحریک کے گہرے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے خیالات و افکار میں تبدیلی آ گئی اور وہ جدیدیت سے متاثر ہو کر غزلیں لکھنے لگے۔ اُن کی غزلوں کا موضوع نہ صرف حسن و جمال، عشق و عاشقی ہے بلکہ عام انسان کو پیش آنے والے مسائل بھی ان کی غزلوں کی زینت بنے۔ اُن کی شاعری کے موضوعات فارسی روایات سے کم اور کشمیر کی سرزمین سے زیادہ قریب لگتے ہیں۔ اُن کی غزلوں میں کہیں کہیں 'وژن' صنف کا طرز بھی نظر آتا ہے اور پیکر تراشی اُن کی غزلوں کا بنیادی وصف ہے۔ پروفیسر مجروح رشید لکھتے ہیں۔

''نادمؔ کے غزلوں میں ایسے اشعار نظر آتے ہیں جن کے خوبصورت پیکر آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتے ہیں اور ذہن کو منور کرتے ہیں۔ پہلے قاری کا من محضوظ ہوتا ہے اور بعد میں شعر کے مختلف پہلو توجہ طلب بن جاتے ہیں۔'' (عصری کشمیری شاعری، مجروح رشید، صفحہ۔ ۷۳)

کشمیری غزل کے سلسلے میں رحمان راہیؔ کا نام کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ راہیؔ نے روایتی زبان سے انحراف کر کے ایک نئے اور انوکھے انداز میں اپنے جذبات کو شاعری کا جامہ پہنا دیا ہے۔ کشمیری شعری ادب میں محمود گامی سے جو لوک آہنگ کی روایت چلی آ رہی تھی راہی نے اپنی شاعری کو اس سے آزاد کر دیا۔

امین کامل بھی ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوئے۔اُن کا پہلا شعری مجموعہ ترقی پسند خیالات کا براہ راست اظہار ہے۔لیکن جب اُن کا دوسرا شعری مجموعہ شائع ہوا تو اُن کا ایک الگ انداز اور طرز اظہار سامنے آیا۔اس شعری مجموعے میں غزلوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے لیکن جتنی بھی غزلیں اس میں شامل ہیں اُس سے کشمیری غزل میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا۔اُن کی غزلوں کا انداز اتنا زبردست اور معنی خیز کہ نادمؔ اور راہیؔ دونوں اُن سے متاثر ہوئے۔ناجی منور اور شفیع شوق لکھتے ہیں کہ:

''نادمؔ اور راہیؔ بھی اُن کے اثر سے خود کو محفوظ نہیں رکھ سکے۔اُن کو بھی غزل کے روایتی اظہار کی تنگ دامانی کا احساس ہو گیا اور وہ اپنے منفرد انداز کو ڈھونڈنے لگے۔کئی شاعروں نے کامل کی ہی طرح لکھنا شروع کیا اور اچھا بھی لکھا لیکن دوسرا کاملؔ پیدا نہ ہو سکا۔''

(کشمیری زبان اور ادب کی تاریخ،ناجی منور،شفیع شوق،۴۱۸)

کاملؔ نے بار بار استعمال شدہ استعاروں،ترکیبوں اور محاوروں سے گریز کیا اور عام بول چال کے قریب غزلوں کے لئے ایک لہجہ منتخب کیا۔بے تکلف لہجہ اُن کے غزلوں کی بنیادی خصوصیت ہے۔یہ ایک ایسا تجربہ تھا جو کہ نیا ہونے کے ساتھ ساتھ بہادُرانہ اور جرأت مندانہ بھی تھا۔پروفیسر شفیع شوق رقمطراز ہیں۔

''کاملؔ کے غزلوں میں جو بے تکلف لہجہ پایا جاتا ہے وہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔دراصل یہ جان بوجھ کر پیدا کی جانے والی جذباتیت اور داستانوی عشق بازی سے انحراف کی جانب پہلا قدم تھا۔'' (انہار(غزل کا فن)،شفیع شوق،صفحہ۔۱۵۴)

کاملؔ غزل کے بنیادی اصولوں سے پوری طرح واقف تھے وہ غزل کے نظم وضبط کے تابع رہ کر غزلیں تخلیق کرتے تھے۔انھوں نے نئے نئے ردیف اور قافیے اپنی غزلوں کے لئے منتخب کئے۔ انھوں نے نظمیہ شاعری میں بھی قلم آزمایا اور بہت سی نظمیں تخلیق کیں لیکن نظم کے میدان میں وہ اونچا مقام نہیں پا سکے جو غزل میں ان کو نصیب ہوا۔اُن کی غزلیں نظموں کے مقابلے میں زیادہ جاندار ہیں اور اُن کی غزلیہ شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غزل اُن کی روح کے ساتھ پیوست ہے۔کشمیری غزل میں جو نیا پن کاملؔ نے لایا اُس کا احساس اُنھیں خود بھی تھا۔اُن کے غزل کا شعر ہے

کانہہ کلیم اللہ مے روس ژاونہ یتھ شہرس منز

یعنی اس شہر میں میرے سوا کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو کہ کلیم اللہ کی طرح بات کرے۔اشارہ اُن کی غزل کی طرف تھا۔ان تین شاعروں کی سخت محنت سے کشمیری غزل اب ترقی کی بلندیوں پر محیط

ہے۔ نادمؔ، راہیؔ اور کاملؔ نے ایسا کام انجام دیا جو جدید زمانے کا تقاضہ تھا۔

کشمیری غزل کے سلسلے میں غلام بنی فراق کا نام بھی خاص اہمیت ومعنویت کا حامل ہے۔ اُن کی شاعری ترقی پسند تحریک سے اُتنی متاثر نہیں ہوئی جتنی اُن کے ہمعصر شاعروں کی ہوئی تھی۔ فراق کے غزلوں کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے درپیش مسائل، روزمرہ کے حالات اور دیگر مسائل کو جامع انداز میں بیان کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے غزلوں میں راہیؔ کے سنجیدہ لہجے اور کاملؔ کے بے تکلف لہجے کے درمیان کا راستہ اختیار کیا ہے۔ انھوں نے اپنے ذاتی مشاہدات کو غزل کا موضوع بنایا ہے اور اس کے علاوہ تغزل، سوز وگداز اور سلاست سے اپنی غزلیہ شاعری کے چار چاند لگائے ہیں۔ وہ حد سے زیادہ سنجیدہ زبان استعمال کرنے کے بھی کائل نہیں تھے۔

فراق کے بعد جن نامور کشمیری غزل گو شاعروں کا نام آتا ہیں، اُن میں مظفر عازم کا نام بھی اہم ہے۔ انھوں نے اچھی اور معیاری غزلیں لکھیں ہیں اور عصری زندگی کے موضوعات کو غزل میں جگہ دی ہے۔ اُن کی غزلوں میں ہمیں طنز وظرافت کے بھی نمونے ملتے ہیں۔ عبدالستار رنجور، رسا جاویدانی، قاضی غلام محمد، موتی لال ساقی، ارجن دیو مجبور، رشید نازکی، مرغوب بانہالی، غلام نبی ناظر، رسُل پونپر، محمد ایوب بیتاب، غلام نبی خیال اور رفیق راز ایسے شعرا ہیں جن کی دین کو ہم فراموش نہیں کر سکتے۔ غلام نبی خیال ایک معیاری غزل گو شاعر ہیں۔ وہ فلسفیانہ ذہن کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ رومانیت پسند شاعر بھی ہیں۔ اُن کے غزلوں پر رومانیت کا بر پور اثر ملتا ہے۔ چنانچہ پیشے سے وہ ایک صحافی ہیں اس لئے آس پاس کے حالات سے وہ پوری طرح باخبر ہیں اور سماج کے نشیب وفراز کی واقفیت نے اُنھیں ایک اچھا غزل گو شاعر بنا دیا ہے۔ قاضی غلام محمد بھی رومان پسند شاعر ہیں۔ اُن کو اپنے ماضی سے زبردست محبت تھی اور ماضی سے محبت اُن کے غزلوں میں جگہ جگہ چھلکتی ہے جس کی وجہ سے ایک نئی تخیُلی دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ محمد ایوب بیتاب بھی رومانیت پسند شاعر ہیں۔ اُن کی غزلیہ شاعری فطرت کی خوبصورتی کو ایک منفرد انداز میں پیش کرتی ہیں۔

رشید نازکی بھی کشمیری غزل گو کی فہرست میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ اُن کے غزلوں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے روایتی اسلوب کی نہ تقلید کی نہ ہی ایسی زبان کا استعمال کیا ہے جو قاری کو کسی ان دیکھی اور ان سُنی دنیا یا اپنے سماج سے دور نظر آئے۔ تعداد کے لحاظ سے انھوں نے کافی غزلیں تخلیق کیں ہیں۔ انھوں نے موزوں جگہوں پر فارسی الفاظ، تراکیب اور تشبیہات کا بھی استعمال کیا ہے۔ وہ علامت کے برمحل استعمال اور پیکر تراشی سے اپنے محبوب کے سراپا کو بیان کرنے میں بھی

کامیاب نظر آتے ہیں۔عشق کی سرمستی اور عصری زندگی کے رنگ اُن کی غزل میں جا بجا نظر آتے ہیں۔وہ اپنے ذاتی غم،انسان کے روحانی کرب اور اُس کی نفسیاتی کیفیات کو پیش کرنے میں بھی ماہر نظر آتے ہیں۔

مرغوب بانہالی وادی کشمیر سے نہیں بلکہ رسا جاویدانی کی طرح جموں ڈویژن سے تعلق رکھتے تھے۔اُن کی شاعری کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ عشق و عاشقی کے روایتی موضوعات کے پابند نہیں ہیں۔انھوں نے جذبات کا اظہار مذہبی عقائد اور انسانی اقدار کی وساطت سے کیا ہے۔انھوں نے موجودہ انسان کی چاپلوسی اور مکاری پر طنز بھی کی ہے۔

موجودہ دور میں بھی کشمیری غزل کا سلسلہ رواں دواں ہے اور کئی شعرا اپنی آنکھوں کی بینائی اور انگلیوں سے خون کی ایک ایک بوند کو صَرف کر کے غزل کے سفر کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔رفیق راز بھی ان ہی میں ایک متحرک نام ہیں۔اُن کی غزل قاری کو طلسماتی شہروں کی سیر کراتی ہے۔اُن کے غزلوں میں فلسفیانہ مزاج کے علاوہ صوفیانہ رنگ بھی نظر آتا ہے۔وہ عروضی معاملوں میں کافی سنجیدہ ہیں۔ چنانچہ وہ شعر کے آخر پر آنے والی ساکن اور متحرک آوازوں کے استعمال پر بھی کسی قسم کی رعایت کے قائل نہیں ہیں۔

عہد حاضر میں جب غزل کی بات ہو رہی ہو تو شفیع شوق اور مجروح رشید کے نام سب سے پہلے ہمارے ذہن میں آتے ہیں۔شفیع شوق نے اپنی شعری تخلیقات سے اکیسویں صدی کی کشمیری غزل کو ایک نئی سمت و رفتار عطا کی ہے۔وہ کشمیری شاعری کے سلسلے میں مابعد جدیدیت کے بانی کار ہیں۔اسی طرح مجروح رشید بھی موجودہ دور کے معتبر غزل گو شاعر ہیں۔وہ ایک کہنہ مشق شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ دقیق النظر محقق اور اعلیٰ درجے کے نقاد بھی ہیں۔اُن کی بیشتر شاعری انگریزی زبان میں ہے اور اگر دیکھا جائے تو کشمیری زبان میں اُن کی شاعری بہت کم ہے۔لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ اگرچہ مقدار کے لحاظ سے اُن کی کشمیری غزلوں کی تعداد کم ہے لیکن معیار کے اعتبار سے اُن کا کوئی ثانی نہیں۔وہ استعاروں اور علامتوں کے برمحل استعمال کرنے کے ماہر ہیں۔اُن کی غزلوں میں ہمیں جگہ جگہ ایسے استعارے،علامتیں اور ترکیبیں ملتی ہیں جن کا اُن سے پہلے کشمیری غزل میں کہیں کوئی نذیر نہیں ملتی۔فارسی عروض پر دسترس ہونے کے ساتھ ساتھ اُن کو جدید زمانے کے انسان کو درپیش مسائل کا باریک بینی سے مطالعہ ہے۔

غزل جو کہ بنیادی طور پر مشرقی شعری صنف ہے،کشمیری زبان میں یہ فارسی زبان سے مروجہ

ہوگئی اور آج تک یہ مقبول ترین صنف کا درجہ رکھتی ہے۔رسول میر، آزادؔ، مہجورؔ اور ان کے علاوہ کئی اور شعرا نے غزلیہ شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔لیکن اگر دیکھا جائے تو کشمیری غزل ۱۹۵۰ء کے بعد ہی ترقی کی بلندیوں تک پہنچی۔یہاں پر میرے خیال میں یہ کہنا بجا ہوگا کہ جدید کشمیری غزل راہیؔ اور کاملؔ کے فنی تجربوں سے ایک مستحکم اور مستند شعری صنف بن گئی۔جہاں ایک طرف اسے راہی جیسے زبان ساز اور بلند خیال شاعر نے ایک بلند مقام عطا کیا ہے وہیں کامل نے اس کو کلاسیکی لہجے اور عامیانہ انداز سے آزاد کر دیا۔

کشمیری غزل کا سفر جو سعد اللہ اور فاخر سے شروع ہوا تھا، آج بھی رواں دواں ہے۔کئی مایہ ناز شعرا کو اس کے ساتھ گہری وابستگی ہے جن میں ظریف احمد ظریف، غلام نبی آتش، گلشن مجید، رخسانہ جبیں، نسیم شفائی، علی شیدا، شہناز رشید وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اگر دیکھا جائے تو ان شاعروں نے کشمیری میں غزل لکھنے کی روایت کو آگے بڑھایا اور نہ صرف فنی لحاظ سے بلکہ موضوعی اعتبار سے بھی اس میں وسعت عطا کر دی۔ان شعرا میں اکثر و بیشتر تعلیم یافتہ ہیں جن کو اُردو، فارسی کے علاوہ انگریزی زبان سے گہرا تعلق رہا ہے جس کی وجہ سے اُن کی شاعری خاص کر اُن کی غزل میں کافی زیادہ نکھار آ گیا۔

☆☆☆

Urdu Composing:Masael aur Hal by Dr. Jarrar Ahmad(Asst.Prof.
Dept.of Education& Training,MANUU,Hyderabad)cell-9618783492
ڈاکٹر جرار احمد (اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ تعلیم وتربیت، مانو، حیدر آباد)

اردو کمپوزنگ: مسائل اور حل

یقین کے ساتھ یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ فن تحریر کو کب، کیسے، کس نے ایجاد کیا، لیکن یہ بات تو طے ہے کہ انسان نے اپنے خیالات، جذبات، احساسات وغیرہ کو زندۂ جاوید بنانے کے لیے تحریر کو ایجاد کیا اور شروع میں اپنے خیالات کو پتھروں، پتوں، لکڑیوں، چمڑوں وغیرہ پر منقش کرتا رہا جو کہ ایک طرح سے غیر محفوظ تھے۔ جب تحریر وجود میں نہیں آئی تھی تو انسانی خیال، جذبات و احساسات یہ سب انسان کی یادداشت یا میموری کے رہین منت تھے پھر تحریر کا ارتقا ہوتا گیا اور قلم کاغذ کی ایجاد نے ایک انقلاب برپا کر دیا۔ آج جب تحریر نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ہم کسی بھی خیال کو کی بورڈ یا پھر وائس ٹائپنگ کے ذریعہ تحریر کر سکتے ہیں تو جو معاملہ انسانی میموری سے چلا تھا اب پھر کمپیوٹر یا اس جیسی کسی دوسری میموری تک آ گیا۔ اُس میموری سے اِس میموری تک پہنچنے میں تحریر نے ایک بہت ہی طویل اور وقت طلب سفر طے کیا نیز اسے مختلف مدارج وارتقا سے ہو کر گزرنا پڑا۔

ایک وقت تھا جب ہم اپنے خیال کو رقم کرنے کے لیے ترستے تھے اور کوئی ایسا، آلہ یا تحریر ہمارے پاس نہیں تھی اور پھر جب تحریر معرض وجود میں آ گئی تو کسی خیال کو تحریری شکل دینے اور اس کی پیغام رسانی کے لیے بھی انسان کو برسہا برس لگ جاتے تھے۔ کاغذ قلم کی ایجاد سے یہ خلا اور ناآسودگی ختم سی ہو گئی۔ اب ہم اپنے خیالات کو فی الفور رقم کرنے کے ساتھ ارسال بھی کر سکتے ہیں، لیکن آج جب تمام چیزوں کا انحصار ٹکنالوجی پر ہو گیا ہے تو پھر وہی ناآسودگی کا پہلو سامنے آنے لگا ہے۔ جو تلذذ اور لطف کتاب کو پڑھ کر، چھو کر ملتا تھا آج کا انسان ڈیجیٹل بک پڑھ کر وہ طمانیت حاصل نہیں کر پا رہا ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ آنے والی وہ نسل جسے ہم 4.جی کے نام سے جانتے ہیں جو کہ اسی میں پل اور بڑھ رہی ہے وہ تلذذ حاصل کر لے مگر یہ کتابوں والی نسل اس سے تلذذ حاصل نہیں کر سکتی ہے۔ اسی طرح سے جب ہم اپنے الفاظ کو قلم کی مدد سے صفحۂ قرطاس پر رقم کرتے ہیں تو جو مزہ، جو سکون دل کو ملتا ہے وہ ٹائپنگ کے ذریعہ ہمیں نہیں ملتا مزید برآں غالب صریر خامہ ۔۔ والی بات نہیں آتی۔ اس ضمن میں بہت سے شعرا نے اشعار کہے اور بہت سے رائٹرس نے گلاب، پھول، کتابوں کے حوالے سے

لکھا بھی نیز معروف شاعر گلزار نے نظم 'کتابیں' تخلیق کی، جس میں انہوں نے کتاب کے صفحہ کا پلٹنا، اس کا ذائقہ، سینے پر رکھ کے لیٹ جانا، سوکھے پھول وغیرہ کو بہت ہی تفصیل اور خوب صورت انداز میں رقم کیا ہے۔ ان تمام باتوں کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ میں ڈیجیٹلائزیشن کے خلاف ہوں عرض مدعا یہ ہے کہ ہر دور میں ہر وقت میں انسان کسی نہ کسی طرح کے مسائل سے دوچار رہا ہے اور آگے بھی جب تک کاروبار حیات چلتا رہے گا اس قسم کے مسائل سے انسان دوچار رہے گا۔ غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج' (غالب)

تصور کیجیے کہ اگر آج ہمارے سامنے تحریر کی سہولت نہ ہوتی یا پھر تحریر کے تعلق سے جس طرح کے نت نئے آلات آج ہم کو میسر ہیں اگر وہ نہ ہوتے تو ہم کہاں ہوتے یا ہمارا کیا حال ہوتا۔ اس بات کا اندازہ پرفیسر سید احتشام حسین کی تحریر سے لگایا جاسکتا ہے۔ محمد اسحاق صدیقی کی کتاب فن تحریر کی تاریخ' کے تعارف میں وہ لکھتے ہیں کہ "زبان نے انسان کو دوام بخشا، اس نے اس کے دل کی دھڑکنوں اور دماغ کی برق وش لہروں، دونوں کو اس کے لیے حقیقی اور پائدار بنایا، اس نے اس کے تجربات اور محسوسات کو جسم دیا اور اس طرح اس کی ابتدائی ذہنی اور جذباتی کاوشوں کو محض گوں گے کا خواب بننے سے بچا لیا۔" اب ذرا غور کیجیے کہ اگر زبان وجود میں نہ آئی ہوتی تو ہماری تمام کاوشیں ایک گوں گے کے خواب کی تعبیر کے سوا کچھ نہیں ہوتیں۔ وہ تحریر کی اہمیت کے حوالے سے آگے لکھتے ہیں کہ "ارتقائے لسان کی سب سے اہم منزل وہ تھی جب انسان نے تحریر ایجاد کی کیوں کہ تحریر نے اس کے منہ سے نکلی ہوئی آوازوں کو فضا میں کھو جانے سے بچایا۔ تحریر زبان کا ایک منقش علامتی جسم ہے جسے پا کر وہ جاوداں اور متحرک ہوگئی، خاموشی سے ارتقا کی منزلیں طے کرنے لگی اور آہستہ آہستہ حیات انسانی کے رازہائے سربستہ کے انکشاف کا ذریعہ بن گئی'۔ "مشہور اطالوی عالم ڈاکٹر ڈرنگر نے اسے تہذیب انسانی کی کلید سے تعبیر کیا ہے۔ قفل ابجد کے طلسم کی طرح تحریروں کے پُرسحر نقوش نے انسانی دلوں کے راز کھولنے شروع کر دیے۔ چٹانیں بولنے لگیں، پتھروں اور اینٹوں کے ٹکڑے تاریخ بیان کرنے لگے، معبدوں کے نقوش گیت گانے لگے اور انسان کا ماضی اپنے خول سے نکل کر باہر آ گیا'۔ سید احتشام حسین کمپیوٹر پر اردو کمپوزنگ ہمیشہ سے کئی طرح کے مسائل سے دوچار رہی ہے۔ اس میں ٹیکنیکل، پرسنل، پروفیشنل، یا پھر اس ضمن میں بے توجہی وغیرہ ان تمام وجوہات کی بنا پر اردو کمپوزنگ ایک دشوار کن امر رہا ہے۔ اردو کمپوزنگ کبھی اس طریقے کے مسائل سے دوچار رہی کہ اسے کمپوز کرنے کے لیے کوئی سافٹ ویئر نہیں تھا بعد میں ایک سافٹ ویئر تیار ہوا جو

اردو کے لحاظ سے بہت ہی اچھا اور یہی کیا کم تھا کہ اردو ٹائپ ہو رہا تھا لیکن جب اس کے سامنے ایم ایس ورڈ یا اس طرح کے کسی انگریزی کمپوزنگ کے سافٹ ویئر کو رکھا جاتا تو ایسا لگتا کہ یہ بالکل ناقص ہے، مگر اردو کے لحاظ سے قطعاً ناقص نہیں اور اردو سے محبت کرنے والوں کی انتھک کوششوں سے آج ہمارے پاس انپیج (Inpage) کی شکل میں ایک بہتر اور عمدہ سافٹ ویئر موجود ہے۔ نیز وہی اردو رسم الخط جس میں ہر جگہ، ہر مقام پر اردو میں نہیں لکھا جاسکتا تھا اب اس یہ سہولت ہے کہ ہم جہاں چاہیں وہاں اردو ٹائپ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح پہلے انٹرنیٹ کی دنیا میں ہم اردو نہیں لکھ سکتے تھے۔ اردو میں کسی کو کچھ بھیجنا ہوتا تو وہ پی ڈی ایف کی شکل میں بھیجتا تھا۔ یونی کوڈ کی سہولت سے اب براہ راست کہیں پر بھی اردو میں ٹائپنگ، کمپوزنگ وغیرہ بہ آسانی کی جاسکتی ہے۔ جو کہ ایم بلال ایم کی کاوشوں کی رہین منت ہے۔

انپیج کے حوالے سے اردو کمپوزنگ کی بات کی جائے تو خالص اردو کے لیے انپیج سے بہتر کوئی سافٹ ویئر نہیں۔ پہلے کی بہ نسبت انپیج میں بہت ہی زیادہ بہتری لائی گئی ہے۔ اردو میں اشاعت کے لیے تقریباً تمام پبلشر انپیج کا ہی استعمال کرتے ہیں۔ ایسی کمپوزنگ جس میں گراف، تصاویر، ڈائی گرام وغیرہ ہوں تو پھر انپیج میں اس کے لیے بہت ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بعض لوگ ایسی تحریروں کو ٹائپ نہیں کرتے اور اگر کرتے ہیں تو زیادہ پیسہ لیتے ہیں پھر جب پرنٹ ہو کر وہ گراف، تصاویر، اشکال وغیرہ آتے ہیں تو اس میں وہ پرفیکشن یا فینیشنگ نظر نہیں آتی جو ورڈ میں آتی ہے، کچھ نہ کچھ کمی سی محسوس ہوتی ہے۔ انپیج میں کمپوزنگ کے وقت ایک مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اگر غلطی ہو گئی تو اَنڈو (Undo) صرف ایک بار ہی کر سکتے ہیں جب کہ ایم ایس ورڈ یا اس جیسے دوسرے سافٹ ویئر میں کئی بار انڈو (Undo) کر سکتے ہیں لیکن انپیج میں یہ ایک بڑا مسئلہ ہمارے سامنے ہوتا ہے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے یہ طریقہ اپنایا جاسکتا ہے کہ ڈاکومنٹ کو تب تک محفوظ (Save) نہ کریں جب تک کہ وہ لائن یا پیراگراف مکمل نہ ہو جائے۔ اگر زیادہ انڈو کی ضرورت ہو تو ڈاکومنٹ save کیے بند کر دیں۔ اوپن کرنے پر وہیں سے اوپن ہوگا جہاں تک save تھا۔ اس طرح سے انڈو کی کمی کو پورا کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ مکمل حل نہیں، کیوں کہ کسی وجہ سے سسٹم بند ہو گیا یا بیچ میں اچانک لائٹ چلی گئی تو پوری محنت بے کار ہو جائے گی۔ کہیں سے کوئی ٹیکسٹ کاپی کر کے ڈائریکٹ انپیج میں پیسٹ نہیں کیا جاسکتا ہے اس کے لیے یونی کوڈ ٹو انپیج جیسے کسی سافٹ ویئر یا آن لائن ٹول سے کنورٹ کرنا ہوگا اس کے بعد ہی اسے پیسٹ کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح سے اِنپیج کے کسی مواد کو

دوسری جگہ پیسٹ کرنے کے لیے سب سے پہلے اسے انپیج ٹو یونی کوڈ جیسے ٹولز سے کنورٹ کرنا ہوگا اس کے بعد ہی کہیں بھی کسی جگہ پیسٹ کیا جا سکتا ہے۔ انپیج 3 میں اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پی ڈی ایف میں موجود اردو ٹیکسٹ کو کاپی کر کے پیسٹ کرنے سے نہ متن اپنی اصل حالت میں نہیں رہتا ہے اور نہ ہی اردو فائل کی پی ڈی ایف اصل کی طرح رہتی ہے، کبھی فونٹ سائز کم ہو جاتی ہے تو کبھی الفاظ کٹ جاتے ہیں، جب کہ انگریزی کے ساتھ ایسا مشکل معاملہ نہیں ہے۔ اگر کسی اردو ٹیکسٹ کی اصل کاپی کھو جاتی ہے تو پھر سے پورا ٹائپ کرنا پڑتا ہے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے گوگل ڈرائیو کا سہارا لیا جا سکتا ہے۔ جس فائل کو اردو ٹیکسٹ کی شکل میں کرنا ہے، اسے گوگل ڈرائیو میں اپلوڈ کر لیں چاہے وہ پی ڈی ایف کی شکل میں ہو یا امیج کی۔ پھر اسے اوپن وِتھ ڈاکس کرنے سے وہ تمام ٹیکسٹ جو پی ڈی ایف یا امیج میں ہوں گے سب کے سب ٹیکسٹ کی شکل میں گوگل ڈاکس میں آ جائیں گے۔ بس دقت یہ ہے کہ اس میں درستگی کی شرح (Accuracy Rate) کم ہوتی ہے جب کہ اگر وہی امیج یا پی ڈی ایف انگریزی میں ہو اور اسے ہم ڈرائیو میں رکھ کر ڈاکس کے ساتھ کھولتے ہیں تو تقریبا سو فیصد متن درست شکل میں آئے گا۔ امید ہے وقت اور استعمال کے ساتھ اس میں بھی بہتری ہوگی۔ انپیج کبھی کبھی اوپن ہی نہیں ہوتا ہے یا پھر کبھی کام کرتے کرتے اچانک بند ہو جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب ہم اپنی فائل کو اوپن کرتے ہیں تو ایک دم سے اس کا فونٹ بدل جاتا ہے اور وہ بدل کر کسی ایسی زبان میں ہو جاتا ہے جسے ہم پڑھ نہیں سکتے۔ اس جیسے اور بھی مسائل ہیں۔ اس سے نپٹنے کے لیے کبھی ہم انپیج کی تمام فائلوں کو بند کر کے انپیج بند کر دیتے ہیں اور پھر سے اوپن کرتے ہیں اس سے بھی بات نہیں بنتی ہے تو انپیج آئی کن پر رائٹ کلک کر کے اسے کھولتے ہیں یا پھر پورا سسٹم ری اسٹارٹ کر دیتے ہیں اور اس طرح کی کوشش ہم تب تک کرتے رہتے ہیں جب تک کہ کامیابی نہ مل جائے۔

انپیج کی فائل کسی کو ای میل کرنی ہو تو اس کے لیے بھی کچھ طریقۂ کار/ نکات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ مثلا جس کو ای میل کر رہے ہوں اس کے پاس بھی اسی ورژن کا انپیج ہو تو بہتر ورنہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ الفاظ ٹوٹ جاتے ہیں یا اس شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں جنہیں پڑھنا ناممکن ہوتا ہے۔ جسے فائل بھیجنی ہے اسے بتا دیں کہ انپیج کے کس ورژن کی فائل ہے نیز اس کی ایک پی ڈی ایف بھی ساتھ میں میل کریں۔ چھوٹی چھوٹی کچھ اور بھی چیزیں انپیج میں ہیں جیسے ٹیبل کو پرنٹ کے لیے اس کی سیٹنگ میں جا کر سائز بڑھانی ہوتی ہے یا سنگل لائن کرنا ہوتا ہے۔ انپیج کا دعوی ہے کہ کمپیوٹر میں

اردو کی کتابیں، اشتہارات، اخبارات وغیرہ کی اشاعت کے لیے انپیج سب سے زیادہ استعمال ہوتا ہے اور وہ اس دعوے میں حق بہ جانب ہے۔ انپیج کے اپنے فونٹ ہیں نئے فونٹ اس کے لیے کتنے قابل قبول ہیں آنے والا وقت ہی طے کرے گا۔ انپیج میں اب آٹو کریکٹ (Autocorrect) جیسی سہولت بھی موجود ہے مگر زیادہ استعمال ہونے والے الفاظ کی شارٹ کٹ کی (Shortcut Key) بنانے کی سہولت ابھی نظر سے نہیں گذری۔ اگر شارٹ کٹ کی بنالیں تو اس سے بھی کافی وقت بچے گا اور یوزر فرنڈلی کی جانب انپیج کی ایک اہم پیش رفت بھی ہوگی۔ اشعار وغیرہ کی کمپوزنگ اس کی سیٹنگ وغیرہ کے لیے انپیج بہت ہی موزوں ہے۔ ایم ایس ورڈ کے حوالے سے اگر کمپوزنگ کی بات کی جائے تو جہاں انگریزی کی کمپوزنگ کے لیے ایم ایس ورڈ بہت ہی اچھا سافٹ ویئر ہے وہیں اردو کمپوزنگ بھی اس میں بہت اچھے سے کی جاسکتی ہے۔ ورڈ میں اردو کمپوزنگ کے لیے سب سے پہلے پاک اردو انسٹالر انسٹال کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہی ورڈ میں نستعلیق اردو کمپوزنگ یا ٹائپنگ کی جا سکتی ہے۔ نستعلیق اور فونٹ کے معاملے میں انپیج کا کوئی جواب نہیں مگر وقت کے ساتھ ساتھ ایم ایس ورڈ میں بھی بہت ہی اضافہ ہوا ہے اور اب اس میں بھی نستعلیق فونٹ کے علاوہ مختلف نوعیت کے فونٹ کی سہولت دستیاب ہے۔ کہیں سے بھی من پسند اردو فونٹ انسٹال کیا جاسکتا ہے۔

انپیج کی کسی بھی تحریر کو کاپی کر کے ڈائریکٹ ورڈ میں پیسٹ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ نئے ورژن میں یہ سولت دستیاب ہے لیکن پرانے میں یہ ایک بڑا مسئلہ ہے اس کا حل یہ ہے کہ اسے پہلے کسی کنورٹر میں کنورٹ کریں پھر پیسٹ کریں۔ اگر کوئی تحریر انپیج سے ورڈ میں لے کے جانا ہے تو انپیج ٹو یونی کوڈ کنورٹر سے کنورٹ کرلیں پھر اسے ورڈ میں پیسٹ کریں۔ کنورٹ کرنے کے بعد بھی کئی قسم کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جیسے جس فائل کو کنورٹ کیا گیا ہے اگر اس میں گنتیاں ہیں، رموز و اوقاف ہیں، اعراب ہیں تو یہ سب اپنی اصل حالت میں نہیں رہتے مثلاً 2021 کو 1202 ہونے کا امکان ہے اسی طرح سے (--) یہ بریکیٹ)---(اس طرح سے ہونے کا خدشہ رہتا ہے خدشہ کیا بلکہ ہو ہی جاتا ہے۔ اعراب، رموز و اوقاف بھی الٹ پلٹ ہوجاتے ہیں۔ کنورٹ کی گئی تحریر کو اچھے سے ایک بار پروف ریڈ ضرور کرلیں اور جو کچھ بھی خامیاں، غلطیاں نظر آئیں انہیں دور کریں۔ گراف، اشکال، وغیرہ کنورٹ نہیں ہوتی ہیں تو اسے بنانا یا پھر امیج کی شکل میں لے جانا ایک بہت ہی دشوار کن امر ہوجاتا ہے۔ آپ نے کوئی کتاب ایم ایس ورڈ میں ٹائپ کی ہے تو پبلشرس یہ کہتے ہیں کہ ہمیں انپیج میں چاہیے۔ اسی طرح سے اگر آپ کو اپنا کوئی مقالہ، مضمون کسی جرنل کو اشاعت کی غرض

سے ارسال کرنا ہے تو وہ بھی انپیج فائل ہی مانگتے ہیں ایسی صورت میں اس فائل کو ہمیں کنورٹ کرنا پڑتا ہے۔ آرٹیکل کی حد تک تو ٹھیک لیکن کتاب کو کنورٹ کرنے کا مطلب پھر سے اچھا خاصا وقت لگ جائے گا۔ اس لیے پہلے سے ہی پبلشر سے پوچھ لیں کہ ورڈ فائل میں پرنٹ ہوجائے گا یا انپیج میں ہی لازمی ہے۔ بہت سے ایسے پروفیشنل ہیں جو کمپوزنگ، ٹائپنگ اور کنورژن کا کام کرتے ہیں ان کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہے۔ اردو کی کمپوزنگ اور اشاعت کے لیے زیادہ تر پریس والے انپیج کا ہی استعمال کرتے ہیں اس لیے ایسی صورت میں اپنی فائل کو کنورٹ یا انپیج میں ٹائپ کرنا/کرانا ہی بہتر ہوگا۔ اردو کے معاملے میں انپیج کا پرنٹ شدہ پیج جتنا اچھا لگتا ہے ورڈ کا اتنا اچھا نہیں لگتا ہے شاید یہ اس لیے ہو کہ ایک زمانے سے ہم اسی کو دیکھنے کے عادی ہیں۔ جب کہ اس کے برعکس ورڈ میں بنائے گئے گراف، تصاویر، اشکال وغیرہ بہت ہی اچھی اور دلکش پرنٹ ہوتی ہیں۔ ورڈ کی تحریر کو کہیں بھی کاپی کر کے پیسٹ کیا جا سکتا ہے، جس کی وجہ سے ایک بڑے طبقے کو سہولت ہوگئی ہے۔ آج زیادہ تر اسکالرس جن کو اپنی پی ایچ ڈی تھیسس (Ph.D. Thesis) اردو میں لکھنی ہے وہ ایم ایس ورڈ کو ہی ترجیح دیتے ہیں کیوں کہ اس میں کسی بھی تصویر، ٹیبل، گراف وغیرہ کو بہ آسانی بنایا یا کہیں سے لا کر رکھا جا سکتا ہے۔ اس میں کمپوزنگ کی مختلف سہولتیں جیسے خودکار طریقے سے نمبرنگ، اسٹائل شیٹ وغیرہ بہت ہی مفید اور کارآمد آلات ہیں جن کی مدد سے ہم اپنی تھیسس کو آسانی سے انجام تک پہنچا سکتے ہیں۔ انڈیکس (Index) کی مدد سے فہرست وغیرہ بھی آسانی سے تیار کی جا سکتی ہے۔ سائنس کی اصطلاحات، ریاضی کے فارمولے، اکویشن، کسی بھی طرح کی علامت، اشارے وغیرہ کو بہت ہی آسانی کے ساتھ ایم ایس ورڈ میں لایا جا سکتا ہے اور اس کی مدد سے بہت سے مشکل اشکال کو آسان بنا کر پیش کر کے اپنی سوچ اور تصور کو لوگوں تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اشعار وغیرہ جس انداز میں انپیج میں لکھے جاتے ہیں یہاں بھی لنک کی سہولت سے لکھے جا سکتے ہیں۔

ایم ایس ورڈ میں انگریزی اور اردو ایک ساتھ لکھنا ان کے لیے بڑا ہی دشوار کن مرحلہ ہوتا ہے جو پہلی بار کمپوزنگ کر رہے ہوتے ہیں حتی کہ بعض مرتبہ تجربہ کار لوگوں کو بھی مشکل ہونے لگتی ہے۔ ٹیکسٹ ڈائریکشن اردو کے حساب سے نہیں کیا گیا ہے تو پھر تمام چیزیں الٹ پلٹ ہونے لگتی ہیں مثلاً جو چیز پہلے لکھیں گے وہ بعد میں اور بعد والی پہلے آنے لگے گی اس لیے ضروری ہے کہ ٹائپنگ شروع کرنے سے پہلے ہی اس کی سیٹنگ تبدیل کر لی جائے اور ٹیکسٹ ڈائریکشن کو رائٹ ٹو لیفٹ کر لیا جائے۔ ورڈ میں جب کہیں پر نمبرنگ یا پھر بریکٹ وغیرہ لگائی جاتی ہے تو وہاں پر بھی دقت ہوتی ہے،

بعض لوگ نمبرنگ کے لیے انگریزی کی بورڈ کا استعمال کرتے ہیں اور پھر جب اردو لکھتے ہیں تو اردو کا انتخاب کرتے ہیں جس کی وجہ سے دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور تمام مواد داہنے جانب اور گنتی بائیں جانب ہوجاتی ہے، اس کا حل یہ ہے کہ جس طرح سے اردو لکھ رہے ہوں اسی طرح سے بنا کی بورڈ تبدیل کیے گنتیاں بھی لکھیں تو اس قسم کی دشواری سے بچا جا سکتا ہے۔ جبکہ اصولا ہونا تو یہ چاہیے کہ ایم ایس ورڈ اتنا ایڈوانس ہے اس میں اس قسم کی کوئی دقت ہی نہ آئے، مگر پتہ نہیں کیوں اردو تحریر کرتے وقت اگر ذرا سی بھی غفلت ہوئی تو اس قسم کی کئی ایک دقتیں درپیش ہوتی ہیں۔

انپیج مہنگا ہے اور مشکل سے دستیاب ہونے والا سافٹ ویئر ہے یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر لوگ اس کے استعمال سے واقف نہیں ہوتے اور جب استعمال کرتے ہیں تو کئی طرح کے مسائل ان کے سامنے ہوتے ہیں۔ جب کہ ایم ایس ورڈ زیادہ تر لوگ استعمال کر رہے ہوتے ہیں اور یہ آسان بھی ہے۔ لوگ اس کی سہولتوں کا فائدہ اٹھا کر آرٹیکل اور کتابیں مختلف زبانوں میں ٹائپ کرتے رہتے ہیں اس لیے ورڈ میں اردو ٹائپ کرنے کے لیے زیادہ کچھ سیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ اشاعت کے وقت اکثر پریس والے انپیج فائل ہی مانگتے ہیں جس کی وجہ سے رائٹرس کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور پھر ایک لمبے مرحلے اور وقت سے گذر کر وہ کتاب انپیج میں منتقل ہو پاتی ہے۔ ادبی مقالوں کے علاوہ دوسرے میدان کے اسکالرس جیسے ایجوکیشن، سماجیات، معاشیات، سیاسیات جن کو مختلف طرح کے ڈاٹا، گراف، تصاویر وغیرہ کے ساتھ کام کرنا ہوتا ہے ان کے لیے ایم ایس ورڈ بہتر اور مناسب ہے۔ جب کہ وہ افراد جو ادبی کتابیں، مقالے وغیرہ تحریر کرتے ہیں جن میں تصاویر، گراف وغیرہ کی ضرورت بہت کم ہوتی ہے ان کے لیے انپیج بہتر ہے۔ غرض کہ انپیج اور ورڈ دونوں میں اردو ٹائپنگ کے حوالے سے کچھ نہ کچھ مسائل ہیں جن میں سے کچھ کے حل اور متبادل بتائے جا چکے۔ ٹکنالوجی کے ماہرین اور اس میدان میں کام کرنے والے اداروں کو اس ضمن میں توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ آج ایک بڑے علمی طبقے، اداروں، اسکالرس کو اردو کمپوزنگ کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے انپیج اور ایم ایس ورڈ پر اردو کے حوالے سے مزید کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ آج جو لوگ اس کا استعمال کر رہے ہیں ان کو کسی طرح کے مسائل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ انپیج اور ایم ایس ورڈ پر اردو کمپوزنگ میں اصلاح اور بہتری کے حوالے سے کام کوئی ایک شخص نہیں کر سکتا بلکہ ماہرین کی پوری ٹیم اداروں کی مدد سے کر سکتی ہے، جس میں مزید تاخیر بالکل بھی مناسب نہیں۔

☆☆☆

Niswaniyat ya Tanisiyat:Ek Tahqiqi Jaeza by Dr.Rafia Wali(Sopore Jammu&Kashmir)cell-6005820229(BANAT)

ڈاکٹر رافعہ ولی (سوپور، جموں و کشمیر)

نسوانیت یا تانیثیت : ایک تحقیقی جائزہ

عورت بحیثیت انسان فطرت کی اس حسین اور وسیع کائنات میں اپنی ذات کا ادراک چاہتی ہے یہ ادراک اسے ہر دور میں صلب ہوتا گیا حد تو یہاں تک کہ اکثر مذاہب میں بھی اسکے وجود کی اہمیت مرد کے تئیں خلوص و وفاداری کے پیمانوں سے ہی ناپی گئی ہے۔علم کے دروازے اس پر بند کئے گئے تو وجود ذات کا تصور بھی بند ہوتا گیا۔

ہمارے یہاں نسوانیت اور تانیثیت کو ایک ہی معنی میں لیا جاتا ہے۔ جبکہ نسوانیت کا مطلب ایسی خصوصیات ہیں جو عورت کو مرد سے جدگانہ روپ عطا کرتی ہیں۔ یہ خصوصیات حیاتیاتی بناء پر ایک عورت کو تفویض ہوئی ہیں۔ اس حیاتیاتی ساخت پر عورت کے اندر جو جذبات و احساسات پنپتے ہیں جن کا اظہار وہ اپنے انداز سے کرتی ہے وہ نسوانیت کہی جاسکتی ہے۔ایک عورت بطورِ فرد کے جو شناخت رکھتی ہے وہ نسوانیت ہے۔اسکے اپنے انفرادی تجربات اسکے ادراک اور اسکی وہ حس ہے جو اسکو مرد سے مختلف روپ عطا کرتی ہے۔ایک مرد میں بھی کبھی نسوانیت کی کچھ جھلک مل سکتی ہے مگر حسِ ادراک کا کُلّی طور پر جب نسوانی ہیت لیے ہوئے ہو تو ہم کہہ سکتے کہ یہ نسوانیت ہے۔ کیونکہ ایک مرد عورت کی طرح محسوس نہیں کرسکتا لیکن کہیں ہم یہ بھی دیکھتے کہ کچھ مردوں میں خارجی طور پر کچھ ایسی خصوصیات ہوتی ہیں جیسے زیادہ بننے سنورنے یا اٹھلا کر بولنے کی عادت یا نزاکت ہو تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ نسوانیت کا ایک پہلو اس مرد میں بھی ہے اسی طرح کچھ عورتوں میں بھی مردانہ ہارمونز کی وجہ سے چہرے پر داڑھی کی طرح بال اُگتے ہیں یا قوت کے اعتبار سے وہ مردوں کے مشابہ ہوتی ہیں۔ یہ مشابہت جزوی اور خارجی ہوسکتی ہے لیکن جہاں تک احساسات و ادراک کی بات کی جائے وہاں عورت کے احساسات الگ اور مرد کے الگ ہوتے ہیں۔عورت مادہ ہے اس مادے کی طبعی جو خصوصیات ہیں ان خصوصیات کا نام ہی نسوانیت ہیں۔ یہ الگ اور مختص ہیں۔جسمانی نسوانی ساخت ہی اسکو مرد سے جدا روپ عطا کرتی ہوئی ایک فطری امتیاز عطا کرتی ہے۔قاضی افضال فرماتے ہیں کہ

:

''عورت کے جسمانی فرق کے سبب وہ مادے یا مادی دنیا سے مرد کے مقابلے میں زیادہ مربوط ہوتی ہے...... مادہ ہی ایک عورت کو عورت بناتا ہے اسے ایک شخصیت دیتا ہے اور اس کے تجربات کو مرد کی فکر اور اس کے تصورات سے مختلف بناتا ہے۔''

عورت اس وسیع کائنات میں جب اپنے او پر روار کھے گئے سلوک کا جائزہ لیتی ہے تو سماج کے جتنے بھی ادوار ہیں ان سب میں وہ اپنے آپکو کبھی آزاد محسوس نہیں کرتی اسکی زندگی کے تمام حوالے مرد کے ہی مرہونِ منت نظر آتے ہیں۔ اسکی سوچ اور اسکی ذات کی ہر جگہ نفی ہوتی ہے وہ اپنے زنانہ پن کو اسی عزت و احترام سے دیکھنا چاہتی جس طرح ایک مرد کو حاصل ہے۔ لیکن عورت ایک طویل عرصے سے مظلوم چلی آرہی تھی جب اسکی مظلومیت اس حد تک پہنچ گئی کہ وہ ایک عظیم ماں بن کر ایک اچھی بیوی ہو کر بھی سماج میں اپنی ناقدری دیکھتی ہے۔ اور اپنی تمام ذمہ داریوں کو جو اسکے سر تھوپ دی گئی نبھاتی ہے مگر اسکی عظمت کا نہ تو اعتراف ہوتا اور نہ ہی بحیثیت فرد اسکو پنپنے کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ تو ایسی صورت میں ایک ذی حس ہونے کے ناطے اس سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ اپنی اس ناقدری کا جائزہ لیں اور اپنے او پر روار کھے گئے ظلم و استحصال پر غور کرے۔ اپنی اس روایتی امیج سے باہر نکل آئے جس میں تمام خواہشوں اور امیدوں کا مرکز ایک مرد کو سمجھتی ہوئی اپنی نسوانیت کی توہین کرتی ہے یہ ناقدری جب اسکو بے چین کر دیتی ہے تو اسکے اندر ایک ایسا جذبہ پنپتا ہے جس میں ان سماجی اور تہذیبی روایات سے انحراف نظر آتا ہے۔ اس دوران اسکو کن مشکلات اور مصائب کا سامنا رہتا ہے۔ اس تمام کیفیات کو ہم تانیثیت کہہ سکتے ہیں جس میں ایک عورت اپنی نسوانیت کی بحالی کے لئے کوشاں ہوتی ہیں۔ یہ کوشش پہلے ذات تک محدود تھیں اور رفتہ رفتہ فرد سے سماج تک ایک تحریک کے شکل میں ہمارے یہاں نمودار ہوئی ہے۔ بقولِ حمیرا سعید:

''دباؤ، خوف، ڈر کے سائے تلے اپنی خواہشات، آرزوؤں اور احساسات کو کچل کر وہ جینے لگی لیکن مردانہ سماج میں اس کا بے انتہا استحصال کیا جانے لگا اور وہ دوسروں کے حسبِ منشاء زندگی گزارتے گزارتے گھٹن محسوس کرنے لگی اس کے اندر احتجاج اور انحراف کے جذبات ابھرنے لگے۔''

عورت محسوس کرتی ہے سماج میں اسے کسی شئے پر اختیار نہیں۔ شادی سے لیکر طلاق تک، بچوں کی پیدائش سے لیکر انکی کفالت تک وہ اپنے وجود کو کہیں نہیں پاتی اسے موقع پر ایک احتجاجی رویہ اسکے اندر سر اُبھارنے لگتا ہے یہ احتجاج ذاتی طور پر جب اجتماعی شکل اختیار کرتا ہے تو ایک تحریک

بن جاتی ہے اوراس تحریک کوہم تانیثیت یاFeminism کا نام دیتے ہیں۔

اس تحریک کا مقصد و مدعا یہی ہے کہ جب فطرت نے مرد اور عورت کو تخلیق ہی اس لئے کیا کہ ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل ہو۔عورت معاشرے کی تشکیل میں مرکزی کردار یعنی تخلیقی کردار نبھاتی ہے لیکن مرد جسمانی طاقت کی بنیاد پراس پر قافیہ حیات تنگ کرتا ہے معاشرے کو اپنی مرضی ومنشا ء کے مطابق تشکیل دیتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ تحریک ابھر کر ان تمام تہذیبی و اخلاقی روایات پر کاری ضرب لگاتے ہوئے عورت کے وجود کی نئے سرے سے تشکیل کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ بقول قاضی افضال حسین:

''معاشرے کی تشکیل کے لئے عورت اور مرد دونوں ضروری ہیں۔لیکن بیشتر معاشروں میں مرد اور عورت کا یہ تعلق ترجیحی نوعیت کا ہے یعنی مرد ایک طاقت ور فاعل، حاکم اور معاشرے میں اقتدار کا ماخذ اور منصرم ہے۔ جبکہ عورت کمزور، محکوم اور معاشرے کی مرکزی ضرورتوں کو پورا کرنے والی ہے۔ تانیثیت کی سیاسی اور سماجی تحریکات کے لئے یہ غیر مساوی معاشرتی، معاشی نظام ہی ان کی جدوجہد کا اصل موضوع ہے۔''

یعنی اب یہ کہا جاسکتا کہ نسوانیت یا زنانہ پن عورت کا تشخص ہے بحیثیت فرد اسکی پہچان ہے۔قدرت نے بچپن سے لیکر جوانی تک اور جوانی سے لیکر بڑھاپے تک جو تغیر و تبدیل عورت کے جسم میں برتا ہے۔ وہ فطرت کا عطیہ ہے جسکو عورت بقائے نسل کے لئے اپنے وجود میں بخوشی قبول کرتی جاتی ہے۔ وہ مرد کی طرح جسمانی طور پر قوی نہیں ہوتی مگر اپنی کوکھ میں مرد کو رکھ کر اسکو جَن کر جس مشقت و تکلیف کا احساس کرتی ہے تو دنیا کا قوی سے قوی مرد بھی اس درد اور تکلیف کا ادراک نہیں کرسکتا لیکن سماج نے پلٹا یوں کھایا کہ عورت کے زنانہ پن کو اس کے جذبات و احساسات کو بحیثیت فرد اسکی رائے اور اسکی طلب کو مرد نے کہیں مذہب کا تو کہیں سماج کا سہارا لیکر اپنے آپ کو عورت کے زنانہ پن کا رکھوالا سمجھ لیا۔عورت کے جسمانی روپ کو اسکی کمزوری بنا کر اسکو اپنے زیر نگراں رکھا۔ وہ جسمانی خواہشات سے لیکر ذہنی افکار تک ہر ایک شئے میں اس پر حاوی ہوتا گیا۔کئی مذاہب میں عورت کی بلوغیت کو جب اس پر نسوانیت کے آثار نظر آنے لگتے ہیں تو اسکو مرد کی نگرانی میں باقاعدہ دیا جانے لگا جہاں اسکی نسوانی خدوخال کو اسطرح چھپائے رکھنے اور حفاظت کرنے کے بہانے تراشے گئے کہ بے چاری کو اپنے وجود پر ہونے والے تغیرات سے ہی نفرت محسوس ہونے لگی وہ بلوغت کو اپنے لئے وبالِ جان سمجھنے لگی اب اس پر کپڑوں کے ایسے تھان لٹکا دیے جاتے ہیں کہ اسکو سانس لینا بھی

محال ہوجاتا ہے۔مرد کی ہوس بھری نظروں سے بچنے کے لئے کہیں اس پر گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی جاتی ۔اگر کہیں نکل بھی گئی تو تمام بدامنی اور بداخلاقی کا ذمہ دار اسکی نسوانیت کو ہی گردانا جاتا ہے۔صدیوں سے آج تک مرد کی نہ باز پرس ہوئی اور نہ ہی اسکی ہوس کے لئے ایسے تالے بنے جن سے اسکو مقفل کیا جاسکے۔ساری بندیشیں اور سارے مفروضات صرف نسوانیت کے حوالے سے ہی ہیں۔تانیثیت ان تمام مفروضات اوران تمام بندشوں کو بے بنیاد گردانتا ہے جن کی رو سے عورت کو کمزور، ناتواں اور صنفِ نازک کہہ کر استحصال کوروا رکھا جاتا ہے۔

نسوانیت عورت کی سوچ ہے اسکا پرتو ہے اس سوچ پر ہر وقت معاشرے کی قدغن لگتی ہے۔ زنجیریں جکڑتی ہیں ان زنجیروں کوتوڑنے کا نام تانیثت ہے۔'تانیثیت' عورت کی بازیافت کا نام ہے ۔نسوانیت کوتحقیر آمیز رویے اوراستحصال کا سامنا رہا ہے،نسوانیت کو جہاں شکر،صبر،ایثارنرم دلی، رفیق القلبی سے جوڑ دیا جاتا ہے۔تو وہیں تانیثت ، احتجاج ، ہمت ، حوصلے اور ولولے کا نام ہے جس کے ذریعے ایک عورت اپنے اُوپر رکھے گئے ظلم و جبر کو دلائل کے ساتھ بے بنیاد قرار دے سکے اور اپنے لئے بحیثیت فرد ایسی دنیا قائم کر سکے جہاں اسکی اپنی فکر، اپنی سوچ اور اپنی ذات کا ادراک ہو۔کیونکہ اب تک نسوانیت کو ایک کمتر درجے کی نوعیت دے کر بدرسری معاشرے کے جو اصول اپنائے گئے وہ خودساختہ تھے۔بدرسری سماج نے نسوانیت کے متعلق جوتصورات قائم کئے تھے انکو پروفیسر عتیق اللہ کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوتا ہے۔

ا۔عورت بمقابلہ مرد کے ایک کمزوراورنازک جنس ہے۔

۲۔عورت اورمرد کے مابین ایسی مخصوص حیاتیاتی عضویت کی تفریق ہے جس کی بنیاد پر انہیں دوعلاحدہ خانوں اور درجوں میں رکھا جانا ضروری ہے۔

۳۔مُروج صنفی تقسیم کے مطابق مرد وعورت کی کارکردگی جتنی کہ پیشہ ورانہ کارکردگی کے دونمایاں درجات ہیں اگر مرد کا درجہ اوّل ہے توعورت کا دوم اسی نسبت سے وہ دوسرے درجے کی شہری ہوئی اور اس کی ملازمت پیشے اور کام بھی مخصوص بلکہ ثانوی درجے کے ٹھہرے۔

۴۔اعصابی اور جسمانی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ ذہنی اور عقلی سطح پر بھی دونوں اجناس، دومختلف حدود کی نمائندگی کرتے ہیں۔

۵۔جذباتی، احساسی اور احساساتی سطح پر بھی دونوں کے دائرے عمل میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

۶۔عورت ایک قابل رحم اور مجبور صنف ہے جسے ہمیشہ مردوں کے دستِ شفقت اور پناہ کی ضرورت

ہے۔

۷۔مذہبی، اخلاقی، سیاسی اور سماجی سطحوں پر مرد اور عورت کے حقوق و فرائض کے درجے مختلف ہیں وہ کہیں داسی ہے، کہیں کنیز، کہیں کٹھ پتلی، کہیں ملکیت، کہیں نگڑ ودھو گویا وہ ایک جنس یا شئےCommodity یا طبقے کی طرح ٹائپ اور تابعداری جس کی تقدیر۔

'تانیثت' ان تمام اصولوں پر کاری ضرب لگاتے ہوئے ایک ایسے شعوری عمل کی خواہاں ہے۔جس سے مرد اور عورت کو خانوں میں بانٹنے کے بجائے ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم قرار دیا جائے۔تانیثیتی تحریک اُن تمام بنیادی تصورات کو رد کرتی ہے جو مرد اساس معاشرے کی تشکیل چاہتی ہے۔

نسوانیت اگر زنانہ پن اور اسکی مجملہ خصوصیات کا نام ہیں تو تانیثیت اس زنانہ پن کے ساتھ روا رکھے گئے غیر فطری رویے کے خلاف احتجاج کا نام ہے، دنیا کے خطے میں جہاں کہیں عورت کا وجود ہوگا اس میں کم وبیش جنسی خصوصیات ایک جیسی ہی ہونگیں جس سے وہ اپنے مخالف جنس مرد سے مختلف نظر آتی ہے۔لیکن اس اختلاف کو ایک جنس نے اپنے لئے برتر مانا تو دوسری جنس پر اس نے اپنا اقدار اور تصرف مسلط کر دیا ہے۔عورت اس تسلط کو کئی دہاہیوں سے رد کرتی آئی ہے اور اپنے وقار کی بحالی چاہتی ہے اس جدوجہد کے لئے جو تحریک سرگرم ہے اس تحریک کا نام تانیثیت ہے۔

☆☆☆

Kashmir mein Arabic Zaban-o-Adab by Ruqaiya Fazil(Contractual Lec. Arabic,Govt.degree college,Handawara,J&K)cell-9149436716

ڈاکٹر رقیہ فاضل (کانٹریکچول لکچرر،شعبہ عربی،گورمنٹ ڈگری کالج،ہندواڑا،جموں وکشمیر)

کشمیر میں عربی زبان وادب

عربی زبان سامی زبانوں میں سب سے بڑی زبان ہے جو عبرانی اور آرامی زبانوں سے بہت ملتی ہے اس زبان کا شمار دنیا کی سب سے بڑی زبانوں میں ہوتا ہے۔انگریزی وفرانسیسی زبان کے بعد عربی دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔اور ستائیس مما لک کی سرکاری زبان ہے۔قرآن اور اس کے قواعد ہی اس زبان کی بنیاد سمجھے جاتے ہیں قرآن کی عربی ہی دراصل ادبی عربی ہے جس کو Classical Arabic کہتے ہیں۔

موجودہ دور کی ایجادات نئی نئی چیزوں کی آمد اور ان کا استعمال اور ان کے نام جو عربی زبان سے ماخوذ ہے عربی میں استعمال ہو کر کچھ مختلف ہو گئے جیسے جب ہوائی جہاز آیا تو اس کو عربی کے قریب لانے کیلئے پرندہ یا اڑنے والی چیز سے موسوم کیا گیا اور طیارہ بنا دیا گیا مگر بعض الفاظ جیسے عربی میں ٹیکنیک کا کوئی بدل نہ ملا تو تیکنیک بنا کر استعمال کر لیا گیا ٹیلیفون کو ہاتف بنا دیا گیا اس لئے ہاتف کا عربی میں مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسی آواز جو بہت دور سے آ رہی ہو مگر اس کا بولنے والا دکھائی نہ دے اور فون میں ہی کچھ ہوتا ہے۔الغرض ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔یہی زبان آج کل جدید عربی یا پھر بین الاقوامی طور پر Modern Arabic کہلاتی ہے۔اور یہی زبان ٹیلی ویژن،خبروں اور عام بول چال میں استعمال ہوتی ہے۔

عربی زبان کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۸ ردسمبر ۱۹۷۳ء کو اپنی سرکاری زبانوں میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا اور ۱۹ رفروری ۲۰۱۰ء کو اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے یونیسکو نے انسانی تہذیب اور ثقافتی ورثے کو محفوظ رکھنے میں عربی زبان کے اہم کردار کو تسلیم کرتے ہوئے ۱۸ ردسمبر کو اس زبان کا عالمی دن قرار دیا اور ۱۸ ردسمبر ۲۰۱۲ء کو پہلی مرتبہ عربی زبان کا عالمی دن منایا گیا اس کے بعد عرب مما لک کے علاوہ پوری دنیا میں ۱۸ ردسمبر کو عالمی یوم عربی منایا جانے لگا اور یونیسکو کے ہی مطابق آج عرب دنیا میں بیالیس کروڑ بیس لاکھ سے زیادہ کی مادری زبان عربی ہے اور دنیا بھر سے

تعلق رکھنے والے ڈیڑھ عرب سے زیادہ مسلمان عربی زبان کو کسی نہ کسی شکل میں استعمال کرتے ہیں۔

اسی طرح کشمیر میں عربی زبان کی اہمیت کو اجاگر کرنے اور فروغ دینے کے حوالے سے جہاں یہاں مدارس و جامعات کا رول ہے وہی یہاں کے علماءواسکالرس بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔علماء کرام میں علامہ انور شاہ کشمیری کا نام سب سے پہلے لینا مناسب سمجھتی ہوں جنہوں نے عربی زبان وادب کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ علمی واسلامی خدمات بھی انجام دی۔علامہ سید سلیمان ندوی نے شاہ صاحب کی وفات پر لکھا انکی مثال اس سمندر کی سی تھی جس کی اوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قدر خزانوں سے معمور ہوتی ہے، وہ وسعت نظر، قوت حافظہ اور کثرت حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے۔

علوم حدیث کے حافظ اور نکتہ شناس، علوم وادب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعروسخن سے بہرہ ور اور زہد وتقویٰ میں کامل تھے۔مصر کے مشہور زمانہ عالم سید رشید رضا صاحب جب دیوبند تشریف لائے اور شاہ صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی تو بے ساختہ بار بار کہتے رہے (**واللہ ما رأیت مثل ھذا العالم الجلیل**) اللہ کی قسم میں نے اس جیسا جلیل القدر عالم نہیں دیکھا انہوں نے مصر جاکر اپنے رسالہ ''المنار'' میں علامہ کی جلالت علمی وعظمت شان کا اعتراف کیا۔

قرآن مجید عربی زبان کے بنیادی سرچشموں میں سے ایک ہے اس لئے عربی ادب سے علمائے کشمیر کی خدمات کا تابناک گوشہ ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کی تفسیر وغیرہ میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیا جس کی سعادت اللہ نے پروفیسر مظفر حسین ندوی کو عطا کی ان کی حال ہی میں قرآن مجید کی تفسیر منذر عام پر آئی جو کہ اپنی مثال آپ ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ یہ تفسیر اصل میں مولانا معین الدین نقشبندی کی تھی جو کہ بہت مختصر اور لفظ بہ لفظ تشریح پر مبنی تھی جس کو میں نے Elaborate کرکے ۱۴رسال میں مکمل کیا۔پروفیسر مظفر صاحب کا کہنا ہے کہ اتنی ضخیم عربی تفسیر آج تک نہیں لکھی گئی اس میں جو اہم چیز ہے وہ یہ کہ یہ تیس تفاسیر کا نچوڑ ہیں۔

اس تفسیر میں جس بات پر زور دیا گیا ہے وہ Arabic Language ہے تاکہ جو طالب علم یا اسکالر اس کو پڑھے گا اس کو عربی Vacabalary کے ساتھ ساتھ گرامر بھی ٹھیک ہوگا۔کسی بھی زبان کی نشر واشاعت میں رسائل وجرائد اور مجلّات کی خدمات سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی تو جہاں تک بات عربی زبان کی ہے اس معاملے میں بھی کشمیر شروع ہی سے درخشندہ وتابندہ

رہا ہے۔ملک کے مختلف ریاستوں کی طرح یہاں بھی عربی زبان کا بین الاقوامی سطح پر ماہنامہ ''مجلة التلمیذ'' کے نام سے ہے جو کہ بین الاقوامی سطح پر اپنی جگہ بنانے میں کامیاب نظر آرہا ہے جس کے چیف ایڈیٹر ڈاکٹر معراج الدین ندوی صاحب ہے جو خود بھی بحیثیت لکچرر عربی زبان وادب کی تدریس سے منسلک ہے۔

غرض کہ ان وسائل وذرائع کے مدد وتعاون سے عربی زبان کے فروغ کیلئے خدمات انجام دیئے جارہے ہیں۔

☆☆☆

William Wordsworth ki Shairi mein Romanvi Anasir by Dr.Suraj Kumar(Asst.Prof. Dept. of Urdu NMSN Dass P.G.College Badaun MJP Rohilakhand University) cell-8005145710, 7503565910

ڈاکٹرسورج کمار(اسسٹنٹ پروفیسر،شعبہ اردو، این ایم ایس این داس پی جی کالج ، بدایوں)

ولیم ورڈسورتھ کی شاعری میں رومانوی عناصر

رومانویت(Romanticism) کی کوئی مخصوص و متعین تعریف نہیں ملتی ۔اس کا استعمال اٹھارہویں صدی میں یورپ کے مختلف اسکالروں کے ذریعے مختلف معنی میں کیا گیا۔دراصل اس لفظ کا استعمال ایک ایسے رجحان کے لئے کیا گیا جو کلاسکیت اور نو کلاسکیت کے ردعمل کے طور پر وجود میں آیا۔کلاسکیت اور نو کلاسکیت نے ادب کو مخصوص اصول وضوابط میں جکڑ رکھا تھا نیز اس کے لئے مختلف طرح کی پابندیاں عائد کردی گئی تھیں ۔رومانویت اسی کے ردعمل کے طور پر ظہور پزیر ہونے والا رجحان تھا جو ادب کو اس نوعیت کی پابندیوں سے آزاد کرانے میں کافی معاون ثابت ہوا۔دنیائے ادب میں لفظ Romantic کا استعمال پہلی مرتبہ جرمن شاعر Friedrich Schlegal نے بطور اصطلاح کیا۔درحقیقت انہوں نے اس لفظ کا استعمال ان ادبیات کے لئے کیا جن میں حسن و عشق کے موضوعات کو خوبصورت خیالات میں پیوست کر کے پیش کیا جاتا تھا ۔ویسے تو ادب کے ضمن میں اس لفظ کا استعمال پہلی دفعہ ۱۷۸۱ء میں وارٹن اور بہرڈ نے کیا۔ ۱۸۰۲ء میں گوئٹے اور شلر نے بھی اسے ادب سے جوڑ کر دیکھا مگر یہ لوگ اسے ایک ادبی اصطلاح کے روپ میں رائج کرنے سے قاصر رہے۔ان میں سے کسی نے بھی اسے ایک ادبی اصطلاح کی شکل دینے میں کامیابی حاصل نہ کی ۔Victore Hugo نے آزادی خیال کو رومانویت کا مرکز ومحور تسلیم کیا ہے۔ان کے اس فقرہ "Liberalism in Literature" پر اگر ہم نظر ڈالیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رومانویت ادب میں آزادی کا خواہاں رہی ہے۔تخیل آرائی،جذباتیت،اور آزادی رومانویت کے اہم پہلو ہیں۔آیئے رومانویت کے چند اور پہلوؤں پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں جن کے ذریعہ رومانویت کو سمجھنا آسان ہوجائے گا۔

(۱)ذاتی جذبات کی ترجمانی (۲) آزادی خیال پر زور(۳)روایت سے بغاوت(۴)فطرت کی

طرف مراجعت (۵) ہیت کی طلسم شکنی (٦) ماضی کا احیا (۷) حسن پرستی

ولیم ورڈس ورتھ: (William Wordsworth)

مشہور رومانوی شاعری ولیم ورڈ سورتھ ۷ اپریل ۱۷۷۰ء کو کمبر لینڈ، انگلینڈ میں پیدا ہوئے۔ جب وہ محض سات سال کے تھے اسی دوران ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اور جب وہ ۱۳ سال کے ہوئے تو ان کے والد نے بھی اس دنیائے فانی کو الوداع کہہ دیا اور وہ ایک یتیم کی زندگی گزارنے لگے۔ ان سب کے باوجود انہوں نے Howkshead Grammar school سے تعلیم حاصل کی اور یہیں سے انہوں نے اپنی شعری زندگی کی ابتدا کی اور کیمبریج یونیورسٹی میں داخلہ کے بعد اس کو اور تقویت ملی۔ ۱۷۹۰ء میں وہ فرانس گئے اور جب فرانس سے واپس آئے تو انیٹی ویلون کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ مگر جلد ہی ان دونوں کے درمیان قطع تعلقات ہو گیا۔ ۱۷۹۵ء میں وہ اپنی چھوٹی بہن ڈورتھی کے ساتھ رہنے لگے۔ اسی سال ان کی ملاقات کالریج سے ہوئی اور دونوں کی دوستی ہو گئی اور دونوں کی مشترکہ ذہانت نے "Lyrical Ballad" کو جنم دیا۔ اس مجموعہ کلام میں شامل کالریج کا "The Rime of the Ancient Mariner" اور ورڈس ورتھ کا "Tintern Abbey" نے انگریزی ادب میں رومانیت کی راہ ہموار کی۔ اسی دوران انہوں نے اپنی دیگر نظمیں "The Pralude" اور "Lucy" بھی لکھی جو ان کی زندگی کا عکس پیش کرتی ہیں۔ جلد ہی "Lyrical Ballad" کا دوسرا ایڈیشن منظر عام پر آیا جس کے پیش کلام میں انہوں نے شاعری کو جذبات کی پیدائش قرار دیا۔ ۱۸۰۰ء سے ۱۸۰۳ء کے درمیان انہوں نے میری ہوچینسان سے شادی کر لی جس سے ان کی پانچ اولادیں ہوئیں۔ اور اسی دوران ان کی مشہور نظمیں "I wondered lonely as a cloud" اور "Ode :Intimation of immortality" بھی ان کے شعری مجموعہ "Poems in Two Volumes(1807)" میں شائع ہوئی۔ زندگی کے آخری پڑاؤ میں وہ لیک ڈسٹریکٹ چلے گئے اور وہیں اپنی فیملی کے ساتھ زندگی کی آخری سانس لی۔ ۲۳ اپریل ۱۸۵۰ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ولیم ورڈس ورتھ کی شاعری کی خصوصیات: ولیم ورڈس ورتھ انگریزی ادب کے مشہور و معروف شاعر و ادیب ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے ہی اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ ان کا فقرہ "Poetry is the spontanious overflow of powerful feelings" انگریزی ادب میں رومانیت کا مینی فیسٹو ثابت ہوا۔ اگر ہم ان کی شاعر کا جائزہ لیں تو ہمیں مندرجہ ذیل خصوصیات دیکھنے کو ملتی ہیں

جوان کو ایک رومانوی شاعر بننے میں اہم رول ادا کرتی ہیں:

(۱)Imagination(تخیل)

دیگر رومانوی شعراء و ادباء کی طرح ان کے یہاں بھی تخیل آرائی دیکھنے کوملتی ہے۔اپنے خیالوں کے ذریعے وہ خوابوں کی خوبصورت دنیا آراستہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان کی مشہور نظم "Ode Intimation of immortality" میں اس کی بہترین جھلکیاں دیکھنے کوملتی ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

"There was a time when meadow and stream
the earth and every common sight
to me did seem
apparelled in celestial Light "

علاوہ ازیں اس نظم میں خیالوں کے سانچے میں بنائے گئے تصویروں کا عکس بھی دیکھنے کوملتا ہے۔

"The Rainbow come and goes
And lovely is the Rose
The Moon doth with delight
look around her when the Heavens are bare"

اس نظم میں شاعر قدرت کو ایک عظیم طاقت کے روپ میں محسوس کرتا ہے اور فطرت کے خوبصورت مناظر شاعر کے بے قرار دل کو قرار عطا کرتے ہیں۔ورڈس ورتھ فطرت کے ان خوبصورت مناظر کو اپنے خیالوں میں نہ صرف دیکھ سکتے ہیں بلکہ اس کے وجود کو محسوس کر سکتے ہیں جب وہ اس سے دور ہوتے ہیں۔وہ کہتے ہیں:

"In lonely rooms and mid the din
of town and cities,I have owed to them
In hours of weariness sensational sweet "

(2) Nature (فطرت) ورڈس ورتھ انگریزی ادب میں شاعر فطرت کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ان کی بیشتر شاعری میں فطرت ایک ماں اور رہبر کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ان کی نظم "Lucy" اس کی خوبصورت مثال پیش کرتی ہے۔بالفاظ دیگر ہم انہیں فطرت کا پرستار کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔Cazamian ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"To Wordsworth ,nature appears in a formative influence superior to any other ,the educator of senses or mind alike,the shower in our hearts of the laden seeds of our

ورڈس ورتھ کوفطرت کے آغوش میں زندگی گزارنا بہت پسند تھا کل کل کرتی ہوئی ندیاں اور آبسار سے پیدا شدہ نغمگی ان کے دل کوسکون عطا کرتی تھی۔ وہ قدرت کو ایک عظیم طاقت کے روپ میں دیکھتے ہیں اور اس کا مظاہرہ انہوں نے اپنی نظم "Titern Abbey" میں کیا ہے۔اس نظم میں انہوں نے ماضی کی گمشدہ یادوں کی بڑی حسین ودلکش تصویر کشی کی ہے۔

"Memory be as a dwelling place
for all sweet sounds and harmonies
if solitude or fear or pain or grief
should be thy portion,with what healing thoughts
of tender joy wilt thou remember me
and there my exhortations"

ورڈسورتھ کہتے ہیں کہ فطرت اسے کبھی دھوکا نہیں دے سکتی جو اس سے محبت کرتے ہیں۔

Subjectivity(3) ذاتی جذبات کی ترجمانی رومانیت کی اہم خصوصیات ہے اور ولیم ورڈس ورتھ کے یہاں بڑی فراوانی کے ساتھ دیکھ نے کو ملتی ہیں۔وہ اپنی نظموں کے ذریعے اپنے جذبات،خیالات اور محسوسات کا اظہار کرتے ہیں۔ Ode:Intimation of Immortality وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"It is not now as it hath been of yore
turn wheresoe'er I may
by night or day
The things which I have seen
Inow can seen or more"

Pantheism and Mysticism(4: اس دور کی نیچرل شاعری اس کے بغیر نامکمل تھی

ورڈس ورتھ یہ تسلیم کرتے تھے کہ قدرت کے رگ رگ میں ایک الہامی طاقت وڈرتی ہے۔فطرت کا ذرہ ذرہ اس عظیم طاقت کا مظہر ہے۔طلوع آفتاب ان کے لیے ایک نئی زندگی کی علامت بن جاتا ہے۔اورڈھلتی ہوئی شام میں انہیں زندگی کی شام نظر آتی ہے۔

"And the round ocean and the living air
And the blue sky and in the mind of man
A motion and a spirit, that impulse
All thinking things"

یہ ساری خصوصیات ہے جن کی بنا پرہم ولیم ورڈسورتھ کوایک رومانی شاعر کہہ سکتے ہیں۔

☆☆☆

Hamid Akmal ki sheri kavishein by Dr. Mufti Mohd. Sharfe Alam
(Asst.Prof. Dept.of Arabic MANUU, Hydrabad)cell-9705610569
ڈاکٹر مفتی محمد شرف عالم (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ عربی، مانو، حیدرآباد)

حامد اکمل کی شعری کاوشیں

گلبرگہ شہر زمانہ قدیم سے علم و ادب کا مرکز رہا ہے۔اس شہر میں گولکنڈہ، حیدرآباد، بیجاپور اور اورنگ آباد کی طرح علمی و ادبی اور ثقافتی تہذیب رہی ہے، محبتوں اور رواداری اور انکساری اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔ ادب وصحافت کی بہت طویل تاریخ ہے۔ یہ صوفیوں کا مسکن ہے ۔ایسے صوفی جو شعر و ادب کے سخنور تھے اور انسانی قدروں کے ہمنوا۔اس علمی شہر میں حامد اکمل سکونت پذیر ہیں ۔حامد اکمل نے 26 (چھبیس) دسمبر 1950 (انیس سو پچاس) میں گلبرگہ شہر کے ایک متوسط گھرانے میں اپنی آنکھیں کھولیں، انہوں نے میٹرک اور انٹر پاس کیا پھر کافی عرصہ کے بعد فاصلاتی کورس کے ذریعے میسور یونیورسٹی سے ایم اے اردو میں امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کی اور گولڈ میڈل کے مستحق قرار پائے۔تعلیمی زمانہ سے ہی آپ کو ادب سے دلچسپی تھی، اسی زمانہ میں آپ نے پہلا افسانہ لکھا، سولہ سال کے عمر ہی سے آپ نظم و غزل اور مضامین پر توجہ دیتے رہے۔ آپ کی تخلیقات "تحریک"، " کتاب،"" آہنگ" اور" سطور" جیسے ادبی رسالوں میں طبع ہوتی رہیں ۔علاقائی اخباروں جیسے سیاست حیدرآباد، سالار بنگلور اور انقلاب ممبئی میں ابتدائی کلام طبع ہوتا رہا۔ادب کو فن کیا ظہار کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔لیکن آپ کے نظموں اور غزلوں میں یہ مفقود نظر آتا ہے۔

حامد اکمل افسانہ نگار، شاعر اور صحافی ہیں، انہوں نے شاعری کے آب گینوں سے لوگوں کو روشناس کرایا، وہیں صحافت کے پلیٹ فارم سے صداقت کے منظر ناموں سے آگاہی دی ہے۔حیدرآباد کے روز نامہ اعتماد کے سنڈے ایڈیشن میں کالم نگاری میں سچائی کی جوت جگائی ۔اور اس کے پڑھنے والوں کا اعتماد حاصل کیا ہے ۔حامد اکمل" سلامتی"، ایقان، روز نامہ بی این ٹائمز ز ،عالمی شمع، جیسے اخباروں ،رسالوں کو اداراتی تحریروں کے ذریعہ وقت کے نبض پر ہاتھ رکھا۔حامد اکمل اپنے مشاہدات کی صداقت کو غزلوں میں اس طرح پروتے ہیں۔

اپنے لہو سے ہم نے پھول کھلائے ہیں دنیا نے جب جب پتھر برسائے ہیں

تم بھی ہوئے سنگسار تو خود ہی جان گئے ہم بھی کیا سچ بول کے کم پچھتائے ہیں

اس میں حامد اکمل نے یہ بات بتانے کی کوشش کی ہے کہ پتھر سے زخم خوردہ ہونا اور ایسے موقع پر تبسم ریز ہوتے ہوئے گلوں کی بات کرنا اور مسلسل کوششوں کے درمیان انسان کو جو آزمائش کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس میں زندگی زخم خوردہ ہو جاتی ہے، لیکن ایسے حالات میں تحمل کے ساتھ حوادث کا مقابلہ کرنا اس میں وہ اعتماد دکھتا ہے، وہ کٹھنائیاں آسانیوں میں تبدیل ہوجاتی ہیں، چونکہ زندگی جہد مسلسل کا نام ہے اور شاعر اس کا سامنا پامردی سےکرتا ہے۔اس کے لیے شاعر یہ کہتا ہے۔

ساری تعبیروں سے واقف خواب تھا دل وفورِ شوق میں بے تاب تھا
ٹیھوایوں سرابوں کا سفر ایک قدم تشنہ تھا ایک سیراب تھا

حامد اکمل نےکبھی چھوٹی اور کبھی طویل دونوں قسم کی بحروں میں غزلیں لکھیں ، ان میں شاعرانہ خوبی کے ساتھ صاف ستھری فکر پیش کرتے ہیں۔

مرمٹنے پہ مائل ہے دیوانہ پاگل دل ہے
اس کی گلی کے پھیروں میں اب پندار ہی حائل ہے

ان اشعار کو حامد اکمل نے سچائی کی لہروں سے سجایا، اسی طرح ان کی شاعری میں برجستگی اہم خصوصیات میں سےہے۔ان کی غزلیہ شاعری میں تاثیر کے علاوہ، حد درجہ نغمگی اور موسیقیت پائی جاتی ہے۔اس کی وجہ سے غزل کے ہر شعر میں بالیدگی پائی جاتی ہے۔غزل کی شاعری میں جذبات کی لہروں، اور معاملات عشق کا ذکر ہوتا ہے۔ان کی پیشکش کی وجہ سے سے غزل اپنی روح کا حق ادا کرتی ہے۔جس میں الجھن، بے اعتنائی اور بے مروتی کے جلو میں جدائی کی کسک کا ذکر ہوتا ہے۔حامد اکمل اپنی غزل کے توسط سے روایتی احساس کو پیش کرتے ہیں، اور بچھڑی یادوں کو شعور کی آگہی دینے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔انہوں نے اپنے اشعار میں جدائی، ویرانی اور نادانی کا ذکر کیا اور پیکروں کی حقیقت صناعی میں سمو دیا ہے۔

لوٹ آیا پھر تیری جدائی کا موسم تیرے ملن کی رت مستانی یاد آتی ہے
سجے سجائے گھر کے ہر اک گوشے میں جانے کیوں دل کی ویرانی یاد آتی ہے

حامد اکمل نے اس غزل کو غزل مسلسل کی روانی عطا کی ہے.آخری دو شعروں میں عمومیت کا اظہار ہوتا ہے ۔ اور اپنے مقطع کے ذریعے عمر گزر جانے کے بعد جوانی کی یاد ستانے کے محاورہ کو استعمال کرکے کیفیت کو غزل میں ڈھال کر آسان بنا دیا ہے۔اس طرح ہر اک غزل میں پیکر تراشی

کے مختلف نمونے سامنے آتے ہیں۔شعر کے مطالعہ کے ساتھ کوئی نہ کوئی منظر نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔اور یہی عمل شاعری کے دوران پیکر تراشی کا انداز قرار پاتا ہے۔

حامد اکمل کی شاعری میں مختلف رنگوں کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔جب ہم ان کے اشعار پڑھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ادبی سفر میں کبھی طویل اور کبھی مختصر وقفے پائے جاتے ہیں۔کبھی راستہ منتخب کرنے میں ایک قسم کا کشمکش،کبھی اس سے بھٹکنے کا اندیشہ پایا جاتا ہے۔وہ ایک باکمال شاعر ہیں لیکن کبھی اس سے گریزاں بھی ہوتے ہیں،مضامین کی جدت میں سرگرداں ان کی غزلوں میں چونکا دینے والے اشعار پائے جاتے ہیں۔جیسے:

مشتاق تھے ہم جس کے کبھی آ پہنچا　　　وہ مرحلہ گمشدگی آ پہنچا
وصال قرب بھی کچھ،وحشتیں بڑھاتے ہیں　　　کبھی کبھی تو ضروری ہے فاصلہ رہنا

غزل استعارہ کی زبان میں بات کرنے کا ایک فن ہے۔حامد اکمل نے ایک طرف اپنی غزلوں میں استعارہ کو استعمال کیا،اور دوسری طرف گہری فکر کو اشعار میں ہلکے پھلکے انداز میں سمو دیا، معاشرہ میں ہر طرف انتشار کی کیفیت پائی جاتی ہے،وہاں زندگی کا کوئی خوبصورت تصور نہیں پیش کیا جا سکتا۔سوسائٹی کے اندرون خانہ جو فاصلہ ہے،اس پر ردعمل کی کسک ہے،یہ ردعمل ان کے اشعار میں قارئین اور سامعین کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ آوازیں بہت قریب سے آرہی ہیں۔حامد اکمل دور جدید کے شاعر ہیں۔ان کا مشاہدہ گہرا ہے۔یہ فکر و احساس کے بدلتے ہوئے رشتوں کے لیے جو یا رہتے ہیں۔وہ اپنی سرزمین سے بے انتہا محبت کرتے ہیں،اور اپنے تجربوں کے نچوڑ سے لوگوں کو آگہی دیتے ہیں۔ان کی شاعری میں بھی نئی ترکیبیں،نئے استعار یا ور معانی میں نئے انداز کی گہرائی پائی جاتی ہے۔عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ فن کار کی شخصیت دوہری ہوتی ہے،ظاہر میں کچھ اور باطن میں کچھ اور ہوتا ہے۔اور اس کے فن میں اس کا باطن مخفی رہتا ہے لیکن جب ہم اس کسوٹی پر حامد اکمل کو پرکھتے ہیں تو ان کا ظاہر اور ان کے باطن میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔وہ شاعری میں سنجیدہ اور سلجھی ہوئی ذوق رکھتے ہیں۔سماجی اور سیاسی فکر بھی ان کینوک قلم سے جھلکتی ہے۔وہ دور جدید سے متاثر تو ہیں لیکن ان کی شاعری کی فکر ان کو زندگی کے مسائل سے کھینچ کر قریب لے آتی ہے۔ان کی شاعری کا قرب ہمیں زندگی کے قریب کھینچ لے آتا ہے۔

بستی کا یہ قانون ہے،دستور جنگل کا نہیں　　　آزاد ہیں وحشی سبھی،شیطان پر پہرا نہیں
خود ہی تشکیک کی دہلیز پہ خوابیدہ ہیں　　　ہائے وہ لوگ زمانے کو جگانے والے

ہوائیں لاتی رہیں گی مہاجروں کے پیام امیر شہر فصیلوں کا در کھلا رکھنا
اگر چہ اس کی عنایات بھی بہت سی ہیں زمانہ پھر بھی بہت بے وفا سا لگتا ہے

حامد اکمل کی غزلوں میں اسباب مختلف ہوتے ہیں۔ان میں انسانی نفسیات کی گرہ کھولی جاتی ہے۔احساس کی سرحد متعین ہے، جو ٹوٹے ہوئے دلوں کو اعتماد بخشتا ہے۔مسابقت اور تصادم سے انسان کو آگے بڑھنے میں تقویت ملتی ہے،اور زندگی کے تگ و دو میں وہ دوسروں کے ہم قدم رہتا ہے۔حامد اکمل نے اپنی غزلوں میں جذبات کی آنچ کو نمایاں کیا ہے،غزلوں میں وہ کیفیات کے صداقت شناس ہیں۔حامد اکمل کی شاعری میں مانوس الفاظ، جذبات کی سچی عکاسی، روایت کی رفاقت، جدت کی ہم نوائی، نئی زمینوں کی تلاش اور نئے آسمان کی سیاحت پائی جاتی ہے۔حامد اکمل کے یہاں یہ شعری فضا مانوس ہوتے ہوئے بھی نامانوسیت عیاں کر دیتی ہے،اور جذبے کی آنچ اظہار کے پیرائے میں غزل کی شان رکھتی ہے اور تخیل کو حقیقت سے ہمکنار کر دیتی ہے۔غزل کا بنیادی وصف معاملہ بندی رہا ہے،فن کار کے وجدان کی رہنمائی میں ارزاں سے ارزاں خیال بھی ارفع ہو جاتا ہے۔جیسے:

جنہیں ملنا ضروری ہے چلے آتے ہیں خوابوں میں ہت عرصہ ہوا سب آنا جانا بھول بیٹھے ہیں
دل اسے نذر کرنے سے پہلے آگ میں پھول ڈال کر دیکھیں

حامد اکمل کی غزلوں میں موجودہ وقت کے حالات کی عکاسی ہوتی ہے۔وہ سماج کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھتے ہیں،اور درد و غم کی آمیزش کی سچی عکاسی نئی تبدیلیوں کے ساتھ نظر آتی ہے،اور ذہنی کرب کا اظہار نئے جہان سے آشنائی کراتا ہے۔موجودہ وقت کا اصلی داغدار چہرہ حامد اکمل جیسے حساس انسان کو ذہنی تپش میں مبتلا کر دیتا ہے،اور غزلوں کے دریچوں سے ان کی چیخ سنائی دیتی ہے، اور جذباتی زندگی کی وابستگی صداقت شناسی عطا کرتا ہے۔حامد اکمل کی شاعری میں تجربوں کا نچوڑ پایا جاتا ہے،وہ ایک طرف الفاظ کی صحیح سرچشموں کے لئے سرگرداں نظر آتے ہیں،تو دوسری طرف شعری مرکبات کو بھی وضع کرتے ہیں اور نئے معنی پہناتے ہیں۔شاعرانہ تفکر کیکئی اچھوتے رنگ ان کی شاعری میں پائے جاتے ہیں،تصوف،عشق،فلسفہ،سیاست،سماج،کھیت،کھلیان،شہر،گاں،جنگل، ویرانہ،سفر،حضر،محرومی،غربت،انسانیت اور سچائی وغیرہ بے شمار موضوعات پر ان کی غزلیں اور نظمیں موجود ہیں۔ان کی شاعری میں محرومی کا احساس پایا جاتا ہے،مگر امید و بیم کا عنصر بھی موجود ہے۔عشق کے زخموں سے اٹھنے والی ٹیسیں تکلیف دہ تو ہوتی ہیں،مگر بے خودی میں سرشاری کی کیفیت بھی پائی

جاتی ہے۔

مدت سے کچھ خیر خبر معلوم نہیں خود سے ملنے تیری گلی میں آ پہنچے

میں جہاں ہوں وہاں نہیں ہوں میں سوچتا ہوں کہاں نہیں ہوں میں

ایک انسان مختلف روپ دھار کر انسانی سوسائٹی میں اپنے آپ کو پیش کرتا ہے، اور اس کا سامنا طبقاتی کشمکش اور دوسرے پیچیدہ قضیوں سے ہوتا ہے، تو وہ ایک دوسرے کے مختلف حیثیتوں سے آگاہ ہوتا ہے، اور جو کج روہیں انہیں راہ راست پر گامزن کرنے کی سعی کرتا ہے۔ ایسے مرحلہ میں حامد اکمل کی غزلوں اور نظموں کو پڑھتے ہیں، تو ان میں انسان کی جذباتی وابستگی، فطری پیوستگی اور مثبت قدروں کی لڑیوں کا سامنا ہوتا ہے، جو ایک دوسرے میں پیوست ہیں، اور ان کی شاعری کا نشان امتیاز ابھر کر سامنے آتا ہے کہ ان میں دل کے اندرون خانہ کے ساتھ ساتھ دل کی خارجی اثرات بہت عمدگی سے سموئے ہوئے ہیں، اور ایسے وقت میں جب ہم اپنی سماجی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کو ایک بحران کی کیفیت میں پاتیہیں، اور سیاسی، اخلاقی، مذہبی اور جمالیاتی قدروں کی صحیح ڈگر میں بگاڑ محسوس کرتے ہیں۔ اور حامد اکمل کی شاعری کو ایک جاندار روایت، رنگ و آہنگ، سمت و رفتار اور وزن و وقار کے ذریعے صحیح تریاق پاتے ہیں۔ کیونکہ حامد اکمل نے اپنی غزلوں میں موجودہ وقت کے نبض پر ہاتھ رکھا ہے۔ جن میں نیا پن، نیا طرز بیان اور نئی شناخت کے مختلف پہلو ہیں۔ قدروں کی معنویت پر نظر گہری ہوتی ہے، وہ درد و غم کی آمیزش اور سماج کی دکھتی رگوں کو پکڑنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں، ان کا انداز بیان اتنا سچا اور دلکش ہوتا ہے کہ سننے والے کا دل بے ساختہ پکار کر کہتا ہے کہ یہ میرے دل کی آواز ہے، جو دل سے نکلی اور دل میں پیوست ہوگئی۔

اس گفتگو کا نچوڑ یہ نکلتا ہے کہ حامد اکمل کی شاعری میں ایک صالح فکر اور بلند نصب العین، درد اور سوزش کے ساتھ سمویا ہوا ہے۔ یہ کیفیت اردو کی غزلیہ شاعری میں انہیں نشان امتیاز عطا کرتی ہے۔ اس وقت قاری کا دل و دماغ پکار اٹھتا ہے کہ حامد اکمل نے اپنی غزلوں میں موجودہ زندگی کو غزل کے فن اور آداب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بلاغت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جس سے ان کی غزلوں میں میں احساس کی شدت غزلوں، جذبے کا خلوص، تخیل کی بلند پروازی لفظ لفظ سے جھلکی پڑتی ہے، اور ہم ان کی غزلوں کے سلسلے میں اپنی رائے اس طرح ظاہر کر سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنی غزلوں میں کائنات اور سوسائٹی کے ہر ہر قضیہ کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ اس وقت ان کی غزلوں میں تنوع و تہ داری سے قاری واقف ہوتا ہے، ان کی غزلوں میں سوز و گداز اور حسن و جمال کا ملاپ ہے۔ اور انہوں

نے اردو شاعری کے بدلتے ہوئے رنگ سے استفادہ کی کامیاب کوشش کی ہے، اور اسے اپنے شعری مزاج کا جز و بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ کیونکہ ان کی غزلیہ شاعری میں اپنے زمانے کی کشش ہی نہیں بلکہ اظہار و افکار کی وسعت بھی جلوہ گر نظر آتی ہے۔ زمانے کے پیچیدہ مسائل کو آسان زبان میں لکھا ہے۔ اور زندگی کے ہر گوشے پر اظہار خیال کیا، ان کے یہاں آمد ہی آمد ہے۔ اور انداز سہل ممتنع ہے۔ کیونکہ ان کو اپنے فن سے جنون کی حد تک لگا ہے، ان کی غزلوں میں عشق کی دھیمی دھیمی آنچ محسوس ہوتی ہے اور جاگتی آنکھوں میں خواب بنے جاتے ہیں۔

حامد اکمل کی شاعری گفتگو میں خوش سلیقگی پیدا کرتی ہے ہے اور زندگی کے اطراف کی تصویریں واضح کرتی ہے۔ یہاں پہنچ کر غزل کی تنگ دامانی ختم ہو جاتی ہے اور غزل کی وسعت قلب عیاں ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

Kashmiri Adab mein Sinf-e-naat:Ek Ta-arruf by Muzaffar Yousuf

(Anantnaag,jammu&kashmir)cell-7006044890

مظفر یوسف (اننت ناگ، جموں کشمیر)

کشمیری ادب میں صنف نعت: ایک تعارف

نعت عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی وصف وخوبی اور تعریف وتوصیف کے ہیں۔ لیکن عرف عام میں نعت رسول اکرم ﷺ کی تعریف وتوصیف بیان کرنے والی منظومات کو کہا جاتا ہے۔ یوں تو نعت کا لفظ مستقل ایک موضوع یا مضمون کا احاطہ کرتا ہے اور جب یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو وہ تمام خزائن اور ذخائر مراد ہوتے ہیں جو حضور اکرم ﷺ کے فضائل ومناقب، شمائل وخصائل ، اخلاق وکردار، تعریف وتوصیف اور مدح وثنا پر مشتمل ہوتے ہیں۔ چاہے وہ نظمی ہو یا نثری۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں بہت سے صحابہ کرامؓ نے نعتیں لکھیں اور یہ سلسلہ آج تک جاری وساری ہے۔ نعت لکھنے والے کو نعت گو شاعر جبکہ نعت پڑھنے والے کو نعت خواں یا ثناءخواں کہا جاتا ہے۔ زبان جو کہ اپنے مخصوص بولنے والے لوگوں کے لئے مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہے جسکے ذریعے لوگوں کو آپس میں رابطہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مختلف قوموں کے نام اُنکے مذہب اور وطن کے بدلے انکی مادری زبان سے جانے جاتے ہیں۔ عرب لوگوں کی مادری زبان عربی ہے اور اُن کو عربی ہی کہا جاتا ہے۔ زبان چھوٹی ہو یا بڑی اس سے کوئی فرق نہیں پڑھتی۔ نعت کے لئے کوئی مقرر ہیت قائم نہیں ہے اس لئے یہ ایک موضوعی ادبی صنف ہے اور اسی لئے مثنوی، غزل، رباعی، نظم بھی نعت لکھنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ جس ہیت میں لکھا جائے اس ہیت کے لوازمات اور پابندی کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ غزل میں نعت لکھا جائے تو بحر، مطلع، ردیف، قافیہ جیسے لوازمات مدِنظر رکھ کر لکھنا چاہیے۔ نعت ایک مقدس موضوع ہے اس لحاظ سے یہ بہت نازک قسم کی ادبی صنف ہے۔ اپنے تقدس کے لحاظ سے اس میں جو حدود ہیں اُن کا ذکر قرآن شریف اور حدیث پاک میں مقرر کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

''اے ایمان والو تم اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے بلند مت کیا کرو۔ اور نہ اُن سے ایسے کھل کر بولا کرو۔ جیسے تم آپس میں ایک دوسرے سے کھل کر بولا کرتے ہو۔ کبھی تمہارے اعمال برباد ہو جائیں

اورتم کوخبر بھی نہ ہو۔‘‘(الحجرات ، ۲)

نعت گوشاعر کوحضور ﷺ کی تعریف وتوصیف کرتے وقت ان حدود کا خیال رکھنا چاہیے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ جو کہ کوئی بھی عمل کرنے سے بے نیاز ہے مگر جب حضور ﷺ کا ذکر آیا تو اُس نے نہ صرف اپنے بندوں کوحضور ﷺ پر درود اور سلام بھیجنے کا حکم دیا بلکہ خود بھی اس عمل میں شریک ہوا۔ حضور ﷺ کا بلند مرتبہ قرآن کریم کی اس آیت سے واضح ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

’’بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود بھیجو اور خوب سلام بھیجا کرو۔‘‘ (الاحزاب،۵۶)

فارسی اور اردو ادب کے مقابلے میں کشمیری شاعری میں نعتیہ ادب بہت کم میسر ہے۔ کشمیری ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت شیخ نورالدینؒ پہلے ایسے عظیم المرتب شاعر ہے جن کی شاعری میں مختلف موضوعات کے ساتھ ساتھ نعتیہ کلام کے نمونے بھی ملتے ہیں ۔آپ اپنے کلام میں حضور ﷺ کی تعریف وتوصیف اس طرح بیان کرتے ہیں۔

پار پار لگ زِتس پیغمبرس　　یسندس دورس رحمت چھ جاری
کال ییلہِ ہکھ لگہِ روزِ محشرس　　تس کُن ومیدوار آسن ساری

’’اے مسلمانو، قربان ہو جاو۔ پیغمبر حضرت محمد ﷺ پر جس کا دور رحمت ہے۔ اس دور کی رحمت ابھی جاری ہے اور جاری رہے گی یعنی رحمۃً للعالمین۔ آخر کار جب وہ وقت آئے گا اور ہر ایک سے اپنی عمل کا حساب لیا جاے گا۔ اُس وقت سب کی نظریں انکی طرف ہونگی سب ہادیٔ برحق رسول اکرم ﷺ کی شفاعت، عنایت اور رحمت کے طلبگار رہوں گے یعنی اُس روز سب آپؐ کی سایہ رحمت کے منتظر ہونگے۔‘‘

کشمیری ادب میں نعتیہ شاعری مختلف ہیت میں تخلیق کی گیٔ ہے مثلاً غزل، نظم، مثنوی، رباعی وغیرہ۔ اس ادب میں ایک اہم حصہ جو کہ مثنوی پر مشتمل ہے اور اس زبان میں جتنی بھی مثنویاں لکھی گیٔ ہیں وہ سب حمد اور مناجات کے بعد نعت سے شروع کی گئیہیں۔ اس لئے کشمیری مثنوی ادب میں بہت سارا نعتیہ کلام ملتا ہے۔ کشمیری ادب کی ایک اہم ادبی صنف ’’وژن‘‘ میں بھی نعت تخلیق کے گے ہیں۔ اس زبان کے عظیم صوفی شاعروں نے اسی ہیت میں اپنی تخلیقی صلاحیت سے بہت سارے نعتیہ کلام تخلیق کئے ہیں جو کہ اس ادب میں ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے چند صوفی شاعروں کے نعتیہ کلام کے نمونے پیش ہیں۔

مسجدِ اقصیٰ لدنے آو تتھ منز محمد باجماتھ ژاو
نمازنوفلا پرتھے دراو یارسولؐ اللہ دیدار ہاو (محمود گامیؔ)
دویم مے کیشن کرخاب ڈیشن تاجدار سون معراجس دراو (وہاب کھارؔ)
کرناشادی پرناحمداہ برناچاویارسول اللہؐ (ناظمؔ)

نعت تخلیق کرنے کے لے جو حدود مقرر کے گے ہیں۔ پروفیسر وصی احمد صدیقی ان حدود کے متعلق یوں لکھتے ہیں:

"نعت وہی ہے جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال جہاں آرا کا ذکر ہو۔ جذبہ رحمت کی گفتگو ہو۔ اُنؐ کی ذات اقدس پر درود و سلام کا شوق بے پایاں ہو۔ بے ادبی کا شمہ بھر احتمال نہ ہو۔ خیر البشرؐ کا مقام، بشریت کرتے وقت مجروح نہ ہو۔ غزوات، انتظامی امور، سپہ سالاری، فتوحات اور انتظامی سیاسیات نعت کا موضوع نہیں۔ نعت والہانہ فریفتگی سے دل کو دماغ پر، جذبہ کو فکر پر، عشق کو عقل پر ترجیح، نعت ہے۔ یہاں بے راہ روی کی گنجائش نہیں دل عشق کی جلوہ گاہ ہو تو سروش غیبی کا مرکز ہوگا۔ ادراک شاعرانہ سے صوفیانہ بنے گا۔ یہ شعورِ حسن کا اظہار ہے۔ مگر حسن کمال اور حسنِ معنوی، یہ لاہوتی طبقات تک پرواز صرف عشق کے بال و پر سے ہوسکتی ہے۔"

(پروفیسر احمد صدیقی۔ تعمیر حیات، لکھنو جولائی ۱۹۹۹ء)

کشمیری ادب میں پیر عزیز اللہ حقانیؔ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ واحد نعت گو شاعر ہے جس کو کشمیری زبان کے عظیم شاعر پروفیسر رحمان راہیؔ اپنی نظم "نعت نبیؐ" بطورِ نذرانہ پیش کرتا ہے۔ احترام اور تعظیم کا حال یہ ہے کہ شاعر کہتا ہے۔

"گر قبول اُفتد، ژٲہم نذر حقانی کُنم" (رحمان راہیؔ)

عزیز اللہ حقانیؔ کے نئے اظہار اور آہنگ سے اُن کو کشمیری نعت گو شاعروں میں ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ آپ کا نعتیہ کلام جو کہ کشمیری ادب کے مشہور نعتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

گوجہاں تازہ بہ رخسارِ رسول عربیؐ روٹ گلو مشک زگفتار رسول عربیؐ
یم گنہگار تہہ نارکرن نالہ فغان تتہِ موکلاوتمن کھار رسول عربیؐ

صنفِ نعت کے حوالے سے ثنا اللہ کریریؔ کا نام کشمیری ادب میں ممتاز ہے۔ آپ کے تخلیق کئے ہوئے نعت آج بھی سارے کشمیری لوگ عقیدت کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ اس کا ایک نعتیہ

کلام جو کہ کشمیریوں کے کے التجا اور جذبہ کا ذریعہ بن چکا ہے اور کشمیری لوگ ہر وقت اس کو ورِدِ زبان رکھتے ہیں۔اس کے چند شعر یوں ہیں۔

احوال میانی تس ونکھ سے ہو کریم دادن دوا — ہاواو واتکھ ناتو تے بیتہِ ڈاپھ تراوتھ مصطفیٰ

سہ چُھ زون پے سون تے سے چھُے حمایت سون تے

سے جان سُے نند بون تے سُے رہنما سُے پیشوا

بے چار بے کس بے ہنر بے یار و یاور بے نوا — استاد روزتھ عرض کرکا شُرغریباہ پیوو پتھر

اظہار کا بنیادی وسیلہ زبان ہے اور زبان میں لفظوں کے استعمال سے تخلیقی زبان اور عام زبان میں فرق واضح ہوتی ہے۔ گویا لفظ سے معنے اور تجربہ وجود میں آتا ہے۔اسی لئے کہا جاتا ہے کہ معنے لفظ کا محتاج ہوتا ہے۔اس لئے ہر کسی شعری صنف میں ہیتی اور موضوعی صورتحال کے لئے اپنی زبان میں ہونا ضروری ہے۔ چونکہ نعت ایک عقیدتی ادب ہے اس لئے اس میں زبان کے تقدس کا خیال رکھنا لازمی ہے۔لفظوں کا استعمال کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہئے کہ میں حضور اکرم ﷺ کی تعریف وتوصیف بیان کررہا ہوں ۔ یہ وہ ذات مقدس ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

''اور ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کے لئے رحمت بن کر بھیجا ہے۔'' (الانبیاء ، ۱۰۷)

تمام چیزوں سے افضل حبِ نبیؐ کا ہونا ضروری ہے اور یہی حقیقی ایمان ہے۔جب نعت گو شاعر کے اندر حبِ رسولؐ موجود ہو تو اس کی تخلیق بہترین نعت کی صورت اختیار کرلے گی۔کشمیری ادب کے ممتاز نعت گو شاعر عبدالاحد ناظم جو کہ کسی تعارف کا محتاج نہیں ،اس نے بہت سارے نعت تخلیق کئے ہیں۔اس کے نعتیہ کلام کا ایک نمونہ پیش ہے۔

مکہٕ کس ٹاٹھس مدنی لالس — سوز بہ استقبالس جان

نعلین کرہا بتھ کس دالس — جر ہس یم زلعل رُخشان

ییہ ہے تہ لاگھے پادن ہالس — سوز بہ استقبالس جان

نعت کے لغوی معنے صفت، وصف، جوہر، تعریف، خاصیت اور خوبی کے ہیں۔خصوصاً جب کسی چیز کی تعریف میں مبالغے سے کام لیا جائے تو اس وقت نعت کا لفظ بولا جاتا ہے۔لیکن اصطلاحاً '' نعت'' اس نظم کو کہتے ہیں جس میں شاعر رسول اکرم ﷺ سے اپنی عقیدت ومحبت کا اظہار کرتا ہے ۔نعت کہنے والے کو ناعت کہتے ہیں۔نعت کا لفظ احادیث میں بھی آپ ﷺ کی تعریف وتوصیف

کے ہی معنی میں نظر آتا ہے۔مثلاً حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ایک یہودی لڑکا نبیؐ کی خدمت کرتا تھا۔وہ ایک مرتبہ بیمار پڑھ گیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی عیادت کے لے تشریف لے گئے۔اس کا باپ سرہانے بیٹھا ''تورات'' پڑھ رہا تھا۔آپؐ نے پوچھا ''اے یہودی کیا تم تورات میں میری نعت کو پاتے ہو۔اس نے جھوٹ بولے ہوے کہا۔''نہیں''لڑکے نے فوراً سچ بولا ہاں اللہ کی قسم اے اللہ کے رسولؐ ہم تورات میں آپ کی نعت (تعریف وتوصیف) پاتے ہیں۔(بیہقی)

یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نعت کا لفظ اپنی تعریف کے لے استعمال کیا ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سب سے پہلے یہ لفظ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصف کے لے حضرت علیؓ نے استعمال کیا۔نعت گوئی اسلام کے ابتدائی دور سے آج تک ہر زبان کے شعراء کا وطیرہ رہا ہے۔کشمیری شعروادب میں اس صنف کا ذخیرہ وافر مقدار میں آج موجود ہے۔نقادانِ فن کا متفقہ فیصلہ ہے کہ نعت گوئی بڑا مشکل مرحلہ ہے یہ جانتے ہوئے بھی کشمیری ادب کے شعراء مداحِ نبیؐ کرنے میں پیچھے نہیں رہے۔بلکہ نعت گوئی کو باعث نجات ومغفرت جان کر اس صنف میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تعریف و توصیف کرتے رہے۔صوفی شاعروں کے علاوہ باقی شاعروں نے بھی اس صنف میں حصہ لیا۔نعت گوئی یوں تو بہت آسان لگتی ہے لیکن غور سے دیکھا جاے تو بہت مشکل کام ہے۔چونکہ شاعر کو نعت کہتے وقت اس کا پاس ولحاظ رکھنا ضروری ہے کہ آدابِ شریعت بھی اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹیں اور آدابِ عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی اس کے دل ودماغ معمور ہوں اسی لے مشہور فارسی شاعر عرفی نعت گوئی کے متعلق لکھتے ہیں۔

''اے عرفی اتنی تیزی نہ دکھا یہ نعت کا راستہ ہے، کوئی صحرا نہیں ہے کہ آنکھیں بند کر کے دوڑتا چلا جائے گا۔یہ راستہ بہت کٹھن ہے اور اس کی کیفیت تلوار کی دھار پر چلنے کا نام ہے۔''

کشمیری نعت گو شاعروں نے اس ادبی صنف کے جو حدود ہیں اُن کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت معیاری تخلیقیں وجود میں لائیں۔حضرت شیخ نورالدینؒ سے لے کر جدید دور کے شعراء بھی اس ادبی صنف میں لکھتے رہے ہیں جو کہ اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ اس ادبی صنف کی طرف کشمیری شاعروں کا ذوق وشوق بہت زیادہ بڑھتا نظر آتا ہے۔

کتابیات:

۱۔عبدالاحد آزادؔ۔کشمیری زبان اورشاعری۔سرینگر۔۱۹۵۹ء

۲۔غلام محمد شادؔ۔کلیات عبدالاحد ناظم ۔ 3۔نعتیہ ادب نمبر۔شیراز۔کلچرل اکیڈمی ☆☆☆

Lal Ded ki shairi mein Shiv ka isteara by Dr. Afshana(Baghwan pora Lal Bazar,Srinagar)cell-8082396933

ڈاکٹرافشانہ(سرینگر)

لل دید کی شاعری میں شِو کا استعارہ

دنیا کے مختلف اقوام میں اپنی اپنی کہاوتیں ہیں جو اُن اقوام کے اجتماعی لاشعور میں موجود ہیں۔اسی طرح سے کشمیری قوم کی بھی اپنی کہاوتیں جو یہاں کی قوم کے اجتماعی لاشعور میں موجود ہیں جن کا ذکر یورپی محقق ہنٹن نولز نے اپنی کتاب (A Dictionary of Kashmiri Proverbs) میں ۱۶۰۰ کی تعداد دی ہیں اور شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جس کو کوئی نہ کوئی کہاوت زبان زد ہو۔ہنٹن نولز نے جن ۱۶۰۰ کہاوتوں کا ذکر کیا ہے اُن میں سب سے زیادہ لل دید کی شاعری میں سے لیں گئیں ہیں۔لل دید کی کہی ہوئی باتیں جو آج بھی لوگوں کے لاشعور میں موجود ہیں اور ساتھ ہی اس بات کی بھی گواہی دیتی ہیں کہ وہ کتنی بڑی بیناء مفکر اور عارف تھیں۔

یہ لل دید کے غیر معمولی افکار ہی ہیں جو لل دید کو کشمیر سے لے کے دنیا کے مختلف گوشوں میں ایک اعلیٰ مقام عطا کرتی ہیں۔سماجی نا انصافی سے لے کر انسان کی ذات تک جیسے مختلف موضوعات پہ لل دید نے بات کی ہے۔انسان کی اپنی ذات پہچاننے کا سلسلہ لل دید کی شاعری کا اہم گوشہ ہے جو کہ اس مکالے کا اہم نکتہ ہیں یعنی لل دید کی شاعری میں شِو کا استعارہ۔

چونکہ انسان کی ذات کا مسلہ ایک آفاقی مسلہ ہے اس لئے اس کے انہار اسلامی تصوف اور کشمیری شِومت میں بھی موجود ہیں۔کشمیری شِو فلسفے کا ذکر میں نے اس لئے کیا کیونکہ یہ ویدانیت کے اصول وحدت سے مختلف ہے اور شِو شاستر کشمیر کی سب سے پرانی فلسفی وراثت۔ہاں مگر لل دید سے پہلے ہی کشمیر میں ایران اور ترکستان کے صوفی فقراء اور روحانی بزرگوں نے قدم رکھا تھا۔

کشمیری شِومت فلسفے میں شِو سب سے بڑی اور عظیم ذات ہے۔شِو ہی ہر چیز کا بود و نابود کرنے والا ہے، یہی دنیا کا کارزار چلانے والا ہے، یہی وہ ایک شکتی ہے جو ہر شے میں جلوہ گر ہے اور یہی وہ شکتی ہے جو اندھیروں کو بھی پیدا کرتی ہے۔کشمیری شِو فلسفے کے مطابق جب انسان کی خود شناسی ہو جاتی ہے تو اندھیرا چھٹ جاتا ہے۔شِو اور شکتی ہم آہنگ ہوتے ہیں، خالق اور مخلوق، ظاہر اور باطن، آتما اور پرتما یکساں ہوتے ہیں۔درج ذیل حوالہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔

''پریتۃ بھن جیا شاستر'' اس لفظ کے معنی ہیں پہچان کس کی پہچان؟ یہ پہچان ہے اپنے آپ کی پہچان یعنی اپنے ذات کی پہچان۔ میں کون ہوں مجھ میں کون سے صفات ہیں اس دنیا میں آ کے میرے لئے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے پرم شِو ہوں یعنی عظیم ہستی۔ مجھ میں وہی صفات موجود ہیں جو اس عظیم ہستی میں موجود ہیں۔'' ۱؎

اسلامی تصوف کا وحدت الوجودی مکتب فکر بھی کائنات میں تمام موجودات کا جوہر ایک ہی قوت کو مانتا ہے اور یہ مکتب فکر بھی اسی موضوع کو بیان کرتا ہے۔ درج ذیل حوالہ اس بات کی صدیق کرتا ہے۔

''وحدت الوجود کا مطلب یہ ہے کہ اس جہاں میں اگرچہ موجودات بہت ہیں لیکن درحقیقت یہ تمام موجودات وجودِ باری تعالیٰ میں شامل ہیں علیحدہ نہیں ہیں۔ اس وجہ سے کہ یہ جہاں حق تعالیٰ کی صفت تخلیق کا ظہور ہے۔ اب چونکہ صفت موصوف سے جدا نہیں ہے اس لئے موجودات عالم جو صفات حق کا ظہور ہیں وہ بھی حق تعالیٰ کے وجود سے خارج کوئی وجود نہیں رکھتیں۔ ان سب اشاء کا وجود اعتباری اور اضافی حیثیت رکھتا ہے۔ حقیقت میں وجود صرف ذات حق کا ہی ہیں اس عقیدہ کو نظریہ وحدت الوجود کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔'' ۲؎

اب اگر بات کی جائے سائنسی دنیا کی تو سائنسی دنیا میں تین بڑے شعبے ایک تو حیاتیات، دوم طبعیات اور تیسرا کیمیا ہے۔ مذکورہ بالا میں نے جس شوشکتی اور وحدت الوجودی جوہر (باری تعالیٰ) کو بیان کیا تھا۔ سائنسی دنیا میں وہی شکتی یا جوہر قوت (Energy) کے نام سے جانی جاتی ہیں جو کہ مختلف رنگوں اور شکلوں میں موجود ہے۔ مثلاً حرکی قوت (Kinetic Energy)، کششِ ثقل (Gravitational Energy)، برقی مقناطیسی (Electromennetic Energy)، کیمیائی قوت (Chemical Energy)۔ علم حیاتیات میں یہ قوت مختلف خلیوں کی شکل میں نمودار ہے اور طبعیات کے ماہرین بھی رائے اتفاق رکھتے ہیں کہ کائنات میں بھی ہر عمل کے پیچھے اسی قوت کا عمل دخل ہے اور علم طبعیات اس قوت (Energy) کے موجود ہونے کو ایک اصول کی بنا پر بیان کرتے ہیں وہ اصول ہے۔ (Conservation of Energy) یا (First Law of Thermodynamics)

" Energy neither can be created nor can be destroyed but only changes from one form to another"

علم طبعیات کے مطابق قوت (Energy) نا کبھی بنائی جا سکتی ہیں نا کبھی اس کا خاتمہ کیا جا سکتا

ہے بلکہ یہ ہمیشہ سے اپنے فطری تغیُر و تحیُر کے عمل میں موجود اور رواں دواں ہے۔

شِو فلسفہ کی شکتی، وحدت الوجود کی وحدانیت اور سائنسی نقطہ نگاہ میں (Energy) کو ایک ہی موضوع بنا کر بحث کر کے میرا مقصد کسی بھی فلسفی نظریے کے خلاف اعتراض کرنا نہیں ہے بلکہ میرا مقصد وہی شکتی، وحدانیت یا قوت کو ایک نئے طریقے سے پیش کرنا ہے جس کو مختلف دوروں میں فلسفیوں، عارفوں اور سائنسی ماہروں نے مختلف شکلوں اور رنگوں میں بیان کیا ہے، جس کو بیان کرنے کے لئے میں نے کشمیری شعر و ادب سے استفادہ لیا ہے۔ حالانکہ جب بھی شعر و ادب کی بات چلتی ہے تو اکثر شعر و ادب کو پریوں، عشق و عاشقی کی کہانیوں کا اثاثہ سمجھا جاتا ہے جس سے عوام کو کوئی استفادہ نہیں جب کہ ادب میں کئی سارے علوم کو اپنے آپ میں سمایا ہے اور عوام الناس نے اُس سے استفادہ بھی حاصل کیا چاہے وہ سائنسی علوم ہو، یا تواریخ کی بات ہو یا فلسفی نظریہ ہو۔

اپنے نقطہ نگاہ کو پیسش کرنے کے لئے میں نے قدیم کشمیری شاعری کی عارف اور شاعر لل دید کا حوالہ لیا ہے۔ جو کشمیری شاعری کے ساتھ ساتھ یہاں کی روحانی فضا کا بھی پہلا قدم ہے۔ لل دید کی شاعرانہ شخصیت پہ بحث کرنے کے بجائے اُن کی توضیح کرنے کی کوشش کی ہیں جن سے اُن کے بڑے مفکر، فلسفی اور فن کارانہ درجہ ثابت ہو۔

گگن ژے بُتل ژے　　　　شے چھکھ دن پون تہ راتھ
ارگ ژُندن پوش پؤن ژے　　　　ژے چھکھ سوُرے تہ لاگ زکیا

لل دید نے اپنے اشعار میں شکتی، قوت اور oneness استعارہ بنا کر پیش کیا ہے۔ زمین، آسمان، دن، رات، پھول، چندن میں اسی قوت یا شکتی کا وجود باقی ہے جو بڑی ہیں یعنی شِو۔ چندن، پھول، پانی، زمین یہ سب اُسی عظیم شکتی کی مختلف شکلیں ہیں۔ اور وہ سب میں خود ہی سمایا ہے۔ جس طرح لل دید نے ''شیل'' لفظ کو بھی استعارہ بنایا ہے جیسے۔

سے شیل پیٹھس تہ پاٹھس　　　　سے شیل چھے پریتھون دیش
سے شیل شنبونس گراتس　　　　شِو چھُے کروٹھ تہ ژین وپدیش

''شیل'' کے معنی پتھر کے ہیں اور یہاں شعر میں یہ وہ پتھر بھی ہیں جو ہمارا تخت بھی بناتی ہیں، وہ پتھر جو راستوں میں سجاتے ہیں اور وہی پتھر جو ہمارے پالنے والے (بھگوان) کے گھر مورتی بن کر ہیں۔ جس مورتی کے سامنے آپ نمن کرتے ہیں۔

بان گول تے پراگاش آونون نے　　　　ژندر گول تے موژُے ژتھ

ژتھ گول تے کینہہ نے کینہہ گیہ بھوسروتر اوتھ کیاتھ

پھراسی ''شکتی'' یا قوت کا استعارہ سورج، روشنی اور چاند کے ذریعے بھی سورج کی روشنی میں دیکھتی ہے تو کبھی اسی سورج (قوت) کو ڈوبتے ہوئے چاند کی روشنی میں چمکتے دھمکتے دیکھتی ہیں۔ جب چاند کی چمک دھمک بھی چھٹ جاتی ہیں تو اپنے آپ میں پاتی ہیں۔

کُس پوش تے کسے پوشن پے کم کُسم لاگ زس پؤ زِیے
کوگڈ دلی زیس زل چے دینے کومیانہِ منترایہِ شنکرسواتمی وزے

سائنسی ماہرین جوزمین سے پودے کا اگنا اوراس پودے سے پھول کا پھوٹنا واضح کرتے ہیں یعنی یہ ایک قوت ہی ہیں جو پہلے بیج کی شکل میں پھر پودے کی اور پھر پھول کی شکل میں بتاتے ہیں۔ جب کہ کشمیری شعروادب کی شاعر، عارف، اور مفکرلل دید بھی اس قوت کو اپنی شاعری میں چودہ سوسال پہلے بیان کرچکی ہیں۔ پانی اور پھولوں کا استعارہ بنا کر اس قوت کو مختلف انہار وعکس میں دکھایا۔ جو پانی ہم پیتے ہیں وہی پانی مقدس بن کر ایک عیسائی کو پاک کرتا ہے۔ جو پھول اس قوت کی ایک شکل اور دوسری شکل زمین سے اُگتے ہیں وہی پھول ہم اسی قوت کی تیسری ہیت مورتیوں پر ڈالتے ہیں۔ غرض لل دید نے فلسفیانہ انداز میں ہم پر اس بات کو روشناس کیا ہے کہ اگر وہ ایک ہی شکتی (قوت) ہر ہیت میں موجود ہیں تو کون کس کی عبادت کرتا ہے کون کس کو پاک کرتا ہے۔ جس مٹی کے نیچے سے پانی نکلتا ہے، جس مٹی سے پودے اُگتے ہیں، جس مٹی سے ہم برتن بناتے ہیں آخر کار انسان بھی وہی مٹی بن جاتا ہے۔

اس مقالہ میں میں نے لل دید کے کچھ ہی اشعار نقل کئے جن میں لل نے چودھویں صدی میں ہی اس نکتہ کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ کائنات میں تمام موجودات ایک ہی قوت (شکتی) کے مختلف انہار ہیں۔ ایک ہی ایسی بڑی قوت ہے جو اپنے تحیُر اور تغیُر میں رواں دواں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ لل دید کے فلسفی نکتہ کے پیچھے شِو فلسفہ پس پس پردہ تھا مگر دیکھا جائے تو ہر دور میں ہر فلسفی، مذہبی رہنما یا سائنسی ماہرین نے اپنے نکتہ کو بیان کرنے کے لئے کسی نہ کسی فلسفے یا تجربے یا کسی مقدس کتاب کو بنیاد بنایا ہے۔

حوالہ:1۔ بدری ناتھ کلا، کشمیری شِومت، صفحہ ۲۵، ۲۶۔
2۔ حضرت سید علی عثمان الجبریری، کشف المحجوب، صفحہ ۱۳۹۔

☆☆☆

Afsaane افسانے

gharonda by Afshan Ahmad(berlin.Germany)cell-0049-17673200892

افشاں احمد (برلن، جرمنی)

گھروندا

ایک بھورے رنگ کا گھوڑا سرپٹ بھاگتا ہوا قریب سے گزر گیا۔ اس طرح سجا ہوا جیسے کوئی دولہا اپنی دُلہن کی تلاش میں دوڑ رہا ہے۔ ایک اونٹ اپنی پیٹھ پر دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو لادے ٹھمک ٹھمک کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے بچّے شور مچاتے اچھلتے کودتے ریت پر دوڑ رہے تھے۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ خنک ہوا میں ہلکی ہلکی تمازت پیدا ہوتی جارہی تھی۔ سورج کی شعاعیں ریت پر مچل رہی تھیں اور چاندی کی طرح چمک رہی تھیں۔ عرب ساگر کا پانی انگڑائیاں لے رہا تھا۔ کیا جنت میں بھی ایسے ہی خوبصورت سمندر ہوں گے؟ ساجد نے اپنے دل سے سوال کیا اور پھر اپنی بیٹی کی طرف بڑھ گیا، جو ریت پر ایک گھروندا بنانے میں مصروف تھی۔ بار بار اپنے ماں باپ کی طرف ہاتھ ہلا ہلا کر چلا رہی تھی: ''دیکھو، دیکھو میرا قلعہ کتنا بڑا ہو گیا ہے۔؟''

دسمبر کا مہینہ تھا۔ اتوار کا دن۔ آج اسے دفتر نہیں جانا ہے۔ وہ صبح صبح اپنی بیوی اور بچوں کو لیکر کراچی کے ساحلی علاقے کلفٹن میں سیر کرانے کے لئے آیا تھا اور عرب ساگر کے حسن اور چمچماتی ہوئی ریت کے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کی بیوی بھی بہت خوش تھی۔ آج ان کی شادی کی سالگرہ تھی۔ اس لئے ساجد اپنے بیوی بچوں کو لیکر کلفٹن پر سیر کرانے آیا تھا۔ ورنہ اسے کہاں وقت ملتا ہے۔ اکثر اس کی بیوی گھر پر کڑھتی رہتی ہے۔ اس کا دس سالہ بیٹا شاکر چند دوسرے بچوں کے ساتھ ریت پر گیند کھیل رہا تھا اور آٹھ سالہ خوبصورت بیٹی سعدیہ بار بار اپنے ریت بھرے ہاتھوں سے لمبے لمبے کالے بالوں کو پیچھے جھٹکتی اور اپنے چہرے پر سے ریت کو ہٹاتی ہوئی ایک بڑا سا گھروندا بنا رہی تھی اور پکار رہی تھی:

''دیکھو، دیکھو، میرا قلعہ کتنا بڑا ہو گیا ہے۔''

اچانک سمندر کی ایک تیز لہر آئی اور اس کے قلع کو بہالے گئی۔ سعدیہ رونے لگی۔ ساجد نے

اسے اپنی گود میں اٹھالیا۔

’’میری پیاری بیٹی، میری ڈارلنگ۔ تیرا باپ اس سے بڑا محل تیرے لئے بنوا دے گا۔ اصلی محل۔ پھولوں سے بھرا۔ایک جھولا بھی ہوگا اس میں۔ایک سونے کا گھروندا۔اپنی پیاری سعدیہ کے لئے۔۔۔اپنی شہزادی کے لئے۔‘‘

اس کی بیوی رابعہ دل میں سوچ رہی تھی، رہنے کے کے لئے اپنا خود کا ایک چھوٹا سا گھر تو ہے نہیں اور یہ باتیں محل بنوانے کی کر رہے ہیں۔لیکن ساجد کے ذہن میں اب ایک گھر بیٹھ گیا تھا۔وہ اٹھتے بیٹھتے گھر کے خواب دیکھنے لگا تھا۔اپنے، اپنی بیوی اور بچوں کے لئے۔ایک چھوٹا سا مگر اپنا گھر۔اپنے ذاتی مکان میں آزادی سے سانس لینا چاہتا تھا۔ایک ایسے آزاد پرندے کی طرح جو آسانی سے اڑتا ہوا اپنے گھونسلے میں آتا ہے اور کسی کی نظریں اس کا تعاقب نہیں کرتیں۔رابعہ بھی اب اس کی طرح ایک چھوٹے سے خوبصورت گھر کے سپنے دیکھنے لگی تھی اور ساجد اپنی تنخواہ میں سے جو کچھ لا کر دیتا تھا اس میں سے کچھ رقم مکان کے لئے بچا کر رکھ لیتی تھی۔

ساجد ایک کاروباری آدمی تھا۔کراچی کے ایک بڑے مال میں اس کی اونکس پتھر کی بنی ہوئی خوبصورت چیزوں کی دوکان تھی جس سے کافی آمدنی ہو جاتی تھی۔خاص طور سے ہرے اونکس کی چیزیں، جو دنیا کے بہت سے ملکوں میں نایاپ ہیں۔وہ انہیں اپنی دوکان پر ہی خوبصورتی سے سجا کر نہیں بیچتا تھا بلکہ کئی ممالک میں انہیں ایکسپورٹ بھی کرتا تھا۔اس کی دوکان سے کچھ دور کے فاصلہ پر ڈیفنس کے علاقے میں اس کے والدین کا بڑا سا گھر تھا۔جہاں وہ پہلے اپنے ماں باپ اور دو بھائیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ساجد کے والد ایک بڑے دفتر میں کام کرتے تھے اور اچھی تنخواہ پاتے تھے۔اس کی ماں زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی لیکن کافی سمجھدار اور روشن خیال تھی۔انہوں نے اپنی اولادوں کو اچھی تعلیم دلوائی تھی۔ساجد نے بزنس ایڈمنسٹریشن کی تعلیم حاصل کی تھی اور بجائے کسی کی ملازمت کرنے کے خود اپنی تجارت شروع کر دی تھی۔

شادی ہو جانے کے بعد ساجد قریب کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ کرائے پر رہنے لگا تھا۔اس کا بیٹا اور بیٹی ایک اعلی اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ساجد چاہتا تھا کہ اپنے بچوں کو بھی اعلی تعلیم دلوائے۔اس کی بیوی رابعہ بھی ایک روشن خیال اور سمجھدار خاتون تھی اور گھرداری اور بچوں کی دیکھ بھال دونوں ذمے داریوں کو خوبی سے نبھا رہی تھی۔اس لئے ساجد اطمینان سے اپنے کاروبار کو چمکانے میں دن رات لگا رہتا تھا۔یہاں آنے کے

بعد اپنا گھر بنانے کی اس کی خواہش میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کا بھی اپنا کوئی مکان ہو جہاں وہ آزادی سے اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ کھل کر زندگی گزار سکے۔ وہ حسرت سے دوسروں کے گھروں کو دیکھتا اور پھر اپنے کام کی مشغولیت میں گم ہو جاتا۔

آج کلفٹن میں عرب ساگر کے ساحل پر پر اپنی بیٹی کو ریت کا محل بناتے ہوئے دیکھ کر اس کا خواب پھر بیدار ہو گیا تھا اور پھر جب سمندر کی سنگدل موج نے اس کی بیٹی کا محل ڈھا دیا تو ساجد کا دل بے تحاشہ تڑپ اٹھا تھا۔ اور اب اس کے سر پر اپنے گھر کا سودا سوار ہو گیا تھا۔ وہ ضرور ایک گھر بنوائے گا۔ اس نے رابعہ سے کہا اور رابعہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

صبح ساجد نے ناشتے سے فارغ ہوتے ہی اپنا پسندیدہ مشغلہ پھر شروع کر دیا۔ اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور اس میں سے اپنا ٹیبلیٹ نکال کر دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ اکثر مکانوں کے اشتہارات دیکھا کرتا تھا۔ لیکن آج وہ اور بھی زیادہ ولولے سے اشتہارات کو دیکھ رہا تھا۔ چھوٹے بڑے بے شمار مکانوں کے اشتہار تھے۔ رابعہ بچوں کو اسکول کی وین میں بٹھا کر آ گئی تھی۔ وہ بھی ساجد کے شانوں پر اپنا بوجھ ڈالتی ہوئی ٹیبلیٹ پر جھک گئی۔ ساجد نے رابعہ کی طرف اپنی گردن موڑتے ہوئے کہا: ''بیگم، آج شام کو مجھے واپسی میں دیر ہو جائے گی۔''

''کیوں، کوئی خاص کام ہے؟'' اس نے بھولے پن سے پوچھا۔

''یہ دیکھو! اس میں ایک فلیٹ کے پروجیکٹ کے بارے میں لکھا ہے۔ میں ذرا وہاں جا کر معلوم کروں کہ کیسا ہے؟ کب تک مکمل ہو جائے گا؟

''اوہ، خیال تو اچھا ہے۔ اگر گھر بُک کروالیں تو رفتہ رفتہ قسطوں میں رقم ادا کر دیں گے۔ ہمارا بھی ایک گھر ہوگا۔ ہم بھی اپنے گھر کے مالک ہوں گے۔ رابعہ نے اپنے شوہر کی گردن میں بانہیں حمائل کرتے ہوئے کہا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا شوہر یہ سب اس کی اور بچّوں کی خوشی کے لئے کر رہا ہے۔

''میں بھی یہی سوچتا ہوں۔ یکمشت رقم ادا کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ ہم قسطوں میں ادا کر دیں گے۔ لیکن پہلے خود وہاں جا کر اس پروجیکٹ کو تو دیکھ لوں۔ پوری معلومات تو حاصل کر لوں۔ ساجد نے رابعہ سے کہا اور دوسرے کمرے میں کپڑے بدلنے کے لئے چلا گیا۔ رابعہ ناشتے کے برتن میز پر سے ہٹانے لگی۔

کافی جانچ پڑتال اور اور سوچ بچار کے بعد انہوں نے آخر کار ایک چھوٹا سا کئی کمروں کا

گھر کراچی کے ایک پوش علاقے میں زیر تعمیر کالونی میں اپنے لئے بُک کروا ہی لیا۔ وہ اکثر وہاں جا کر تعمیری کام کو دیکھتا اور اپنی پسند کے مطابق ترمیم کرواتا رہتا۔ آخر انتظار کی گھڑیاں پوری ہو ہی گئیں اور اس کا خواب شرمندہ ءتعبیر ہو گیا۔ ایک چھوٹا سا چار کمروں کا گھر اور اس کے پیچھے خوبصورت چھوٹا سا باغیچہ۔ وہ اور رابعہ دن رات اسے سجانے میں لگ گئے۔ کبھی کبھی صبح سویرے جب ایک خوبصورت پرندہ باغیچے میں ایک پیڑ پر بیٹھ کر اپنی سریلی آواز میں کوئی گیت سناتا اور اس کی ساتھی چونچ میں تنکے دبائے ہوئے گھونسلہ بنانے میں مشغول ہوتی تو انہیں یہ منظر بہت اچھا لگتا۔

آج ساجد اور رابعہ کا گھر مہمانوں سے بھرا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے فاتحہ خوانی کی رسم ادا کی گئی تھی اور اب قہقہوں اور سنگیت کا کہرام تھا۔ لوگوں کے لائے ہوئے گلدستے رکھنے کے لئے گلدانوں کی کمی پڑ گئی تھی۔ طرح طرح کی مٹھائیاں اور پکوان میز پر سجے تھے۔ ہر شخص ساجد اور رابعہ کو مبارکباد دے رہا تھا اور اس کے گھر اور سجاوٹ کی تعریفیں کر رہا تھا۔ رابعہ اور ساجد مہمانداری میں لگے تھے اور ان کے بچے اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ اچھل کود اور بھاگ دوڑ میں مصروف تھے۔

رات گئے مہمانوں کے جانے کے بعد جب بچے اپنے کمرے میں سونے کے لئے چلے گئے اور میز پر سے برتن ہٹانے کے بعد ساجد اور رابعہ اپنے بستروں پر لیٹے تو ان کے چہرے خوشی سے چمک رہے تھے۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے اللہ تعالیٰ نے ان کی ساری زندگی کی دعائیں قبول کر لی ہیں اور اس گھر کے روپ میں انہیں سب سے اہم نعمت عطا کی ہے۔ وہ اپنی ساری تھکن بھول گئے تھے۔ ایک نئی طاقت اور توانائی انہیں اپنے جسم میں سرائیت کرتے ہوئے محسوس ہو رہی تھی۔

''مسز شاہد کو ہمارا گھر بہت پسند آیا ہے۔ اور روبی کو تو یہ علاقہ بھی بہت اچھا اور پرسکون لگا ہے۔'' رابعہ نے ساجد کو بتایا۔

''ہاں آصف اور محمود بھی گھر کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہمارے دیرینہ خواب کو تعبیر سے نواز دیا۔ بیگم تم نے گھر کو سجایا بھی بہت اچھا ہے۔ سب لوگ تعریف کر رہے تھے۔'' ساجد نے پیار کے لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی چمک رہی تھی۔ وہ دیر تک یہی سب باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ غنودگی طاری ہو گئی اور وہ نیند کی وادی میں چلے گئے اور واقعی خوابوں کے جھولے پر جھولنے لگے۔

وقت کے ساتھ وہ اپنے گھر میں مکمل طور پر بس گئے تھے۔ اور اپنی پسند کے مطابق مکمل طور سے اسے سجا دیا تھا۔ پڑوسیوں سے بھی اچھی جان پہچان ہو گئی تھی۔ بچے بھی اپنے گھر اور محلے کے

عادی ہو گئے تھے اور پڑوسی بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔آج بھی ساجد خوش وخرم اپنے کام پر گیا۔دن بھر مصروف رہا۔لیکن جب گھر جانے کے لئے دُکان سے باہر نکلا تو آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور ایک عجیب خوفناک منظر نظر آ رہا تھا۔ایسا لگتا تھا جیسے ابھی سے شام ہو رہی ہے۔ تیز ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔ساجد جلدی سے اپنی کار تک پہنچا اور اسے اسٹارٹ کر کے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

رابعہ بچوں کو کھانا کھلانے کے بعد انہیں اپنے کمرے میں جا کر سونے کی ہدایت کر رہی تھی۔لیکن اس کی بیٹی کاغذ پر رنگین پنسلوں سے ایک محل کی ڈرائنگ بنانے میں اور بیٹا لیگو سے ایک شاندار قلعہ بنانے میں مصروف تھے۔جیسے ہی انہوں نے ساجد کو دیکھا دوڑ کر اس سے لپٹ گئے۔سعدیہ نے کہا:

''پاپا میرا محل!''

''ڈیڈی میرا قلعہ،دیکھو کتنا اچھا ہے!'' شاکر نے بیچ میں کہا۔بچے اُسے اپنی کار کردگیاں دکھانا چاہتے تھے۔لیکن اسے کچھ اور فکر تھی:

''آج تو موسم کے تیور کچھ اچھے نہیں لگ رہے ہیں۔'' رابعہ نے بیچ میں کہا۔

''ہاں لگتا ہے بہت تیز بارش ہو گی۔اللہ رحم کرے۔'' ساجد نے تشویش بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''آپ ہاتھ منہ دھو کر آ جائیں۔میں کھانا نکالتی ہوں۔آج مچھلی پکائی ہے!'' رابعہ نے کہا اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔

کھانے کے دوران ساجد اور رابعہ بچوں سے ان کے دن کا احوال اور ان کے محل اور قلع کی باتیں سنتے اور خوش ہوتے رہے۔پھر بچوں کو شب بخیر کہہ کر اور انہیں ان کے کمرے میں سونے کے لئے بھیج کر کچھ دیر ٹی وی دیکھتے رہے۔پھر انہوں نے ٹی وی کو بند کر دیا۔ساجد ایک آرام کرسی پر لیٹ کر ایک رسالہ دیکھتا رہا رابعہ بھی برتن دھونے کے بعد اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ایسا لگ رہا تھا جیسے باہر ہوا کے جھونکوں میں تیزی آ گئی ہے۔کھڑکیاں بج رہی ہیں۔کچھ دیر بعد وہ دونوں اپنے بستروں میں چلے گئے۔لیکن ابھی ان کی آنکھ لگنے بھی نہیں پائی تھی کہ باہر زوردار بجلی چمکی اور تیز کڑک ہوئی۔ کھڑکیاں کھٹکھٹانے لگیں۔تیز موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ان کی نیند بھی غائب ہو گئی تھی۔گرج، کڑک اور چمک۔کئی گھنٹے یہ عالم رہا۔اچانک باہر سے شور کی آوازیں آنے لگیں اور پھر بڑھتی گئیں۔

انہوں نے کھڑکی کے پاس جا کر دیکھنے کی کوشش کی مگر ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ کھڑکی پر جیسے پانی کی بوچھار پڑ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کھڑکی پر پانی کی موٹی سی چادر تنی ہوئی ہے۔ ساجد اور رابعہ اپنے کمرے سے نکل کر ڈرائینگ روم کی طرف بڑھے لیکن ان کے پیر گیلے ہو گئے۔ پانی کا ریلا اندر آتا ہوا نظر آیا۔ رابعہ کی چیخ نکل گئی۔ پانی اب تیزی سے اندر پھیل رہا تھا۔ انہوں نے جلدی سے بچوں کو جگایا اور سب نے مل کر سامان کو فرش سے اٹھا کر اوپر رکھنا شروع کر دیا۔ مگر پانی کی سطح اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ پانی اب ان کے سونے کے کمرے میں بھی پہنچ گیا تھا۔ رابعہ نے گھبرا کر بچوں کو لپٹا لیا۔ ساجد کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ پانی کا تیز ریلا۔ بچوں کا بلکنا اور رابعہ کی پریشان حالت اور باہر تیز چمک، کڑک اور گرج اور پانی کی تیز دھاریں۔ اور کمروں میں پانی کا ریلا اور اس کے ساتھ گندگی، کیچڑ اور بدبو۔ چھوٹی موٹی چیزیں پانی میں تیر رہی تھیں۔ ساجد نے بچوں اور رابعہ سے کہا کہ وہ ڈائننگ ٹیبل پر چڑھ جائیں۔ اور پھر خود بھی اس پر چڑھ گیا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا اور رابعہ اور بچوں کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو۔ ایسی کوئی جگہ نہیں بچی تھی جہاں وہ بیٹھ سکتے۔

اچانک دروازہ پر دستک ہوئی اور بڑھتی چلی گئی۔ محلے کے کچھ لوگ آ گئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو ان کے ساتھ اوپری منزل پر بھیج دے۔ دوسری منزل پر۔ وہاں لوگوں نے اپنے دروازے کھول دیے ہیں تاکہ عورتیں اور بچّے پناہ لے سکیں۔ ساجد نے رابعہ سے کہا کہ وہ بچوں کو لے کر وہاں چلی جائے۔ ''اور آپ؟'' رابعہ نے روتے ہوئے پوچھا۔

''میری فکر مت کرو۔ اللہ مالک ہے!'' اس نے اپنی بیوی اور بچوں کو اوپری منزل پر بھیج دیا۔ کئی گھنٹے کے بعد پانی کی سطح بڑھنے میں کچھ کمی آئی۔ باہر بارش کے زور میں بھی کچھ کمی لگ رہی تھی۔ ساجد میز پر سے اتر کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور پیر اوپر کر لئے۔ ایک ہی جگہ پر کھڑے کھڑے اس کے پاؤں شل ہو گئے تھے۔ سردی کا احساس بھی ہونے لگا تھا۔ قیامت خیز رات تھی۔ بجلی بھی چلی گئی تھی۔ اندھیرا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ کرسی پر اکڑ کر بیٹھے بیٹھے رات گزر گئی۔ خدا خدا کر کے کھڑکی سے صبح کی کرن نظر آئی۔ پانی کا لیول بھی کچھ کم نظر آ رہا تھا۔ لیکن ابھی بھی ہر طرف پانی بھرا تھا اور عجیب سی بدبو آ رہی تھی جس سے اس کے سر میں تیز درد ہو رہا تھا اور سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کرسی سے اٹھ کر باہر لان میں گیا۔ باہر کا ماحول نسبتاً بہتر تھا۔ وہ ٹھیک سے سانس لے سکتا تھا۔ اس نے اردگرد نظریں دوڑائیں۔

قریب ہی درخت پر وہ چڑیا جس کے سریلے گیت وہ اکثر سنا کرتا تھا، بھیگی اور سہمی ہوئی

بیٹھی تھی۔ سردی سے کانپ رہی تھی۔ اس کا گھونسلہ بھی ٹوٹ چکا تھا، ساجد کے منہ پر ایک تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ خود کو اس چڑیا کی طرح بے بس اور لاچار محسوس کر رہا تھا۔ یہ گھروندے تلخ حقیقت کے طوفان کے ہاتھوں ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ اور ہم تہی دست، بے امان، یخ بستہ ہواؤں کی زد میں کانپتے رہ جاتے ہیں۔ یہ پرندے خوش نصیب ہیں کہ ہر حال میں جیتے ہیں۔ مگر ہم انسان ماضی کے درد اور مستقبل کی بے یقینی کے خطرے سے لرزتے ہیں۔ ہم زندگی کو جیتے نہیں صرف جینے کی تیاری ہی کرتے رہتے ہیں۔ کیا ہم انسان ان پرندوں سے بہتر ہیں؟ ان سے زیادہ قوی اور توانا، خوشحال اور خوش نصیب؟ ساجد نے ایک بار پھر نظر اٹھا کر چڑیا کی طرف دیکھا۔ اس کا گھونسلہ بھی اب پیڑ پر نہیں تھا۔ وہ کبھی اپنے گھر کی طرف دیکھتا کبھی پیڑ کی طرف اور کبھی سر اٹھا کر آسمان کی طرف تکنے لگتا۔ آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔

☆☆☆

Woh Ladka by Dr.Shadab Aleem(Asst.Prof.Dept.of Urdu
CCS University,Meerut)
ڈاکٹر شاداب علیم (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)

وہ لڑکا

تیج گڑھی چوراہا، میرٹھ کا نہایت گہما گہمی والا چوراہا ہے، جس پر پورے دن بسوں، ٹیمپو اور کاروں کی آمد و رفت، کئی ہزار لوگوں کی سی سی ایس یونیورسٹی میں روز کی موجودگی، تھوڑا آگے جا کر میڈیکل کالج میں شہر کے علاوہ گاؤں دیہات کے لوگوں کی آوت، جاوت اور شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی نے اس چوراہے کو شہر کے ہنگامی چوراہے میں تبدیل کر دیا ہے۔

چوراہے کے بائیں ہاتھ پر پولیس چوکی کی شاندار نصف دائرہ نما عمارت ہے۔ پولیس چوکی سے متصل بنجاروں کی ایک چھوٹی سی بستی آباد ہے جس میں تقریباً بیس بائیس خاندان ہے جن کے گھر ہیں نہ در بس چھوٹی چھوٹی جھگیوں میں بڑے بڑے پریوار گھٹن بھری زندگی پر آنسو بہاتے، لڑتے جھگڑتے بدرنگ زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ بستی کی عورتوں کی زندگی مشقت سے لبریز ہے، وہ دن بھر پتھر توڑتیں، سل بٹے، چکی، چکلے، اوکھلی، ہامن دستے بناتیں۔ مرد دارو پی کر جھٹولے پلنگوں پر پڑے مغلظات بکتے رہتے اور گٹکا چبا کر آس پاس کی فضا کو مزید مکدر کرتے رہتے ہیں۔ بستی میں چھوٹے بڑے بچوں کی ایک فوج نظر آتی ہے، شیر خوار بچے ماں کی چھاتیوں سے چپٹے ہوئے، قدرے بڑے بچے آس پاس کی نالیوں پر اکثر فراغت حاصل کرنے میں مشغول ہوتے۔ نوجوان نسل کرکٹ کی شیدائی جو خود کو دھونی اور وراٹ سے کم نہ سمجھتے۔ بستی کے وسط میں پیپل کا بوڑھا درخت ہے۔ جس کی بوسیدہ شاخیں اس کی قدامت کا اعلان کر رہی ہیں، ایک سایہ دار بزرگ کی مانند کھڑا ہے پیڑ کے چاروں طرف پتھر کا گول ہالہ بنا ہے جس پر عقیدوں کے اعتبار سے مختلف دیوتا وراج مان ہیں۔ روز صبح سورج دیوتا کی پوجا کے ساتھ ساتھ بستی کی عورتیں کوئی شیولنگ پر پانی چڑھاتی، کوئی کالی ماں کے چرنوں میں ماتھا ٹیکتی تو کوئی سنکٹ موچک ہنومان جی کا پرشاد بانٹتی۔ خدا کی بنائی یہ مخلوق دنیا میں پھیلی وبائی بیماری اور اس سے پیدا شدہ خوفناک مسائل سے بے نیاز اپنی دنیا میں مگن نظر آتی ہیں۔

میرا ایک ماہ قبل آئی سی آئی سی آئی پروڈینشی ایل میں میرٹھ آگرہ سے بطور سیلس منیجر ٹرانسفر ہوا تھا۔ میرا آفس بنجارہ بستی کے بالمقابل ہے۔ آفس سے ملحق ان خانہ بدوشوں یعنی بنجارہ بستی کے لیے سوچھتا سنگرام کے تحت سرکار کی جانب سے بنایا گیا سارو جنک شو چالیہ ہے جس پر جلی حرفوں میں لکھا ہے:

''اب نہ سہیں گے اوراپمان، کھلے شوچ سے مکت کریں گے اپنا بھارت مہان''

ایک شام، میں حسب معمول آفس سے نکل رہا تھا، میرے بچپن کے بہت ہی قریبی دوست سنجیو شرما، پی وی ایس مال سے ایک بڑا شو پر ہاتھ میں لیے آتے دکھائی دیے جنہیں دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ خوشی سے دل بلیوں اچھلنے لگا تھا۔ یوں بھی دیار غیر میں کوئی اچانک شناسا مل جائے تو کسی غیر معمولی نعمت سے کم نہیں ہوتا۔ علیک سلیک اور خیر وعافیت کے بعد آنے والے سنڈے اپنے گھر پر مدعو کر کے وہ چلے گئے۔ میں بھی گھر جانے کے لیے گاڑی میں بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ بشری ضرورت نے علم بغاوت بلند کیا۔ گھر تین کلومیٹر دور تھا تب تک اس بغاوت کو دبایا نہیں جا سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے برا بر کے سارو جنک شو چالیہ میں جانا مناسب سمجھا۔ شو چالیہ نہایت صاف ستھرا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر کی خاتون اور ساتھ میں ایک خوبرو نوجوان نے بڑھ کر استقبال کیا۔ میں نے اپنا آفس بیگ نوجوان کے سپرد کیا اور فراغت کے لیے چلا گیا۔ لیکن نوجوان کی مستعدی، اس کا چہرہ، اس کا اخلاق میرے ذہن و دل پر حاوی رہا۔۔ بعد ازاں میں نے نوجوان کو کچھ رقم دی۔ اس نے نہایت مستعدی سے طے شدہ رقم لے کر باقی مجھ کو واپس کر دی۔ چلتے ہوئے میں نے اس کا نام دریافت کیا تو اس کے جواب نے مجھے حیرت واستعجاب کے سمندر میں دھکیل دیا۔

ارے۔۔۔۔ارے بیٹے تم کس ذات سے ہو؟ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

جی۔۔۔۔صاحب۔۔۔۔۔۔میں۔۔۔۔۔۔۔۔میں شودر نہیں ہوں۔ اس نے سر جھکا کر قدرے شرمندگی سے کہا۔

پھر تم۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہاں کیسے؟

ہمارے ملک ہندوستان میں تو زمانۂ قدیم سے منوسمرتی رائج رہی ہے جس کے باعث اللہ کے بنائے ہوئے ایک جیسے بندوں کو چار طبقوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ برہمن، ویش، کھتری اور شودر۔ ہر ایک طبقے کے ذمے مخصوص کام اور خدمات تفویض کی گئی ہیں۔ اپنے کام سے روگردانی کرنا مذہبی اعتبار سے گناہ کے مترادف قرار دیا جاتا ہے۔ اس تقسیم کے باعث شودر طبقے کی ذمہ داری درد

ناک عذاب سے کم نہیں ہے اور نجات کی کوئی صورت نظر بھی نہیں آتی۔

وقت حالات کے ساتھ اپنی چال بدلتا رہتا ہے۔کیا کچھ ایسا ہی اس نوجوان کے ساتھ ہوا ہے؟ دل نے دماغ سے سوال کیا۔میں ابھی ان خیالات کے گھیرے میں تھا۔نوجوان کی آواز میری سماعت سے دوچار ہوئی اور میرے خیالات اناج کے دانوں کی طرح میری مٹھی سے نکل گئے۔

جی۔۔۔۔۔۔۔صاحب سرکار نے ان سارو جنک شو چالوں کو ٹھیکے پر اٹھایا ہے۔یہ ٹھیکہ رام داس شودر کو چھوڑا گیا تھا۔اسے یہاں کی صفائی، ستھرائی اور نگہ داشت کے لیے ملازمین کی ضرورت تھی۔اس کے لیے ایک انٹرویو رکھا گیا۔ میں نے انٹرویو دیا اور میری نیکتی ہوگئی۔لیکن تم۔۔۔۔۔۔۔

لڑکے نے میرے تجسس بھرے انداز کو جھٹکتے ہوئے تسلی بخش انداز میں کہا

''صاحب دیکھتے نہیں دوسال سے کورونا مہاماری اس پر لاک ڈاؤن کی ستم ظریفی نے ھم جیسے نوجوانوں کو بے روزگار کردیا۔فیکٹریوں پر تالے پڑ گئے۔بڑے بڑے مال بند ہوگئے۔مالکوں نے کئی کئی مہینوں کی تنخواہیں ضبط کرلیں۔گورنمنٹ سے ملنے والی سہولیات صرف اعلانات تک محدود رہ گئیں۔اس پیٹ کی آگ کو کیسے بجھائیں۔یہ جھوٹی تسلیوں اور وعدوں سے نہیں بجھتی۔اس کے لیے کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔صاحب! کام کوئی برا نہیں ہوتا، کام نہ کرنا برا ہوتا ہے۔یہاں چار ہزار روپے مہینہ تنخواہ طے پائی ہے جو ماں کی دوا، بچوں کی اسکول فیس اور ایک وقت کا چولہا جلا دیتی ہے۔''

میرے ماتحت سات لوگ آتے ہیں۔میں ان کا جمعدار ہوں۔وہ آگے کیا کیا کہتا رہا اور میں حیران پریشان کھڑا سوچتا رہا ہوں۔

یہ کس کے کرموں کا نتیجہ ہے؟ جسے نئی نسل بھگت رہی ہے؟

☆☆☆

kashmiri shairi mein insan dosti by aayina gul (Recommended by
Prof.Mahfooza jaan(HOD Kashmiri,University of Kashmir,Srinagar)
cell-9419004531,9906771553

آئینہ گل

کشمیری شاعری میں اِنسان دوستی

اللہ تعالی نے دُنیا میں بے شمار مخلوق پیدا کئے اور اِنسان واحد ایک ایسی مخلوق ہے جس کو ''اشرفُ المخلوق'' کا درجہ دیا۔ یعنی یہ مخلوق افضل ترین مخلوق یا تمام مخلوقات سے بہتر ہے۔ اِس بات کی اور اللہ تعالی کا ایک فرمان قابلِ ذِکر ہے ''خیرُ النّاسِ مَن یَنفعُ النّاس'' یعنے اچھا اِنسان وہی ہے جو باقیوں کے لیے اچھا ہو''۔ بنی آدم سے لے کر آج تک جتنے بھی فرمان آئے سب نے اِنسان دوستی یا باہمی بھائی چارے پر زور دیا۔ اور یہ سِلسلہ بنی آدم کے دُنیا میں آنے سے لے کر آج تک قابلِ ذِکر رہا۔ خواجہ میر دردؔ فرماتے ہیں۔

درد دِل کے واسطے پیدا کیا اِنسان کو ۔۔۔ ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھا کروبیاں

باہمی بھائی چارے پر تب سے خاص زور دیا گیا جب سے سماج ''Society'' کا تصور اُبر کر آیا۔ اس سماج کو توازن (Equilibruim) پر رکھنے کے لیے تمام مذہبی اور غیر مذہبی (Etheists) انسانوں کو ایک چھت تلے رہنا ہوگا۔ اب اگر ادب کی طرف دھیان دیں تو اِس مسلے پر افلاطون نے اُس وقت بحث چھیڑی جب اُس نے شاعری کو ترازو پر چڑایا اور اِخلاقیات کی بُنیاد پر اپنا تنقیدی نظریہ پیش کیا۔ خاص یہ بات کہہ کر کہ شاعری جوانوں پر غلط اثر ڈالتی ہے اور یہ اثر انکو غلط راستے کی اور لے جاتا ہے۔ شاعر جو کہ خود سماج کا ایک فرد ہوتا ہے کبھی بھی سماجی حالات سے دور نہیں رہ سکتا اور وہ ہمیشہ سماج کے حالات کا عکس ہوتا ہے۔ اگر ہم تمام شاعری کا مطالعہ کریں تو ایک بھی شاعر ایسا نہ ہوگا جس نے سماج کی اِصلاح کرنے میں کوئی کسر چھوڑی ہو۔

کشمیری تاریخ کی طرف نظر دوڑائیں تو ناگ اور پشاچ قوموں کا مِل جُل کر رہنا اِنسان دوستی کی ایک عمدہ مِثال ہے۔ دور بدلتے گئے اور کشمیر میں مُختلف حُکمران اپنے سِنگاسن سنبھالتے رہے جن میں کچھ بڈشاہ جیسے سخی اور کچھ مہرگُل جیسے ظالم قابلِ ذِکر ہیں۔ لیکن کشمیری قوم جن میں ہندو، مسلم، سِکھ، عیسائی سب ایک دوسرے کے ساتھ مِل جُل کر سالوں سال سے رہتے آرہے ہیں۔ اِن کی اِنسان دوستی، مہمان نوازی اور وادیے کشمیر کی خوبصورتی پر اسی لیے کہا گیا:

اگر فردوس بر روئے زمیں است ھمین است وھمین است وھمین است

ادب پر بھی اِنسان دوستی اور بھائی چارے کا بہت اثر پڑا کیونکہ ادب ہمیشہ سے ہی عام لوگوں کی اور مظلوم قوموں کی ترجمانی کرتا آرہا ہے۔کشمیر اور برصغیر میں بڑے بڑے بزرگوں نے جنم لیا اور عارفانہ کلام کے ساتھ ساتھ انہوں نے باہمی بھائی چارے پر کافی زور دیا۔حالانکہ ایسے دور بھی درپیش آئے جن میں قوموں کا بٹنا،نفرت،بغاوت،دھرموں کے مسلے اور فسادات جیسے مسلے عروج پر تھے مگر اِن لوگوں کی اِصلاح للّ عارفہ یوں کرتی ہے۔

شِو چھوے تھلہِ تھلہِ روزان موز ان ہیوندتے مُسلمان
ترُ ہے چھُکھ تہ پان پرزناو سوے چھے صاحبس ست زانے زان

للّ اس شعر میں مذہبی جگڑوں سے دور رہنے کی تلقین کر رہی ہے۔اور ساتھ میں خودشناسی پر بھی زور دے رہی ہے۔جس سے انسانوں میں باہمی بھائی چارہ پیدا ہوتا ہے۔للّ اکے اکثر شعروں میں یہ کیفیت دِکھتی ہے کہ وہ مذہب کے نام پر تفرق پیدا کرنے والوں سے ناراض ہے۔اور ہمیشہ اِنسان دوستی یا بھائی چارے پر زور دیتی نظر آتی ہے۔للّ کے بعد ہمارے ریشی ولی حضرتِ شیخ العالم اِس مِشن کو آگے چلاتے رہے اور لوگوں کی اِصلاح کچھ یوں کرتے ہیں۔

اکِس مالِس ماجہِ ہندن تِمن دے تھوُتھ کیا
مُسلمان کو ہِندن کر بندن توشہِ خُدا اے

یہ سِلسلہ چلتا گیا اور بہت سارے صوُفی بزرگ جیسے حبیب اللہ نوشہری،موٗمن صاحب، محموٗد گامی،سچھِ کرال،رحیم صاب سوپوٗر،شمس فقیر جیسے بُزرگ اپنے عارفانہ کلام کے ساتھ ساتھ باہمی بھائی چارے پر زور دیتے رہے۔پھر اُنیسویں صدی کے وسط میں مہجوٗر نے اِس موضوع پر زیادہ توجہ مرکوٗز کی۔

میے لاج شوٗب یتھ فانی سرایس اَولیا تہ دیوتا میے کِن آے
تیلہِ لج بستی بیلہِ یہِ ٹھِہر یایس یاوَن رایس چھِنہِ میان مامے

اُس وقت برصغیر میں ایک طرف تو انگریزوں کا ظُلم تھا مگر دوسری طرف آزادی کی رَو بھی نظر آرہی تھی۔ایک طرف لوگ آزادی کا خواب دیکھ رہے تھے تو دوسری طرف اُسی آزادی سے حالات اِتنے خراب تھے کہ لوگوں کا جینا مہال ہورہا تھا۔ایسے میں مہجوٗر فرماتے ہیں۔

گمت دَم پھُٹ چھِ ساری بیقراری چھِکھ دِلن اندر دپاں وَنہو پنُن احوال،اسہِ مالا یہِ آزادی

ادب شِناسوں نے بار ہا یہ کوشش کی کہ ادب زندگی کی اِصلاح کرے اور ادب جتنا ممکن ہو حقیقت کے قریب تر آئے۔ اسلئے اردو ادب میں ''ادب برائے زندگی'' کا تصور وجود میں آیا۔ اس تصور میں ادب کو کسی خاص نصب العین کی تبلیغ و اشاعت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسی ہی اور ایک مثال ترقی پسند تحریک۔ اس کا مقصد زندگی کے مسایل، مشکلات، دکھ سُکھ یعنی تمام پہلووں کی ترجمانی ہے۔ ایک طرف تقسیم ہند سے لوگ ہندوں اور مُسلمانوں میں بٹے تھے تو دوسری طرف دورِ جدید دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی۔ دورِ جدید میں جو اجنبیت، قنوطیت اور مایوسی اپنا سایا ڈھا رہی تھی اُس میں پورا عالم سما گیا۔ لوگ ایک دوسرے سے دور اَز دور ہوتے گئے۔ جدیدیت انسان کو تو ترقی یافتہ بنا رہی تھی لیکن مایوسی، بے بسی اور ظلم و ستم بھی اپنے دامن میں ساتھ لائی۔ ایسے ہی کشمیر میں لوگ مذہب کے نام پر ایک دوسرے سے بٹ رہے تھے اور ادبی حلقوں میں اس بات کو سنجیدگی سے لیا گیا تھا۔ ؎

مِلڈ ارست دنیا میہ چھُم یکسان بناوُن میہ چھُ ہیوندتہ مسلمان بیہِ انسان بناوُن (مہجور)

دِلس چھکن آم انگ کا تیاجگر ژٕٹھ پھل مے رنگ کا تیاہ

ژگرٕشھتہ لوت لوت قرار میانے بہار اَنتن شُمار کرِ ہے (دینا ناتھ نادم)

نیاے تراوِ ماے تھاوِو پانہ وان پوز محبت باگراوِو پانہ وان (مہجور)

کُنے عالم عالم کُنے آدم نمس ست ماز مازس نم یہِ کم ترووے دِلس اندر دیہِ ہُند نار اِنسانو (آزاد)

اس کے بعد لگ بگ سارے ہی شاعروں نے بھاہمی بھائی چارے پر زور دیا۔ چند اشعار:

اُلفتُک مَس باگراوُن چھُم مے ہر دم لولہ سان چھُم یہِ شاچ عبادت یہِے صحیح نماز (فاضل کشمیری)

مذہب چھُ اسہِ یکسان اس کُن ہیندتہ مسلمان

دوگنیار تراوِتھ اس چھِ دپان اس چھِ بس اِنسان (منوہر کنول)

یہِ چھُ سون وطن یہِ چھُ ہیندن، بودن، کلمہ گوین عیساین ہُند

یہِ شُدرن گورن پیرن کم لن ہُند سرنئے والن ہُند (مشعل سلطانپوری)

یہِ چھُ مالیُن للہِ ریہ تالیُن یتھ نُند ریش بورمُت لول دہے

یہِ چھُ آگُر لولُک سمڈا رُک ولہ مِلڈ اراس لول برو (مکھن لول کنولؔ)

ان سبھی مثالوں سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ ایک حساس شاعر کس طرح اپنے سماجی مسلے کو اجاگر کرنے کیلئے اپنے جذبات کو قلمی زبان دیتا ہے۔ یہ مسلے آج بھی زیرِ بحث ہیں اور عالمی و بنیادی سطح پر یہ مسلہ قابل بحث رہا ہے۔ ☆☆☆

Bachchon ke javed Nehal by Md. Altamash Khalid(Research Scholar Dept. of Urdu,Alia University,Kolkata)

محمد التمش خالد (ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، عالیہ یونیورسٹی، کولکاتا) (نگراں: ڈاکٹر درخشاں زریں)

بچوں کے جاوید نہال

ادب اطفال لکھنا نہایت ہی پیچیدہ عمل ہے کیونکہ بچوں کے ادب لکھنے کے لئے بچوں کے نفسیات ان کی پسند اور نہ پسند کا معلوم ہونا نہایت ہی ضروری ہے اگر کوئی بچوں کے نفسیات سے لاعلم ہے اور ان کی پسند و ناپسند سے نابلد ہے تو وہ ایک اچھی کہانی ان کے لئے لکھ نہیں سکتا اسی لئے کسی نے خوب کہا ہے ''بچوں کے لئے لکھنا بچوں کا کام نہیں'' بچوں کے مقابلے بڑوں کے لئے کہانیاں، افسانے، نظمیں وغیرہ لکھنا آسان اور سہل ہے۔ اس لئے ایک طرف جہاں بڑی تعداد میں بڑوں کے لئے نظم و نثر لکھنے والوں کی طویل فہرست ہے تو وہیں دوسری طرف بچوں کے لئے لکھنے والوں کی فہرست نہایت ہی کم ہے۔ خاص کر نثری میدان میں تو گنے چنے لوگ ہی ہیں جو بچوں کے لئے کہانیاں لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی کی ''مغربی بنگال اور بچوں کا اردو ادب'' میں پروفیسر اعزاز افضل لکھتے ہیں:

''جس زبان میں ادب اطفال کو بچکانہ ادب اور بچوں کے لئے ادب تخلیق کرنے والوں کو بچکانہ ادیب نام دیا جاتا ہو اس زبان میں بچوں کا ادب تلاش کرنا ایسا ہے جیسے ہندوستان میں قومی یکجہتی کو ڈھونڈنا'' (اعزاز افضل، مغربی بنگال اور بچوں کا اردو ادب صفحہ نمبر 09)

ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی کی کتاب ''مغربی بنگال اور بچوں کا اردو ادب'' کو سامنے رکھے تو ہمیں کچھ ایسے نام نظر آتے ہیں جنہوں نے بڑوں کے ادب کے ساتھ بچوں کے ادب پر بھی کام کئے ہیں۔ ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی نے اپنی مذکورہ کتاب میں بچوں کے لئے نظم اور نثر لکھنے والے ادباء و شعراء کو دو خانوں میں منقسم کیا ہے۔ انہوں نے پہلے شعراء کا ذکر کیا ہے جن میں جرم محمد آبادی، علامہ جمیل مظہری، پرویز شاہدی، اشک امرتسری، سید حرمت الاکرام، مظہر امام، علقمہ شبلی، ساگر چاپدانوی، محی الدین شاہین، معصوم شرقی، حشمت کمال پاشا، ذوالنورین صدیقی مسحور، محسن باعشن حسرت اور شہناز نبی ہیں جب کہ سالک لکھنوی، نشاط الایمان، جاوید نہال عابد ضمیر، شین کریمی، مشتاق اعظمی، نذیر احمد

یوسفی، کمال احمد، شوکت عظیم، محمد شان، اور جمیل ارشد کا ذکر بطور شار کیا ہے۔ گذشتہ ایک صدی کی بچوں کے ادبی تاریخ ہم دیکھیں تو ہمیں بڑوں کے مقابلے بچوں کے لئے لکھنے والوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ملتی ہے لیکن پھر بھی یہ کچھ کم نہیں ہے کہ بنگال میں بچوں کا ادب آج بھی لکھا جا رہا ہے حالانکہ اس کی رفتار دھیمی ہے لیکن کیا یہی کم ہے کہ آج بھی بچوں کے لئے لکھنے والے موجود ہیں۔ بڑوں کے لئے ادب لکھنے والے یہ جانتے ہیں کہ بچوں کے پیمانے پر وہ کھرے نہیں اتریں گے اور انہیں یقین ہوتا ہے بالغوں کے لئے ادب لکھ کر جس طرح وہ محفل لوٹ لیتے ہیں اس کے برعکس اگر انہوں نے بچوں کے لئے قلم اٹھائی تو ان کی ساری صلاحتیں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔

معروف صحافی، افسانہ نگار، تنقید نگار اور ادب کے کئی صنفوں میں اپنے قلم کا جوہر دکھانے والے ڈاکٹر جاوید نہال نے بھی بچوں کے لئے کہانیاں لکھی ہیں۔ سال 1990 میں آئی ان کی کتاب ''بے وقوفوں کا بادشاہ'' کو نہ صرف بچے بلکہ ہر عمر کے لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس میں کُل 16 کہانیاں ہیں۔ چند خامیوں اور کمیوں کے باوجود تمام کہانیاں فنی خوبیوں سے مزیّن ہونے کی وجہ سے دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ تمام کہانیوں میں اخلاقی درس پنہا ہے جو تہذیب سکھاتی ہے اور آداب زندگی کی دولت سے بھی مالا مال کرتی ہے۔ کتاب میں شامل کہانیوں پر تنقیدی نظر ڈالیں تو پہلی کہانی ''بے وقوفوں کا بادشاہ'' کے عنوان سے ہے جس میں انہوں نے ایک نہایت ہی شریف اور سیدھے سادھے شیام نامی ایک شخص کا کردار پیش کیا ہے جو اپنے بھولے پن کے ساتھ نہایت ہی بے وقوف تھا۔ اور اپنی بے وقوفی کی وجہ سے آخر کار وہ شیر کا نوالہ بن جاتا۔ مذکورہ کہانی سبق آموز ہونے سے ساتھ دلچسپ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا یہ عنوان آج ضرب المثل بن گیا ہے اور لوگ نہایت بے وقوف شخص کو' بے وقوفوں کا بادشاہ' کہہ کر پکارتے ہیں۔ کتاب میں شامل دوسری کہانی ''غرور کا سر نیچا'' ہے۔ مذکورہ کہانی میں چند فنی خامیاں ضرور ہیں لیکن سبق آموز ہے اور پڑھنے والوں کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ جاتا ہے کہ غرور انسان کو نہ صرف بدنام کرتا ہے بلکہ کہیں کا بھی نہیں چھوڑتا ۔ مذکورہ کہانی کی شروعات بھی ہماری قدیم کہانیوں کی طرح ہی ہوتی ہے جس میں راجہ خوش نیک اور اس کی رعیت خوش وخرم ہوتی ہے لیکن ان سب کے باوجود راجہ کو کوئی بات کھائے جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ پریشان رہتا ہے۔ جاوید نہال کہانی کی شروعات کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''پورب دیس میں ایک راجہ تھا اس کی سلطنت میں دودھ کی نہر بہتی تھی لوگ خوش خوش زندگی گزارتے تھے۔ راجہ کو بھگوان کا اوتار سمجھتے تھے۔ راجہ خوش نہیں تھا۔ راج کنیا جوان ہو چکی تھی مگر

اس کی پسند کا بہادر بر نہیں مل رہا تھا ایک رات بوڑھا فقیر راجہ کے نگر میں آیا فقیر کو دیکھ کر لوگ ڈر گئے بچے فقیر پر اینٹیں برسانے لگے فقیر کے سر پر ایک کنکر لگا خون بہنے لگا راجہ کے سپاہیوں نے بچوں اور لوگوں کو رگید رگید کر بھگا یا فقیر کو پکڑ لیا۔راجہ کے محل لے گئے۔

''تم کہاں سے آئے ہو؟'' راجہ نے پوچھا۔

''اسی دنیا سے، ساری دنیا بھگوان کا ہے''

راجہ سمجھ گیا کہ وہ دنیا سے بے تعلق ہے۔لالچی نہیں۔

راجہ نے کہا ''بابا آج کل میں بہت پریشان ہوں، راجہ ہوں رعیت خوش ہے، لیکن میں رنجیدہ ہوں۔''

''وجہ بتاؤ راجہ'' فقیر بولا۔

''میری بیٹی جوان ہوگئی ہے۔بہادر اور نیک سیرت بر نہیں مل رہا ہے'' ''بہت سے راج کنور ملے ہیں ،مگر سب بدچلن، مکار، فریبی''

''سلطنت میں اعلان کردو کہ پہلوانوں کے دنگل میں جو سارے پہلوانوں کو پچھاڑ دے گا اسے راج کنیا مل جائے گی''۔

مذکورہ کہانی پڑھنے کے بعد ذہن میں ایک مشہور کہانی یاد آجاتی ہے جو کافی مشہور ہے۔اسی کہانی کو ذرا بدل کر جاوید نہال نے اپنی یہ کہانی تیار کی ہے۔جس کہانی کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ اتنی مشہور ہے کہ اردو سے لگاؤ رکھنے والے اس کہانی سے ضرور واقف ہوں گے جس کہانی کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ کچھ یوں ہے:

''ایک پہلوان کشتی لڑنے کے فن میں بہت زیادہ ہوشیار تھا۔وہ کشتی کے تین سو ساٹھ داؤں جانتا تھا۔ ہر روز ایک داؤں سے کشتی لڑتا تھا۔وہ اپنے ایک شاگرد پر بہت مہربان تھا۔اس کو تین سو انسٹھ داؤ سکھا دیے۔صرف ایک داؤ نہیں سکھایا اور اس کے سکھانے میں ٹال مٹول کرتا رہا۔اس کا شاگرد کشتی لڑنے میں بہت ماہر ہو گیا۔ ہر طرف اس کی شہرت پھیل گئی۔کوئی پہلوان اس سے مقابلہ کرنے کے لیے اکھاڑے میں نہیں آتا تھا۔اس ملک کے بادشاہ کے سامنے پہلوان کے شاگرد نے کہہ دیا کہ استاد مجھ سے بڑے ہیں اس لیے ان کی عزت کرتا ہوں، ورنہ طاقت اور داؤ پیچ میں مجھ سے زیادہ قابل نہیں ہیں۔بادشاہ کو اس شاگرد کی بات ناگوار گزری۔اس نے حکم دیا کہ اکھاڑا تیار کیا جائے اور استاد اور شاگرد کی کشتی ہو جائے ایک بہت بڑے میدان میں اکھاڑا بنایا گیا۔کشتی کے مقابلہ کے روز بادشاہ اور

اس کے تمام وزیر بڑے بڑے حکّام اور عام لوگ یہ مقابلہ دیکھنے کے لیے جمع ہوئے۔ دوسرے شہروں کے بڑے بڑے پہلوان بھی کشتی دیکھنے کے لیے آئے۔ پہلوان اور اس کا شاگرد دونوں اکھاڑے میں اترے۔شاگرد اپنی طاقت کے گھمنڈ میں مست تھااور ہاتھی کی طرح جھوم رہا تھا۔استاد سمجھ گیا کہ شاگرد کے جسم میں اس سے زیادہ طاقت ہے۔جب کشتی شروع ہوئی تو استاد پہلوان نے وہ داؤ لگایا جو اپنے شاگرد کو نہیں سکھایا تھا اور شاگرد اس داؤ کے توڑ سے ناواقف تھا۔استاد نے اس کو سر سے اونچا اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ ہر طرف شور مچ گیا اور استاد کی تعریف ہونے لگی۔بادشاہ بہت خوش ہوا اور پہلوان کو بہت سا انعام دیا اور شاگرد کو خوب ڈانٹا اور کہا تو نے اپنے استاد کا مقابلہ کیا جس نے تمہارے ساتھ احسان کیا تھا۔ پھر بھی تم ہار گئے۔شاگرد نے جواب دیا۔بادشاہ سلامت! طاقت میں استاد میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔مگر انھوں نے ایک داؤ مجھے نہیں سکھایا تھا۔اسی داؤ سے مجھے ہرا دیا۔استاد بول اٹھا کہ اسی دن کے لیے میں نے وہ داؤ روک رکھا تھا اور تجھ کو نہیں سکھایا تھا کیونکہ عقل مند لوگوں نے کہا کہ دوست کو اتنا طاقتور نہ بناؤ کہ اگر کبھی دشمنی پر آمادہ ہو تو تم کو نقصان پہنچا سکے''۔

آیئے اب جاوید نہال کی کہانی ''غرور کا سر نیچا'' کا اقتباس دیکھتے ہیں:

''آنند نے چند لمحوں میں اپنے گرو کے سکھائے ہوئے داؤ سے اپنے حریف کو پچھاڑ دیا۔آنند نے باری باری دوسرے دو پہلوانوں کو بھی پچھاڑ دیا۔اکھاڑے میں نعرے بلند ہو رہے تھے۔آنند کی جئے،آنند کی جئے۔اس نے اپنے ملک کی لاج رکھ لی۔آنند غرور سے سینہ پھلاتے ہوئے بولا'' ہے اور کوئی ماں کا لال جو مجھ سے لڑے گا۔ان تینوں پہلوانوں کی طرح اسے بھی چٹکیوں میں مسل دوں گا''۔

آنند کے گرو کی غیرت جوش میں آ گئی۔وہ چارپائی سے اٹھا لنگوٹ کس کر اکھاڑے میں کود پڑا۔راجہ جانتا تھا کہ آنند کو اسی پہلوان نے پہلوان بنایا تھا،اس کا گرو تھا۔آنند گھمنڈ کے نتیجے میں چور تھا بولا ''آجاؤ تم کو پچھاڑنے میں کتنی دیر لگے گی'' راجہ بھی اکھاڑے میں آیا۔بولا'' آنند یہ تمہارے گرو ہیں ان کی عزت کرو۔گرو سے بھی کوئی لڑتا ہے'' آنند نے راجہ کی ایک نہ سنی۔''راج کنیا کو حاصل کرنے کے لئے میں سب کچھ کر سکتا ہوں'' ''پاگل کہیں کا''۔

دنگل شروع ہوا دس منٹ تک دونوں پہلوان ایک دوسرے کی گردن اور کمر میں ہاتھ نہ ڈال سکے۔سارے تماشائی دنگ تھے۔ایسی مزیدار کشتی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ایک گھنٹہ گزر گیا آنند پسینے پسینے ہو رہا تھا اپنے گرو کے خلاف سارے داؤ پیچ آزما چکا تھا،اسکی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنی دوگنی عمر والے پہلوان کو وہ کیوں پچھاڑ نہیں پا رہا ہے۔سارا مجمع ادھیڑ عمر کے پہلوان کی تعریف کر رہا تھا۔آنند

کا گھمنڈ چور ہو رہا تھا۔ مجمع میں ایک بوڑھے شخص نے کہا۔''آنند بدتمیز اور گستاخ ہے۔اپنے گرو سے کشتی لڑنے کو تیار ہو گیا'' کشتی کا دسواں راؤنڈ شروع ہوا۔ادھیڑ عمر کے پہلوان کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔ پلک جھپکتے آنند چاروں خانے چت تھا۔آنند ہار گیا تھا۔غرور کا آئینہ چور چور ''گروتم دغا باز ہو۔تم نے یہ گر مجھے نہیں سکھایا تھا''''گرو آخری گر مرنے سے پہلے کسی چیلے کو نہیں بتاتا۔تم جیسا ذلیل اور کمینہ چیلا مجھے کبھی نہیں ملا''۔

دونوں کہانیوں میں مماثلت صاف جھلک رہی ہے۔ڈاکٹر جاوید نہال کا''غرور کا سرنیچا'' پڑھیں گے تو آپ کو ان کی کہانی ایک دوسری معروف کہانی جس کا اولذکر میں نے کیا ہے کا چربہ لگے گا ۔دوسری بات انہوں نے اس کہانی میں ایک نوعمر اور خوبصورت شہزادی کی شادی ایک ادھیڑ عمر کے شخص سے محض اس بناء پر کردی کہ وہ زیادہ بہادر تھا۔مذکورہ کتاب میں شامل تیسری کہانی کو انہوں نے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے اس واقعہ سے تیار کیا ہے جس میں وہ ایک بھنگی کی عزت واحترام اس لئے کرتے تھے کہ وہ اس بھنگی کو اپنا استاد تسلیم کرتے تھے، واقعہ کچھ یوں ہے۔

''امام صاحب کا معمول تھا کہ وہ فجر کی نماز کے بعد صحن کے چبوترے پر بیٹھ جایا کرتے اور ذکر اذکار کے ساتھ غیر حل شدہ مسائل پر سوچ و بچار بھی فرمایا کرتے تھے، روزانہ ایک بھنگی امام ابوحنیفہؒ کے پاس سے گزرتا اور سلام کرتا جس کا جواب امام صاحب دیتے اور وہ اپنی راہ چلا جاتا۔اس دن امام صاحب کتے والے مسئلے پر اس قدر پریشان تھے کہ بھنگی نے سلام کیا تو امام صاحب نے جواب نہ دیا، اس نے دوبارہ سلام کیا، جواب ندارد، بھنگی نے تیسری بار سلام کیا مگر امام صاحب ابھی تک گم صم تھے۔امام صاحب نے کتے کی بلوغت کا مسئلہ اس کے سامنے رکھا، وہ مسکرایا اور عرض کی کہ امام صاحب اگر آپ یہ مسئلہ مجھ سے کل شام کو پوچھ لیا ہوتا تو رات پریشانی میں نہ گزرتی، اس کے بعد اس نے بتایا کہ کتا جب ٹانگ اٹھا کر پیشاب کرنا شروع کردے تو وہ بالغ ہو جاتا ہے۔امام صاحب نے صبح مجلس میں اس سوالی کو بلا کر اس کے مسئلے کا جواب پیش کردیا اور ساتھ یہ بھی بتادیا کہ مجھے اس مسئلے کا حل ایک بھنگی نے بتایا ہے، جو اس مسئلے کے بعد میرے شیوخ میں شامل ہو گیا ہے، مسافر بھی اس سوال سے مطمئن ہو گیا کیونکہ یہ مشاہدے کی بات ہے کتا بیٹھ کر پیشاب کرتے کرتے اچانک ٹانگ اٹھا کر پیشاب کرنا شروع کردیتا ہے، کہا جاتا ہے کہ اس دن کے بعد جب بھی وہ بھنگی امام صاحب کے گھر کے پاس سے گزرتا تو امام صاحب اس کے احترام میں کھڑے ہو جاتے اور جب گزر جاتا تو بیٹھا کرتے تھے، آپ کے کسی شاگرد نے ایک دن اس کا سبب پوچھا تو امام صاحب نے اسے بتایا کہ یہ بھنگی ایک مسئلے میں

میرا استاد ہے۔

اب جاوید نہال کی کہانی ''شاعر کی کہانی'' کا اقتباس دیکھیں:

''چلتے چلتے شاعر ایک فٹ پاتھ کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ بھائیو! ٹھہرو میں آتا ہوں۔ دوسری فٹ پاتھ پر ایک موچی جوتوں کی مرمت کر رہا تھا۔ شاعر موچی کے پاس گیا۔ احباب سمجھے کہ شاعر اپنی پھٹی جوتی سلانے گیا ہے۔ شاعر موچی کے نزدیک گیا۔ باتیں کیں۔ اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے، چوما اور دوستوں کے پاس چلا آیا۔ شاعر کی حرکت دوستوں کو بہت ناگوار گزری۔ ''تم نے ایک موچی کا ہاتھ کیوں چوما؟ گندہ اور غلیظ جوتے مرمت کرنے والا موچی، احباب کی آنکھوں سے نفرت جھانک رہی تھی ،۔ شاعر نے کہا دوستو! ناراض نہ ہو۔ دنیا میں کوئی شخص کام اور پیشہ چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔ یہ موچی میرا استاد ہے۔ ایک دن ایک شعر مجھ پر نازل ہوا۔ مگر قافیہ نہیں مل رہا تھا۔ اس نے بہت عمدہ قافیہ بتایا، معنی بھی۔ اسی دن سے موچی کو میں اپنا استاد مانتا ہوں انہوں نے مجھے مکتب اور مدرسہ میں نہیں پڑھایا مگر ان سے میں نے کچھ سیکھا''۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کا واقعہ اور جاوید نہال کی ''شاعر کی کہانی'' میں بھی کافی مماثلت ہے ۔ممکن ہے کہ کہانی لکھتے وقت ان کے ذہن میں ابوحنیفہؒ کا واقعہ موجود رہا ہو۔ ''شاعر کی کہانی'' میں انہوں نے استاد کی عزت اور تعظیم کرنے کا درس دیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ استاد کسی بھی پیشہ سے منسلک کیوں ہی نہ ہو، وہ استاد ہی ہوتا ہے۔ کتاب میں شامل ''لالچی کسان''، مختصر لیکن سبق آموز ہے جسے پڑھ کر لالچ جیسی قبیح حرکت سے باز رہنے کا درس ملتا ہے۔ کتاب میں شامل کہانی ''بارش'' بھی مختصر ہے لیکن اس کہانی کی خاص بات یہ ہے کہ اس کہانی کو پڑھ کر ہمیں اللہ کی مصلحت کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ اکثر ہم اپنے خلاف حالات دیکھ کر اللہ کی مصلحت سمجھ نہیں پاتے ہیں کہ یہ حالات جو ہمیں درپیش ہیں اس میں بھی اللہ کی کوئی خاص مصلحت ضرور شامل ہے کیونکہ وہی واحد پاک ذات ایسی ہے جو خیر میں شر اور شر میں خیر کا پہلو نکال سکتا ہے۔ کہانی ''بارش'' کا ایک اقتباس دیکھیں تا کہ اللہ کی مصلحت سمجھنے میں آسانی ہو۔

''رادھے شیام گاؤں میں داخل ہوا۔ اطمنان کا سانس لیا'' میں بہت ناشکر گزار تھا۔ بارش کو کوس رہا تھا۔ یہ بارش میری جان بچا گئی۔ میری اکلوتی بیٹی کا بیاہ ہوگا۔ اب کوئی رکاوٹ نہیں۔ اگر بارش نہ ہوتی بارود بھیگ نہ جاتا، بندوق سے نکلی ہوئی آگ مجھے نگل جاتی۔ دنیا سے رخصت ہو چکا ہوتا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور جل دیوتا کو ہاتھ جوڑے دعائیں دینے لگا''

مذکورہ بالا اقتباس اس واقعہ کی ایک کڑی ہے جس میں کہانی کا ایک کردار رادھے شیام کی بیٹی کی شادی تھی اور وہ شہر جا کر مہاجن سے روپئے لے کر جلد از جلد گاؤں پہنچنا چاہتا تھا لیکن راستہ میں ہی بارش شروع ہوجاتی ہے اور وہ پورا بھیگ جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بارش کو کوستا ہے۔ عین اسی وقت اسے مشہور زمانہ ڈاکو مان سنگھ گھیر لیتا ہے اور رقم نہیں دینے پر گولی مارنے کی دھمکی دیتا ہے لیکن رادھے شیام کسی بھی حال میں روپئے دینے کو تیار نہ ہوتا اور اپنے گھوڑے لے کر سرپٹ بھاگنے کی کوشش کرنے لگا ادھر مان سنگھ گولی چلانے کی کوشش کرتا ہے لیکن بارش سے بھیگ جانے کی وجہ سے گولی نہ چل سکی اور رادھے شیام اپنے محافظ کے ساتھ خیر خوبی اپنے گاؤں پہنچ جاتا ہے اب جا کر اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ جس بارش کو وہ اپنے لئے زحمت سمجھ رہا تھا دراصل وہی بارش اس کے لئے رحمت ثابت ہوئی۔ جس بارش کو وہ کوس رہا تھا وہی بارش نے اس کی جان بچا گئی۔ یہ ہم سب کے لئے بھی ایک درس ہے کہ ہم اللہ کی مصلحت کو نہ سمجھ پانے کی وجہ سے اللہ سے ناامید اور کبھی کبھی ناراض بھی ہوجاتے ہیں جب کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارے لئے کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ کتاب میں شامل پانچویں کہانی ''نقاب پوش ڈاکو'' ہے۔ جس میں انھوں نے ذات پات اور اونچ نیچ کو دکھایا ہے اتنا ہی نہیں کہانی کے اختتام پر ڈاکٹر جاوید نہال نے اونچ نیچ کی دیوار کو منہدم بھی کر دیا۔ جب ٹھاکر سنگھ کی بیٹی کی جان اور عزت نقاب پوش ڈاکوؤں سے ٹھاکروں کے بجائے ہرجنوں نے بچائی تو ٹھاکر سنگھ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ جس کا اظہار مذکورہ ذیل اقتباس سے بخوبی ہوتا ہے:

''ٹھاکر سنگھ نے رادھے شیام کو اٹھایا۔ گلے سے لگایا۔ بیٹا تیرے باپ نے میری آنکھیں کھول دیں ۔وہ اونچا تھا ہم نیچے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ راجپوت بدل گئے ۔غیرت ماری گئی بزدل اور ڈرپوک راجپوت میں کہلانا نہیں چاہتا۔''

کہانی کا مرکزی خیال راجپوت اور چھوٹی ذات کے ہرجنوں کے درمیان گھومتا ہے جس میں راجپوت ہرجنوں کو اپنی مندروں میں داخل ہونے نہیں دیتے اور نہ ہی اپنے کنویں سے پانی نکالنے دیتے تھے حالانکہ ہریجن کی اولادیں تعلیم یافتہ ہوچکی تھیں اور رہن سن میں وہ ٹھاکروں سے کم نہ تھی لیکن اس کے باوجود چونکہ وہ ہریجن تھے اس لئے ان کے ساتھ بھید بھاؤ کیا جاتا تھا۔ کتاب میں شامل ''وفادار مینا'' بھی ''نقاب پوش ڈاکو'' کی طرح بچوں سے زیادہ بڑوں کے لئے لکھی گئی کہانی لگتی ہے۔ اس کہانی میں ساس بہو کے جھگڑے کے ساتھ بیوی کی شوہر سے بے وفائی اور غیر مرد کے عشق میں گرفتار ہوجانا، مینا اور طوطا کا سوداگار کی بیوی کو بے وفائی سے باز رکھنے کی کوشش ۔ مینا کا سوداگر کی

بیوی کے ہاتھوں مارے جانا نیز سوداگر کی بیوی کی خادمہ کا اسے دوسرے مرد کے ساتھ میل جول بڑھانے پر اکسانا،طوطے کا سوداگر کو تمام واقعات کی جانکاری دینا وغیرہ کہانی کے تانے بانے بکھرنے نہیں دیتا۔مجموعی طور پر یہ اچھی کہانی ہے۔''عقل مند راجکماری'' اس پوری کہانی میں بھی ذات پات کو ہی دکھایا گیا ہے اس کہانی کی خامی یہ ہے کہ یہ اپنے عنوان سے بالکل میل نہیں کھاتا۔ پوری کہانی میں راج کماری کی کوئی عقلمندی سامنے نظر نہیں آئی۔''ایک سچا واقعہ'' کے عنوان سے انہوں نے ایک واقعہ پیش کیا ہے جسے ہر شخص کو پڑھنا اور عمل کرنا چاہئے۔اس واقعہ سے علم کی اہمیت کے ساتھ علم کو کاغذ کے علاوہ سینے میں محفوظ رکھنے کا بھی درس ملتا ہے۔تاکہ کسی صورت کاغذ ضائع ہو جائے تو سینے میں موجود علم سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''رازی ڈرتے ڈرتے سردار کے پاس گیا۔غار کی سردی کم کرنے کے لئے ڈاکوؤں نے الاؤ جلا رکھا تھا۔رازی نے کہا کل شام کے وقت جنگل کے قریب جو کارواں تمہارے ڈاکو ساتھیوں نے جو لوٹا تھا۔ میں بھی اس کارواں میں شامل تھا''۔رازی چپ ہو گیا پھر بولا گستاخی معاف ہو میں بھی لٹ گیا''۔''تمہارا کیا سامان تھا'سردار نے نرم لہجے میں پوچھا۔''معمولی چیزیں تھیں۔تھیلے میں کتابوں کے مسودے، چند کاغذات،معلومات افزا باتیں۔مختلف صفحات پر میں نے لکھ رکھی تھیں ستاروں کے بارے میں کیمیا گری۔نباتات،حیوان،جمادات کے متعلق''''کاغذ کے چند ٹکڑوں کے لئے تم اتنے پریشان کیوں ہو؟''''بابا میں انہیں جان سے قیمتی سمجھتا ہوں''ڈاکوؤں کا سردار قہقہے مار کر ہنسنے لگا۔تم یہ الاؤ دیکھ رہے ہو نا!اسی میں تمہارا علم جل رہا ہے۔رازی کے آنکھوں سے بے اختیار آنسو ابل پڑے۔

سردار نے کہا''اے نادان نوجوان!علم کاغذات کے صفحات پر محفوظ نہیں رہتا۔کاغذات ضائع ہو سکتے ہیں دیمکیں چاٹ لیتی ہیں ۔ بچے کبھی ان کو کشتیاں بنا کر تالاب میں بہا دیتے ہیں۔عورتیں چولہے کا ایندھن بنا دیتی ہیں''ڈاکو کا سردار کچھ دیر کے لئے خاموش رہا۔پھر بولا''بیٹا علم تو انسان کے دماغ اور سینے میں محفوظ رہتا ہے تم نے اپنے علم کو دماغ اور سینے میں محفوظ کر لیا ہوتا تو آج تمہاری یہ حالت نہیں ہوتی''۔دراصل ڈاکٹر جاوید نہال اس کہانی میں عرب دنیا کے مشہور اور نامور سائنسداں رازی کی کہانی بیان کی تھی۔جو اس واقعہ کے بعد ایک بار پھر علم کا مرکز شہر اصفہان لوٹ جاتے ہیں اور قریب دس سال مزید علم حاصل کرتے ہیں اور آج عرب کی تاریخ میں وہ ایک مشہور سائنسداں کے طور پر جانے جاتے ہیں۔کتاب میں شامل''نیکی کا پھل''ایک اچھی کہانی ہے جس میں

راجہ مان سنگھ کے خاندان کی ایک کہانی پیش کی گئی ہے۔''سونے کی ڈبیا''اس کتاب میں شامل ایک بہترین کہانی ہے۔ایسی کہانیاں آج لکھنے کی ضرورت ہے۔اس کہانی میں ایک کلرک کی ایمانداری کو ایک نئے انداز میں ڈاکٹر جاوید نہال نے پیش کی ہے۔پوری کہانی کلرک کے اردگرد گھومتی ہے۔اس کہانی میں ایک دولت مند شخص اپنے ملازموں کو کھانے پر گھر بلاتا ہے اس کے پاس ایک سونے کی ڈبیا رہتی ہے جو اسی دوران کہیں کھو جاتی ہے۔دولتمند شخص اپنے تمام ملازمین کی تلاشی لیتا ہے لیکن ایک ملازم تلاشی دینے سے گریز کرتا ہے۔اس کی اس حرکت سے باقی ملازم اس پر ہی شک کرتے ہیں لیکن دولتمند شخص اس ملازم کو کچھ نہیں کہتا نہ ہی اسے ملازمت سے برخاست کرتا ہے۔لیکن اچانک ایک دن اس کی سونے کی ڈبیا مل جاتی ہے تب وہ زیادہ حیران ہوتا ہے اور اس ملازم کو بلا کر تلاشی نہ دینے کی وجہ پوچھتا ہے'نوجوان میں بہت خوش ہوں''میری سونے کی ڈبیا مل گئی۔میرے کوٹ کی جیب کی سلائی کھل گئی تھی۔ڈبیا اندر چلی گئی تھی۔استر میں چھپ گئی تھی۔مگر میں سمجھ نہیں سکا کہ اس دعوت کے دن تم نے اپنی جیب کی تلاشی لینے کیوں نہیں دی۔سب تم پر شک کر رہے ہیں۔تم کو ہی چور سمجھتے ہیں۔نوجوان کلرک نے کہا''حضور میں اپنا راز آپ سے چھپانا نہیں چاہتا۔آپ مالک ہیں دیوتا سمان ،آپ نے ڈبیا کی چوری کے باوجود مجھ سے کچھ نہیں کہا۔نوکری نہیں لی۔دوسرے ساتھیوں کی طرح نفرت نہیں کرتے ہیں نوجوان کی آنکھوں سے آنسوں کے دو موٹے موٹے قطرے نکل پڑے۔وہ کچھ دیر کے لئے رک گیا پھر بولا''حضور میرے ماں باپ بہت غریب ہیں۔ایک جوان بہن ہے میں کچھ بھی کماتا ہوں ساری تنخواہ ماں باپ کو دے دیتا ہوں بہن کی شادی کے لئے روپئے جمع کرنا ہے،روکھی سوکھی کھا کر ہم گزارہ کرتے ہیں''مالک کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا،نوجوان کو اطمنان ہوا۔پھر بولا۔جس دن آپ نے اپنے تمام نوکروں کو دعوت دی تھی میری جیب میں دن کا کھانا پڑا ہوا تھا ہر صبح میری ماں ایک باسی روٹی اور چٹنی پیاز دے دیتی ہے۔دوپہر کو وہی کھا کر رہتا ہوں اس شاندار دعوت کے دن میری جیب کی تلاشی لی جاتی تو میں ننگا ہو جاتا۔روکھی سوکھی روٹی اور چٹنی ملتی''۔

مذکورہ بالا اقتباس کے آخر میں لفظ''ننگا''کے بجائے''رسوا''استعمال کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔مجموعی طور پر''سونے کی ڈبیا''ایک بہترین کہانی ہے۔''ایمانداری کا انعام''کتاب میں شامل ایک اور اچھی کہانی ہے۔اس کہانی کے اختتام میں ماں کا اپنے بیٹے کو بہروپی شکل میں پہچان لینا ممتا کی عمدہ مثال ہے۔کہانی کے آخری حصے میں شارجہ سے ڈھیر ساری دولت کما کر واپس لوٹنے والے احمد حسین اپنے ساتھی کے ساتھ اپنی ماں اور بھائی سے ملنے کے لئے شکل بدل کر آتا ہے اور کہتا ہے۔

''ماں شارجہ سے بھائی جان نے پیغام بھیجا ہے''

ماں چوکھٹ پر آئی۔ پردے کے پیچھے سے بولی۔'بھائی صاحب کا کیا پیغام ہے'' فقیر کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے ابل پڑے۔

''ماں، احمد حسین نے کہا ہے کہ وہ بہت خوش ہے۔ الجھنوں میں ماں کو بھول گیا تھا۔ اب بے چین رہتا ہے۔''

''اور کیا کہا ہے'' ماں بولی ''احمد حسین کو غلط نہ سمجھنا۔ ماں''

''بھائی تم خوش رہو'' فقیر جانے لگا۔

'احمد حسین'' ماں بولی۔

فقیر ٹھٹھک گیا۔ پلٹ کر دیکھا۔ ماں بے اختیار پردے سے نکل آئی۔ فقیر سے لپٹ گئی۔

''بیٹا تم سب کو دھوکہ دے سکتے ہو۔ ماں کو نہیں''۔

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ماں اپنے بچوں کو ہر صورت میں پہچان لیتی ہے۔ مذکورہ کہانی بچوں اور بڑوں دونوں کے لئے سبق آموز ہے۔ کچھ لوگ غیر مما لک جا کر اپنے گھر والوں بالخصوص ماں کو بالکل ہی بھول جاتے ہیں۔ غیر مما لک کی چکا چوند زندگی میں وہ اپنا شہر اپنا گاؤں اور اپنے گھر کو فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ دنیا کی سب سے لازوال دولت ماں کی بھی انہیں یاد نہیں آتی۔ لیکن ان سب کے باوجود ماں اپنے بچوں کو ہر حال میں یاد رکھتی ہے اور کبھی بھولتی نہیں۔ کتاب میں شامل ''دو دوست'' کی کہانی بھی بہت حد تک اونچ نیچ اور امیری وغریبی کے بیچ ہی چلتی ہے۔ حالانکہ راکیش اور راجیش کی دوستی کے درمیان ان کی دولت کبھی حائل نہیں ہوئی۔ راجیش دولت مند ہونے کے باوجود اپنے غریب دوست راکیش کے ساتھ ہمیشہ رہتا۔ اتنا ہی نہیں دونوں ایک ساتھ کاروبار شروع کرتے اور دولتمند بن جاتے ہیں۔ ''دعوت شیراز'' کے عنوان سے شیخ سعدیؒ کی ایک سچی داستاں انہوں نے قلمبند کی ہے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ نہایت ہی دلچسپ اور مشہور ہے۔ مشہور کالی داس کی کہانی ''قصہ کالی داس کا'' بھی دلچسپ ہے جو لوگوں کو پڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ کتاب میں شامل ''تین بہادر بچے'' سب کہانیوں سے طویل ہے۔ مجموعی طور پر کتاب میں شامل کہانیاں فنی خامیوں کے باوجود خوبیوں سے بھی مالا مال ہے۔ ڈاکٹر منصور عالم جاوید نہال: حیات وادبی خدمات (مونوگراف) میں رقمطراز ہیں:

''بنگال میں بچوں کے لئے لکھنے والوں کی تعداد انگلیوں میں گنوائی جا سکتی ہے۔ علقمہ شبلی، مشتاق

اعظمی، شفیع نشاط، حشمت کمال پاشااور جاوید نہال کے علاوہ کوئی نام ذہن میں نہیں آتا جس نے نہایت دلچسپی سے اس ادب کی طرف توجہ فرمائی ہوان میں جاوید نہال کی ان کہانیوں کا مجموعہ ''بے وقوفوں کا بادشا'' کے نام سے شائع ہوا جن کے ذریعہ موصوف نے بچوں میں غرور، لالچ، چغلی اور بے ایمانی جیسی برائیوں سے بچنے کی نصیحت کی ہے اس کے ساتھ ان تمام خوبیوں کو اپنانے کی تلقین بھی کی ہے جن سے انسان سماج میں اعلیٰ مقام پاتا ہےاور عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے''

(حیات وادبی خدمات: ڈاکٹر منصور عالم جاوید نہال، مغربی بنگال اردو اکاڈمی)

مجموعی طور پر بچوں کی نفسیات کو ذہن میں رکھتے ہوئے انہوں نے ان کے لئے یہ کہانیاں لکھی ہیں جو نہ صرف نہایت ہی دلچسپ، مزیدار اور لطف اندوز بلکہ بیحد کامیاب بھی ہیں۔

☆☆☆

Amir minayi ki rubaiyaat mein zaban-o-bayan ki nairangiyan by Mujtaba Hasan Siddiqui(Research Scholar,Dept. of Urdu,MANUU (Lucknow Capmus)

مجتبیٰ حسن صدیقی (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، مانو، لکھنؤ کیمپس)

امیرؔ مینائی کی رباعیات میں زبان و بیان کی نیرنگیاں

امیرؔ مینائی (۱۸۲۹۔۱۹۰۰) کلاسیکی شعرا کے سلسلے کی آخری کڑی تھے۔انہوں نے نہ صرف شعری اصناف میں کثیر سرمایہ یادگار چھوڑا ہے بلکہ نثری تصانیف کے نمونے بھی کم نہیں ہیں۔وہ شاعر ہونے کے ساتھ ہی لغت نویس، تذکرہ نگار، تاریخ گو اور مکتوب نگار بھی تھے۔ساتھ ہی فارسی میں بھی شاعری کرتے تھے۔ان کے دواوین اور مجموعے اس بات پر شاہد ہیں کہ ان کا شعری منظرنامہ بہت وسیع ہے۔انہوں نے اکثر اصناف سخن میں اپنے خیالات و تجربات کا اظہار کیا ہے۔غزل، قصیدہ، واسوخت، نعت، سلام، مخمس، مسدس، مثنوی، ترجیع بند، تضمین، قطعہ، سہرا اور رباعی جیسی اصناف کو امیرؔ نے وسیلۂ اظہار کے لیے استعمال کیا اور اس میں بہترین نمونے پیش کئے۔

امیرؔ مینائی نے رباعیوں کا باضابطہ مجموعہ تو ترتیب نہیں دیا مگر ان کے نعتیہ اور غزلیہ دیوان میں رباعیاں بھی درج ہیں۔غزلیہ دیوان 'دیوانِ امیرؔ' جس کا تاریخی نام 'مراۃ الغیب' ہے، اس کے صفحہ ۳۳۱ سے صفحہ ۳۳۵ تک ۳۰ رباعیاں درج ہیں۔زیادہ تر رباعیاں عشق کے جذبات کا اظہار یہ ہیں۔اسی طرح نعتیہ دیوان 'محامدِ خاتم النبیین' کے صفحہ ۱۴۶ سے ۱۴۹ تک ۱۹ رباعیاں درج ہیں۔یہ رباعیاں تقدیسی مضامین پر مشتمل ہیں۔اس طرح امیرؔ کی رباعیوں کی کل تعداد ۴۹ ہوتی ہے۔ان رباعیوں میں معشوق کے حسن و جمال کی تعریف، اس کے سراپا کا دلچسپ بیان، دنیا کی حقیقت کا ادراک، انانیت کی جھلک، عشق و معرفت اور اخلاقی تعلیمات کی ترسیل اور فلسفیانہ مضامین کے ساتھ ہی رسولؐ سے گہری محبت اور عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے۔رباعی خصی کے ساتھ ہی غیر خصی رباعیات کی مثالیں بھی امیرؔ کے یہاں موجود ہیں۔ان رباعیوں میں زبان و بیان کی وہی نیرنگی، کرشمہ سازی اور جلوہ طرازی پائی جاتی ہے، جو ان کی غزل کا خاصہ ہے۔سلامؔ سندیلوی ان کی رباعی گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''امیرؔ مینائی دراصل غزل گو شاعر ہیں مگر انہوں نے رباعیاں بھی کہی ہیں۔ان کی رباعیوں میں بھی ان کی غزلوں کی سی سلاست، روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔شاہ ممتاز علی آہؔ نے 'امیرؔ مینائی' کے نام سے ان کے کلیات کو ترتیب دیا ہے۔جس پر پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ کا پیش نامہ بھی ہے۔ اس میں ان کی ۱۱ رباعیاں درج ہیں۔اس کے علاوہ 'مراۃ الغیب' مطبوعہ نول کشور پریس میں ان کی ۳۰ رباعیاں موجود ہیں۔امیرؔ مینائی کی رباعیاں زیادہ تر عشق، تصوف اور معرفت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔'' (اردو رباعیات، سلام سندیلوی، نسیم بک ڈپو لکھنؤ، ۱۹۶۳، ص: ۳۹۲)

سلامؔ سندیلوی نے شاہ محمد ممتاز علی آہؔ کی جس کتاب کا ذکر کیا ہے وہ امیرؔ کا کلیات نہ ہو کر ان کے حالاتِ زندگی اور کمالاتِ شاعری پر مشتمل باقاعدہ ایک کتاب ہے۔اور اس میں رباعیات کے جو نمونے پیش کئے گئے ہیں وہ ان کے دواوین ہی سے ماخوذ ہیں۔امیرؔ کی رباعیوں کا مطالعہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ ان کی رباعیوں میں عشق و رومان کی مختلف جہتوں کو پیش کیا گیا ہے۔ان رباعیوں میں وہی مضامین نظم ہوئے ہیں جو کلاسیکی شعرا خصوصاً دبستانِ لکھنؤ کی شاعری کی نمایاں وصف ہے۔ان مضامینِ کہنہ اور پامال تشبیہات و استعارات کے باوجود امیرؔ کی رباعی، زبان کی سلاست اور طرزِ ادا کی انفرادیت کے سبب اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب نظر آتی ہے۔معشوق کی سیہ چشمگی اور جنبشِ لب کی اثر کاری کو دلچسپ انداز سے بیان کرتی ہوئی یہ رباعی ملاحظہ کیجئے:

زیبا ہے جو دم بھرتے ہیں مردم اس کا — قتالِ زمانہ ہے تکلم اس کا
کیا تیغِ دودم ہے اس کی تحریکِ دولب — کیا نیمچہ ہے نیم تبسم اس کا

پہلا مصرعہ ہی معشوق کے انتہائی حسن پر دلالت کرتا ہے۔دم بھرنا بمعنی آہیں بھرنا محاورہ تو ہے ہی لیکن مردم کا دم بھرنا تخلیقیت ہے۔کیونکہ مردم کا معنی انسان کے ہیں لیکن ایک معنی آنکھ کی پتلی کے بھی ہیں۔اسی طرح تیسرے مصرعے میں معشوق کے لب کو تیغ دودم سے تعبیر کرنا بھی خوب ہے۔لفظ دو کی تکرار بھی شعری حسن میں اضافہ کر رہا ہے۔آخری مصرعہ میں نیم تبسم کو نیمچہ کہنا، کمال تشبیہ ہے۔رعایتوں، استعاروں اور تشبیہوں کے سبب چاروں مصرعوں کے مجموعی تاثر سے معشوق کی جو تصویر بنتی ہے، وہ حسن و جمال کے درجۂ کمال تک پہنچتی ہے۔امیرؔ کا مقصد بھی چونکہ یہی تھا لہٰذا وہ اپنے مقصد کی ترسیل میں کامیاب ہوئے۔شعرائے متقدمین سے لے کر شعرائے متاخرین تک، سبھی کے یہاں معشوق کے لب و رخسار، چشم و ابرو اور گیسو و شانہ کے مضامین پر مشتمل شاعری کا وافر نمونہ موجود ہے۔امیرؔ نے بھی اپنی غزلوں کا تانا بانا انہیں موضوعات کے اردگرد بنا ہے۔معشوق کے ابرو کو

خنجر، ہلال، محراب اور کمان وغیرہ سے تشبیہ دی جاتی رہی ہے۔ امیرؔ نے بھی اپنی رباعیوں میں انہیں تشبیہوں سے رومان پرور فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک رباعی ملاحظہ ہو:

سنتا ہوں، ہوا جلوہ نما عید کا چاند ہے اس کی جدائی تو کجا عید کا چاند
وہ ابروئے پرخم نظر آئے جو مجھے البتہ یہ سمجھوں کہ ہوا عید کا چاند

معشوق سے جدائی عاشق کو دنیا اور معاملاتِ دنیا سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ پہلا مصرعہ اسی کیفیت کو بیان کر رہا ہے۔ خیال کے بتدریج ارتقا کو اس رباعی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ رباعی کے چاروں مصرعے عاشق کی بے بسی اور پژمردگی کو بیان کرنے میں باہم معاون ہیں۔ جدائی کا ایسا بیان جس میں شوریدگی کے بجائے سنجیدگی سے کام لیا گیا ہو، بمشکل ہی نظر آتا ہے۔ لیکن یہاں پر امیرؔ نے اس کا کامیاب طریقے سے اظہار کیا ہے۔ ابروئے پرخم کو عید کے چاند سے تشبیہ دینا بھی خوب ہے۔ اردو اور فارسی کی شعری روایت میں بعد از مرگ بھی وفا کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور امید وصل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنے کو عاشق کی خوبی بتائی گئی ہے۔ دکھایا گیا ہے کہ عاشق آرزو کرتا ہے کہ مرنے کے بعد اس کی خاک سے جام بنایا جائے تاکہ وہ معشوق کے لب کا بوسہ لے اور اس کی ازلی خواہش کی تکمیل ہو سکے۔ لیکن امیرؔ کا عاشق چونکہ لکھنوی تہذیب و معاشرت کا پروردہ ہے، اس لیے وہ بجائے وصل کی تمنا کے آرائش و زیبائش کا خواہاں نظر آتا ہے:

ایسا ہوں میں باوفا جو ہوں کشتۂ ناز ہڈی سے بنے شانہ پس سوز و گداز
وہ شانہ یقیں ہے ہمہ تن ہو کے زباں دے روز دعا کہ عمرِ گیسو ہو دراز

مرنے کے بعد ہڈیوں کا شانہ بننے کی تمنا رکھنا تاکہ وہ معشوق کی زلفیں سنوارنے کے کام آ سکے اور اپنی وفاداری کو ثابت کر سکے، ایسے مضامین کا اختراع وہی شاعر کر سکتا ہے جو خود لکھنوی معاشرت کا پروردہ ہو۔ رباعی کے پہلے اور آخری مصرعے اس اعتبار سے اہم ہیں کہ شاعر اسی کی درازیِ عمر کی دعا کر رہا ہے جس کے سبب وہ خاک میں مل گیا۔ عشق و رومان کے ساتھ ساتھ انانیت پسندی اور خودداری کے مضامین بھی امیرؔ کی رباعیوں میں نظم کیے گئے ہے۔ یہ خودداری اور انانیت پسندی ان کی صوفیانہ طبیعت کی دین ہے۔ جہاں ایک طرف وہ معشوق کے کی ناز برداری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو وہیں دوسری طرف شانِ بے نیازی کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ یہ تضاد صرف انہیں تک محدود نہیں بلکہ یہ اس عہد کا ایک عام رویہ تھا۔ رباعی ملاحظہ ہو:

بالفرض حیاتِ جاودانی تم ہو بالفرض کہ آبِ زندگانی تم ہو

ہم سے نہ ملو تو خاک سمجھیں تم کو لیں نام نہ پیاس کا جو پانی تم ہو

ابتدائی دونوں مصرعوں میں معشوق کے لیے حیاتِ جاودانی اور آبِ زندگانی جیسی تراکیب استعمال کرنا، معشوق کی عظمت اور اہمیت کا اعتراف ہے لیکن اگر معشوق، عاشق کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھ رہا ہے تو امیرؔ بھی اس کی قدرومنزلت کو سمجھنے سے انکار کرتے ہیں۔ چوتھے مصرعے میں یہ انکار نفرت کی حد میں داخل ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔کسی لکھنوی شاعر کے یہاں انانیت پسندی کا ایسا اظہار بذاتِ خود کسی اعجاز سے کم نہیں۔امیرؔ نے اخلاقی مضامین کو بھی اپنی رباعیوں میں برتا ہے۔ ان کے نزدیک دنیا نکہت ونور کا آشیانہ اور حسن وشباب کا گہوارہ ہے۔یعنی دل کی گمرہی کے سارے اسباب یہاں مہیا ہیں۔ اس کی رنگینی اور رعنائی میں الجھ کر رہ جانا دانشمندی نہیں۔ انسان کو دنیا میں ایسی زندگی گزارنی چاہئے جیسے گلشن سے بادِصبا گزرتی ہے۔ بالفاظِ دگر امیرؔ دنیا سے دل نہ لگانے کی تلقین کرتے ہیں:

کیا لطف اگر سارا زمانہ دیکھے دیکھے تو نگاہِ چشمِ دانا دیکھے
کر گلشنِ الفت میں گزر مثلِ نسیم آنا دیکھے نہ کوئی جانا دیکھے

آخری مصرعہ روزمرہ کی بہترین مثال ہے۔اسی قبیل کی ایک اور رباعی ملاحظہ ہو، جس میں امیرؔ نے اپنی زندگی کے تجربات کو عمدہ تراکیب اور منفرد اندازِ بیان کے ساتھ پیش کیا ہے:

خواہانِ طرب ہے، جسے ادراک نہیں آرام تہہِ گنبدِ افلاک نہیں
پیمانۂ گردوں میں کہاں بادۂ عیش جز دردِ تہہِ جام یہاں خاک نہیں

پہلے مصرعے میں دنیا کی عارضی لذتوں اور لمحاتی طرب ناکیوں کو مقصودِ زندگی بنانے والوں کو عقل وفہم سے مبرا مخلوق کہا گیا ہے۔ اور اس کی دلیل دوسرے مصرعے میں یہ دی گئی ہے کہ فلک، جو ظلم وجور کا استعارہ ہے، اس کے سائے تلے آرام وسکون کا حصول بے معنی ہے۔ تیسرا مصرعہ اپنی تراکیب، تشبیہات اور لفظیات کے سبب استادانہ شان کا مظہر ہے۔ پیمانۂ گردوں میں بادۂ عیش کی ترکیب سے جو شعری لطافت سے پیدا ہوئی ہے اسے ایک بہرہ مند قاری ہی محسوس کرسکتا ہے گردوں کو اس کی ساخت کے اعتبار سے پیالے سے تشبیہ دی گئی ہے اور چونکہ وہ مسلسل گردش میں رہتا ہے، جس سے حادثات رونما ہوتے ہیں، اسی سبب سے گردوں کو ظالم، جابر اور ستمگر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا پیمانۂ گردوں میں شرابِ عیش کا ہونا ممکن نہیں۔ مصرعے کے استفہامیہ انداز نے اس کے تاثر میں اضافہ کردیا ہے۔ گردوں اور پیمانہ میں ایک صفت مشترک یہ ہے کہ دونوں گردش میں رہتے ہیں، اس لحاظ سے بھی پیمانۂ گردوں کی ترکیب اپنی مثال نہیں رکھتی۔ چوتھے مصرعے میں 'خاک' کی ذومعنویت نے

رباعی کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ایک خاک کا معنی تو 'کچھ نہیں' کے ہیں لیکن جب ہم اس کو زمین کے معنی میں لیتے ہیں تو یہ رباعی کے لفظیاتی نظام سے ہم آہنگ ہوجاتا ہے۔

عشق و رومان ،تصوف و اخلاق اور تجربات و حادثات کے علاوہ امیرؔ کے یہاں خالص مذہبی مضامین پر مشتمل رباعیاں بھی اچھی تعداد میں ہیں۔تقدیسی نوعیت کی یہ رباعیاں حضور اقدس محمد مصطفیؐ کی شان مبارکہ میں ہیں۔ یہ رباعیاں محض آقائے نامدار محمد مصطفیؐ سے ان کی والہانہ عقیدت و محبت کا اظہار ہی نہیں بلکہ زبان و بیان اور فکر و خیال کے لحاظ سے بھی اپنا منفرد مقام رکھتی ہیں۔غیر خصی رباعی کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

ہیں زیرِ مزار خوابِ راحت میں حضور　　　اب بھی ہے مگر فیض سے عالم معمور
یہ سرِ خفی ہے عین اعلان وظہور　　　فانوس میں شمع ساری محفل میں نور

پہلے مصرعے میں جس بات کو سادگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اسی کو آخری مصرعے میں استعارے کا سہارا لے کر بڑی خوبصورتی کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔رباعی کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح شمع فانوس میں رہ کر بھی محفل کو مستنیر کرتی ہے۔اسی طرح حضور بھی زیرِ مزار آرام فرماتے ہوئے بزمِ عالم کو منور کئے ہوئے ہیں۔یعنی آپؐ کے فیض کا دریا ہنوز جاری وساری ہے۔دوسرے مصرعے میں جو دعویٰ کیا گیا ہے اس کی دلیل چوتھے مصرعے میں پیش کی گئی ہے۔ایک بات غور کرنے کی ہے کہ محض شمع کے فانوس میں ہونے سے محفل مستنیر نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے شمع کا روشن ہونا لازمی ہے۔یعنی شمع کشتہ سے روشنی کا استخراج نہیں ہوتا۔اب اگر ہم اس استنباط کو رباعی کے چوتھے مصرعے میں پیش کی گئی دلیل کے سامنے رکھتے ہیں تو بظاہر یہ دلیل معیوب نظر آتی ہے لیکن جب ہم علت کو معلول سے نہ سمجھ کر معلول کو علت سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں یعنی معکوسی طریقہ اپناتے ہیں تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ روشنی ہونے کا مطلب ہے، شمع کا روشن ہونا۔خواہ شمع نظر آئے یا نہ آئے۔اس سے یہ ثابت ہوا کہ حضورؐ زیرِ مزار خوابِ راحت میں ہیں اور اس طرح پوشیدہ رہتے ہوئے بھی اپنے احکام وتعلیمات اور سنن واحادیث کی بدولت محفلِ دنیا کو روشن کیے ہوئے ہیں۔معلوم ہوا کہ امیرؔ 'بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر' پر ایمان رکھتے ہیں۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن پاک میں آپؐ کی عظمت ورفعت کا بیان مختلف پیرائے میں کیا ہے۔اس لیے امیرؔ کے یہاں بھی مختلف پیرائے میں نبیؐ کی عظمت و رفعت کا بیان ہمیں نظر آتا ہے۔چونکہ آپؐ اللہ کے حبیب اور سردارِ انبیاء ہیں لہٰذا جو مقام ومرتبہ آپؐ کا ہے وہ دیگر انبیائے کرام کا نہیں۔عظمت رسولؐ کے حوالے سے امیرؔ کی یہ رباعی ملاحظہ کی جاسکتی ہے:

احمدؐ کو شرف خدائے سرمد سے ملا   اعزاز سب انبیاء کو احمدؐ سے ملا
جاں بخشئِ عیسیٰ، ید بیضائے کلیم   جو کچھ جس کو ملا محمدؐ سے ملا

چاروں مصرعوں میں حسبِ مراتب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ آخری مصرعے میں جو قطعیت ہے وہ امیرؔ کا آپؐ سے والہانہ وابستگی اور عقیدت مندی کا ثبوت ہے۔ تیسرا مصرعہ صنعتِ تلمیح سے آراستہ ہے، جس کے سبب امیرؔ کا نقطۂ نظر مزید پر اثر ہو گیا ہے۔ امیرؔ نے مذہبی خیالات اور ذاتی معاملات کے علاوہ آفاقی اہمیت کی حامل رباعیاں بھی کہی ہیں۔ انہوں نے حیاتِ انسانی اور نفسیاتِ انسانی کو بھی اپنی رباعی کا موضوع بنایا ہے۔ یہ رباعیاں قاری کے ذہن و دل پر انمٹ نقوش چھوڑنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ انسان اپنی ماہیت اور حقیقت پر غور و فکر کرنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی ایک رباعی ملاحظہ ہو:

دنیا سے عدم کی سمت جاتے جاتے   بگڑے ہوئے کیا کام بناتے جاتے
آنا جانا تھا اپنا مانندِ نفس   تاخیر ذرا ہوئی نہ آتے جاتے

یہ رباعی انسان کی عارضی زندگی کا بیانیہ ہے اور اس میں انسان کی دنیاوی زندگی کو عدم کی طرف سفر کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ بھی ایک پامال مضمون ہے لیکن امیرؔ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایسے پیرایۂ اظہار کا انتخاب کیا ہے جو اس مضمون کو جدت سے آراستہ کر دیتا ہے۔ اس کی ادائیگی کے لیے امیرؔ نے جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ نہایت ہی موزوں ہے۔ چاروں مصرعے اسی کیفیت میں ہیں جو نفسِ مضمون ہے یعنی عدم کے سفر کا بیان کرتے ہوئے یہ چاروں مصرعے بھی حالتِ سفر میں ہیں۔ یہ متحرک صورت قافیہ اور ردیف کی ہم آہنگی اور تکرار سے پیدا ہوئی ہے۔ آخری مصرعے میں 'آتے جاتے' جو لطف دے رہا ہے، اس کا جواب نہیں۔

امیرؔ کی رباعیوں میں اس نوع کی گلکاریوں کا ایک گلستاں آباد ہے۔ ان کی رباعیوں کے اس مختصر فکری و فنی مطالعے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ موضوعاتی سطح پر امیرؔ مینائی کی رباعیاں ان کی پاکیزہ طبیعت کی ترجمان اور معاشرتی تقاضوں کے اظہار کا حسین امتزاج ہیں۔ اندازِ بیان کی پختگی اور زبان کے تخلیقی استعمال کے سبب ان کی رباعیاں ممتاز اہمیت کی حامل ہیں۔ کوئی رباعی ایسی نظر نہیں آتی جس میں صنعتوں کا استعمال نہ کیا گیا ہو۔ تمام رباعیاں ان کے زبان و بیان کی نیرنگیوں کا مظہر ہیں، جن سے ہر ذی شعور قاری اور شعری جمالیات کا حامل شخص محظوظ ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

Azadi ke baad Afsana nigaron ki pahchaan by Nisar Ahmad Dar

(Pulwama,Jammu&Kashmir)cell-9797718227

نثار احمد ڈار (پلوامہ، جموں کشمیر)

آزادی کے بعد افسانہ نگاروں کی پہچان

ملک کی تقسیم کے بعد سیاسی مسائل تو کافی حد تک حل ہو گئے، لیکن سماجی معاشی اور نفسیاتی مسائل ابھر کر سامنے آئے۔ لوگوں کو نہ صرف اپنے صدیوں پرانے وطن کو چھوڑنا پڑا بلکہ اپنے عزیزوں، رشتے داروں اور بچپن کے ساتھیوں کو بھی چھوڑنا پڑا۔ آزاد ملک میں آنے کے باوجود انھیں نئے ماحول اور نئی جگہ میں شدید اجنبیت کا احساس ہوا۔ 1947ء کے فسادات اور تقسیم کی وجہ سے لوگوں پر قیامتیں گذر گئیں تاریخ میں ایسے المناک واقعات کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ افسانہ نگاروں نے فسادات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ بعض افسانہ نگاروں نے تو اس موضوع پر کئی کئی افسانے لکھے اور بعض افسانہ نگاروں نے ایک آدھ ہی افسانہ لکھا۔

کرشن چندر:۔ کرشن چندر ایسے افسانہ نگار ہیں۔ جنہوں نے آزادی کے بعد بھی لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا، اور مختلف موضوعات پر افسانوں کے کئی مجموعے لکھے۔ ان مجموعوں کے علاوہ کرشن چندر نے ہندوستان کی تقسیم کے موقع پر ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کو بنیاد بنا کر بھی کئی افسانے لکھے جن میں 'اندھے'، 'لال باغ'، 'جیکسن'، 'امرتسر' اور 'پیشاور ایکسپریس' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان افسانوں میں کرشن چندر نے اس وقت کی سیاست کے عوام مخالف کرداروں پر بلا جھجک اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے سیاسی برائیوں سے پیدا شدہ ماحول پر ضرب لگاتے ہوئے انسانی رشتوں اور جذبات کو اہمیت دی ہے۔ وہ ان افسانوں میں فرقہ واریت کی اصل ذہنیت اور صورت حال کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہیں اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لئے انسانیت پر مبنی سماجی نظام کی تعمیر پر زور دیتے ہیں۔

کرشن چندر کے شاہکار افسانوں میں 'کالو بھنگی' کافی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کہانی میں انہوں نے چھوٹی ذات سے تعلق رکھنے والے کالو بھنگی کے ذریعہ پسماندہ طبقات کی پریشان حال زندگی اور ان کے مسائل سے روشناس کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کہانی میں صرف کالو بھنگی کی پریشانیوں اور جدوجہد کو ہی پیش نہیں کیا گیا ہے بلکہ پورے سماج کی پست ذہنیت کو بھی ظاہر کیا گیا ہے۔

سعادت حسین منٹو:۔سعادت حسن منٹو اردو کے ان گنے چنے بڑے افسانہ نگاروں میں ہیں جن کی تحریریں آج بھی ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ وہ ایک صاحب اسلوب نثر نگار تھے جن کے افسانے، مضامین اور خاکے اردو ادب میں بے مثال حیثیت کے مالک ہیں۔منٹو ایک معمار افسانہ نویس تھے جنہوں نے اردو افسانہ کو ایک نئی راہ دکھائی۔افسانہ مجھے لکھتا ہے،، منٹو نے یہ بہت بڑی بات کہی تھی۔منٹو کی زندگی بذات خود ناداری، انسانی جدوجہد، بیماری اور ناقدری کی ایک المیاتی کہانی تھی جسے اردو افسانے نے لکھا۔منٹو نے دیکھی پہچانی دنیا میں سے ایک ایسی دنیا دریافت کی جسے لوگ قابل اعتنا نہیں سمجھتے تھے یہ دنیا گمراہ لوگوں کی تھی۔ جو مروجہ اخلاقی نظام سے اپنی بنائی ہوئی دنیا کے اصولوں پر چلتے تھے ان میں اچھے لوگ بھی تھے اور برے بھی۔ یہ لوگ منٹو کا موضوع تھے اردو افسانوں میں یہ ایک بہت بڑی موضوعاتی تبدیلی تھی جو معمار افسانہ نویس کی پہلی اینٹ تھی۔اس کے افسانے محض واقعاتی نہیں ہیں ان کے بطن میں تیسری دنیا کے پس ماندہ معاشرے کے تضادات کی داستان موجود ہے۔

منٹو نے فسادات کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ہجرت کے کرب اور انسانیت کی چیخ و پکار نے انھیں 'سیاہ حاشیے' جیسا افسانوی مجموعہ شائع کرنے پر مجبور کر دیا۔ان میں قتل، عصمت دری، لوٹ مار، پولیس کی بدعنوانی جیسے موضوعات کو طنز ومزاح کے پیرائے میں بیان کیا گیا تھا جس سے انسان کی حیوانیت اور وحشت سامنے اجاتی ہے۔تقسیم، مناسب کارروائی، کرامات، جیلی، تعاون، حلال اور جھٹکا، مزدوری، پٹھانستان، گھاٹے کا سودا، صفائی پسند، الہانا، ہمیشہ کی چھٹی، ارام کی ضرورت وغیرہ اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

عصمت چغتائی:۔عصمت چغتائی ۱۹۴۷ء کے فسادات سے عصمت چغتائی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔اگر چہ انھوں نے تقسیم ہند کے بعد پاکستان ہجرت نہیں کی۔لیکن ان کے بہت سے ساتھی بھائی، بہن اور ان کے بعض ہم عصر ادیب تقسیم ہند کے نتیجے میں ان سے بچھڑ گئے۔عصمت نے اردو افسانہ نگاری کے فن ایک نئی سمت اور نئی راہ عطا کی۔اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں منٹو، بیدی اور کرشن چندر جیسے بڑے افسانہ نگاروں کے ساتھ کاندھا سے کاندھا ملا کر اس فن کو فروغ دینے میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔عصمت ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں لہذا ان کے افسانوں میں متوسط گھرانے کی کہانیوں پر زیادہ توجہ دی گئیں ہیں۔ بھول بھلیا، ساس، بیمار اور جنازے جیسے افسانے متوسط گھرانوں میں پیش آنے والے واقعات کی بہترین عکاسی کرتی ہیں۔عصمت نے جو دیکھا،

محسوس کیا اسے بے جھجک تحریر کر ڈالا۔عصمت نے خصوصاً مسائل نسواں، آزادیِ نسواں اور حقوقِ نسواں جیسے مسائل پر زیادہ توجہ دی۔عصمت اپنی تحریروں کے ذریعہ معاشرے کی خرابیوں اور اس کی برائیوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔ چنانچہ غریب عورتوں کا استحصال، ان کی مرضی کے بغیر بے جوڑ شادیاں، ان کے پڑھنے لکھنے پر پابندی جیسے موضوعات عصمت کے افسانوں میں جا بجا ملیں گے۔عصمت پر ان کے افسانہ" لحاف'' کی وجہ سے فحش نگاری کا الزام لگا اور کورٹ میں مقدمات بھی چلے،جس میں عصمت کو بے قصور پا کر بری کر دیا گیا۔

راجندر سنگھ بیدی:۔راجندر سنگھ بیدی کرشن چندر اور منٹو کے ہم عصر تھے۔تقسیم ہند کے بعد انھوں نے افسانے لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا لیکن کرشن چندر اور منٹو کے مقابلے میں بہت کم لکھا۔ بیدی نے اپنا افسانوی سفر'' بھولا' ' سے شروع کیا، جو ۱۹۳۶ء میں شائع ہو کر مقبول عام ہوا، اور اب جب کہ بیدی کا افسانوی سرمایہ'دانہ و دوام' (۱۹۳۶) 'گرہن' (۱۹۴۴) 'کوکھ جلی' (۱۹۴۹) 'اپنے دکھ مجھے دے دو' (۱۹۶۵) 'ہاتھ ہمارے قلم ہوئے' (۱۹۷۴) اور 'مکتی بودھ' (۱۹۸۳) جیسے افسانوی مجموعے کے ذریعہ کل ۱۶۶ افسانے ہمارے سامنے آ چکے ہیں تو ہم انھیں دیکھ کر اس بات کو شدّت سے محسوس کرتے ہیں کہ بیدی نے اپنے افسانوں سے اردو افسانوی ادب کو ہی صرف قابل قدر ہی نہیں بنایا، بلکہ اس صنف ادب کو اپنے فکر و فن سے اس قابل بھی بنایا کہ ہم مغرب کی ترقی یافتہ زبانوں کے افسانوں کی صف میں اردو افسانے کو رکھ سکیں۔فسادات کے موضوع پر انہوں نے "لاجونتی" کے نام سے صرف ایک افسانہ لکھا جو فسادات پر لکھے جانے والے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔اس افسانہ میں بیدی نیا یک مغویہ عورت کی نفسیات اور معاشرے میں ایسی عورتوں کے ساتھ نفرت اور تحقیر آمیز رویئے کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ مغویہ عورت کے جذبات و احساسات اور سماج کی تنگ نظری واضع ہو جاتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی :۔احمد ندیم قاسمی ایک ایسے فکشن نگار ہیں جن کی کہانیوں میں محض رومانیت یا محض نام نہاد حقیقت نگاری نہیں بلکہ ایک پر خلوص جذبہ انسانیت ملتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا موضوع دیہات کے رہنے والے محنتی، جفاکش اور وہ عام لوگ ہیں جنہیں اپنی محنت کا صلہ بہت کم ملتا ہے یہاں تک کہ ان کی زندگی بہت ہی کسمپرسی کی حالت میں گزرتی ہے۔دیہات کے عام لوگوں کے مسائل اور جذبات ہی ان کا اصل موضوع ہے۔ان کے افسانوں میں حقیقی زندگی کا عکس بھرپور انداز میں نمایاں ہے اس کے ساتھ ساتھ محبت جو ایک کائناتی جذبہ ہے وہ بھی ان کے ہاں پوری آب و تاب

کے ساتھ جلوہ گر نظر آتا ہے۔گاؤں کی مخصوص ثقافت ،اقدار، رسم ورواج اور انتقام سے ان کے افسانوں کا تار و پود تیار ہوتا ہے۔ندیم نے زندگی کے حقائق کو صدیوں کی معاشرت اور روایت کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔سرمایہ دارانہ نظام کو شدید طنز کا نشانہ بنایا ہے جہاں امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہو رہا ہے۔محنت ومشقت کرنے والے کو دووقت کی روٹی مشکل سے نصیب ہوتی ہے اوراس طبقے کا مکمل طور پر استحصال کیا جاتا ہے۔احمد ندیم قاسمی نے تقسیم ہند سے کچھ عرصہ قبل جاگیردارانہ نظام اور طبقاتی کشمکش کے موضوع پر لکھنا شروع کیا تھا۔قیام پاکستان کے نتیجے میں انہوں نے بھی ہجرت اور فسادات کے مصیبتوں کا سامنا کیا اور اس موضوع پر کئی افسانے لکھے، جن میں" نیا فریاد" " اندمال"" کفن دفن"" ارتقاء" تسکین"" فساد"" میں انسان ہوں" اور" جب بادل امنڈ آئے" اور " پرمشیر سنگھ " شامل ہیں۔

شوکت صدیقی: ۔شوکت صدیقی نے تقسیم ہند سے قبل افسانے لکھنا شروع کئے،طبقاتی نظام اور لکھنؤ کی تہذیب ان کے افسانوں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔تقسیم ہند کے نتیجے میں انھیں بھی ہجرت کرنی پڑی، ہجرت اور فسادات کی تکلیف دہ حقائق ان سے چھپے ہوئی نہیں، انہوں نے لوگوں کو لوٹتے اور مرتے ہوئے دیکھا تھا۔ان حادثات اور واقعات کو انھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔" ڈھل چکی رات "" تانیتا" نیتا"" یہ بیمار "" ہفتے کی شام" اور" اندھیرا اور اندھیرا" فسادات کے موضوع پر لکھے گئے افسانے ہیں۔اندھیرا اور اندھیرا اور" ہفتے کی شام" موضوع کے لحاظ سے بہترین افسانے ہیں۔" اندھیرا اور اندھیرا" ایک طویل افسانہ ہے جس میں انھوں نے تقسیم ہند کے بعد مہاجرین کے ساتھ پیش آنے والے مختلف مسائل اور مقامی لوگوں کے رویے کو بہت باریک بینی سے بیان کیا ہے جوان کے تجربے اور گہرے مشاہدے کا ثبوت ہے۔

رام لعل: ۔رام لعل کے افسانے خواتین کے مختلف مسائل، معاشرے کے رویے اور عورتوں کی وفا و ایثار کے موضوع پر ہوتے ہیں۔فسادات کے نتائج میں انھیں پاکستان سے ہجرت کرنی پڑی جس کا انھیں بے حد دکھ تھا اور وہ ساری زندگی پاکستان میں گزارے ہو دنوں کو بھول نہ سکے۔ہندوں اور مسلمانوں کے درمیان ہونے والے فسادات کا انھیں بے حد دکھ تھا۔جس زمانے میں ہندو مسلم فسادات عروج پر تھے اور ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو مارنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے ان حالات پر رام لعل نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

" گولیاں انسان پر نہیں، رام لعل پر چلائی گئیں، چھری انسان کے پیٹ پر نہیں، بلکہ رام لعل پر پھینکی گئی

ہے۔" (ظہیر آفاق "رام لعل کی افسانہ نگاری" دہلی شان ہند پبلی کیشنز ۱۹۹۲، ص ۲۱)

بلونت سنگھ:۔ بلونت سنگھ کا شمار بھی اردو کے بڑے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ بلونت سنگھ کا تعلق پنجاب سے تھا اس لئے ان کے افسانوں میں پنجاب کا ماحول، رومان، حقیقت نگاری، لوگوں کا اکھڑ پن اور زندہ دلی نظر آتی ہے ان کے اردو افسانوں میں بھی پنجابی زبان کے الفاظ اور محاورات بکثرت نظر آتے ہیں۔ بلونت سنگھ نے ہندی اور اردو، دونوں زبانوں میں افسانے لکھے ہیں۔ ان کے اردو افسانوں کی تعداد ۱۳۲ ہے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر افسانے تحریر کئے ہیں۔ بلخصوص پنجاب کے دیہات کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ پنجاب کے دیہات کو کھلی کتاب کی طرح قاری کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے افسانوں میں نہ صرف دیہاتی عوام کے مسائل یا ان کے زندگی جینے کے طریقے کو موضوع بنایا بلکہ دوسرے موضوعات کو بھی اپنی کہانیوں میں پیوست کیا۔ جس سے ان کی تحریروں میں ہمیں پیار و محبت، ہمدردی اور انسانیت کی بے پناہ مثالیں دیکھنے کو مل جائیں گی۔ ان کو مصلح قوم تو نہیں کہہ سکتے ہیں لیکن انہوں نے افسانوں کے ذریعہ قوم کے نام اشاروں و کنایوں سے کئی پیغامات چھوڑے ہیں۔ فسادات کے موضوع پر انھوں نے "پہلا پتھر" "کالے کوس" "دیبلے" "تعمیر" جیسے عمدہ اور منفرد افسانہ لکھے۔

خواجہ احمد عباس:۔ خواجہ احمد عباس کا شمار اردو کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں مقصدیت اور افادیت کا غلبہ صاف نظر آتا ہے۔ خواجہ احمد عباس ایک حساس افسانہ نگار ہونے کے علاوہ ایک جرات مند صحافی بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں جرات، بے باکی اور گہراہ مشاہدہ انھیں دیگر افسانہ نگاروں میں انفرادیت بخشتا ہے۔ سماجی زندگی کی کشمکش اور انسانی نفسیات ان کے افسانوں کے خاص موضوعات ہیں انھوں نے جس موضوع پر اپنا افسانے لکھے بہت جرات، بے باکی اور سچائی سے لکھے لیکن ان کی یہ بے باکی منٹو اور عصمت کی بے باک سے بالکل مختلف اور پریم چند کی شائستگی اور سچائی سے بہت قریب ہے۔ خواجہ احمد عباس نے فسادات کے موضوع پر جو افسانے لکھے ہیں ان میں بھی انسان دوستی کو ہی افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ فسادات کے موضوع پر انھوں نے "اجنتا" "میجر رفیق مارا گیا" "اردو" "میری موت" "واپسی کا ٹکٹ" "شکر اللہ کا" جیسے افسانے لکھے۔ الغرض ہم یہ کہہ سکتے ہے کہ موجودہ دور کے افسانوں میں عہد نو کے جتنے موضوعات، مسائل اور اسالیب ہو سکتے ہیں وہ سب برتے جارہے ہیں اور تشفی بخش تعداد میں افسانے سامنے بھی ارہے ہیں۔ موضوعات و مسائل اور زبان کے لحاظ سے نہ تو اردو افسانہ کم تر ہے اور نہ ہی تہی

دامن۔مگر ایک سوال ذہن میں ضرور پیدا ہوتا ہے کہ نئی صدی میں بھی دو دہائی کا عرصہ بیت گیا،افسانوں کی ایک معتد بہ تعداد سامنے اچکی،مگر اب تک اِن افسانہ نگاروں میں سے اکثر نے نمایاں شخصیت قائم کیوں نہیں کی؟ یا ان کے افسانوں نے وہ توجہ حاصل کیوں نہیں کی جنہیں بلا تردد اردو افسانوں کے کسی انتخاب میں بغیر کسی اختلاف کے شامل کیا جا سکے۔

امداد کتب:۔

١ ۔اردو افسانے کی روایت ١٩٠٣ سے ٢٠٠٩ تک،مرزا حامد بیگ۔

٢۔ ،معاصر اردو افسانہ---مابعد جدید رجانات،مکالمہ،مصنف مولا بخش۔

٣۔اردو میں مابعد جدید افسانے کے تشکیلی عناصر،مکالمہ،مصنف سید محمد اشرف۔

۴۔اردو میں علامتی اور تجریدی افسانہ،گوپی چند نارنگ،اردو افسانہ روایت اور مسائل۔

۵۔افسانے میں بیانیہ اور کردار کی کش مکش،مکالمہ،مصنف شمس ارحمن فاروقی۔

٦۔افسانے میں بیانیہ اور کردار کی کش مکش،مکالمہ،مصنف شمس ارحمن فاروقی۔

☆☆☆

Dr. Mohd. Akaram Osman ke Afsano ki numayan khususiyaat by Mohd. Iqrar(research Scholar,dept.of persian,JMI University,New Delhi)

محمد اقرار (ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی، نئی دہلی)

ڈاکٹر محمد اکرم عثمان کے افسانوں کی نمایاں خصوصیات

بنام خداوند جان وخرد کزین برتر اندیشہ برنگزرد

وضاحت: "چونکہ ڈاکٹر اکرم عثمان فارسی کے ادیب ہیں اور آپ کی تخلیقات فارسی یا انگریزی میں ہیں اس لئے میں نے نمونے کے طور پر پیش کردہ عبارتوں کا اردو ترجمہ یا مفہوم لکھا ہے اور جہاں مجھے محسوس ہوا کہ فارسی عبارت کا باقی رہنا لازمی ہے، وہاں عبارت کو بعینہٖ فارسی رکھا ہے۔"

ڈاکٹر اکرم عثمان کا مختصر تعارف: ڈاکٹر اکرم عثمان 2 مئی 1937 عیسوی کو ہرات میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کابل میں ہوئی۔ آپ نے تہران یونیورسٹی سے سیاسی علوم میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اس کے بعد افغان ریڈیو اور ٹیلیوزن میں قصہ گو اور اسٹوری رائٹر کی حیثیت سے کئی سال تک خدمات انجام دیں۔(1)

آپ کچھ عرصے تک افغان ریڈیو میں شعبہ ءهنر وادب کے صدر رہے اور "افغانستان رائٹرز اسوسی ایشن" کی بھی صدارت کی۔

اپنے ملک افغانستان سے ہجرت کرنے سے قبل ڈاکٹر اکرم عثمان نے 1990 سے 1991 کے درمیان تاجکستان کے دارالحکومت دوشنبہ میں بحیثیت "افغان کونسل جنرل" اور 1991 سے 1992 کے بیچ تہران میں افغانستان کے سفارت خانے میں نائب سفیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

اکرم عثمان "سویڈش رائٹرز یونین" کے رکن اور سویڈن میں فارسی کی مشہور زمانہ مگزین "فردا" کو پبلش کرنے والے ادیبوں کے گروہ "افغانز پین کلب" کی صدارت کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ فروری 2014 کو حکومت افغانستان کی جانب سے ڈاکٹر اکرم عثمان کو دری فارسی ادب میں ان کی نمایاں خدمات کے لئے "غازی میر مسجدی میڈل" سے نوازا گیا۔ اکرم عثمان کے اکثر افسانے ریڈیو یا ٹیلیوزن کے زریعہ یا کتاب کی شکل میں منظر عام پر ہیں اور فارسی دری کے ناظرین و قارئین کو محظوظ و مستفید کر رہے ہیں، اور کئی افسانوں پر افغانی فلم سازوں کے ذریعے فلمیں بھی بن

چکی ھیں جن میں "مردھاراقول است" اور" دریاب خان" معروف تر ہیں۔ڈاکٹر اکرم عثمان 11 اگست 2016 کی شام اس دار فانی سے دار بقا کی طرف کوچ کر گئے۔آپ نے اپنے دری افسانو، ناول اور دیگر تخلیقات کی شکل میں جو ادبی ورثہ پیچھے چھوڑا ہے وہ آپ کو ہمیشہ علم والوں کے درمیان زندہ رکھے گا جیسا کہ حکیم فردوسی کا شعر ہے:

نمیرم از ین پس کہ من زندہ ام   کہ تخم سخن را پراگندہ ام

اب تک ڈاکٹر اکرم عثمان کے افسانوں کے کئی مجموعے چھپ کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔

آپ کی معروف ادبی تخلیقات:

وقتی کہ نی ھا گل می کنند	درز دیوار	مردھاراقول است	دختری پا بہ زنجیر
قحط سالی	دریاب خان	کوچہ ما (ناول)	از بیخ وبتہ
آن بالا واین پایین—افسانوں کا مجموعہ		عین کوزہ گر	

ڈاکٹر اکرم عثمان کے افسانوں کا موضوع:

سماجی مسائل: بیسویں صدی کے نصف اخیر میں افغانستان نے جس طرح سے سیاسی وسماجی اتھل پتھل دیکھی ہے، چاہے وہ 1973 کے تختہ پلٹ سے لے کر 1978 کا تختہ پلٹ،سوویت یونین کی افغانستان پر چڑھائی اور 1979 میں پھر سے تختہ پلٹ،کمیونسٹ حکومت، وقت کے صدر جمہوریہ محمد نجیب اللہ کا قتل ہو یا پھر مجاھدین کی حکومت، پھر طالبان کا قبضہ، امریکی اتحادی فوجوں کا حملہ، اور پھر متنازع جمھوری انتخابات ہوں، ڈاکٹر اکرم عثمان ان میں سے اکثر حادثات کے چشمدید گواہ رہے اوران حادثات کا یہ اثر آپ کی تحریروں میں دیکھنے کو ملتا ہے اورآپ نے ان تمام سیاسی وسماجی مسائل کو اپنے افاسانوں کا موضوع سخن بنایا۔آپ نے اپنے افسانوں کے ذریعہ عام انسان کی زندگی کی عکّاسی کی ہے۔اپنے مشہور زمانہ افسانے" وقتی کہ نی ھا گل می کنند" میں اس طرح عام جن کے رہن سہن اور کام کاج کی منظرکشی کرتے ہیں: جس کا اردو مفہوم ہے:

"لوہاروں کے بھاری بھر کم ہتھوڑے لگا تار گرم لوہے پر پڑ رہے تھے اور ہر چوٹ کے ساتھ ہی چنگاری اٹھتی تھی اور لوہا ایک شکل اختیار کر لیتا تھ۔ا۔

بھٹّی کی آگ میں جھلسے ہوئے چھرے، میلے کچیلے کام۔کا جی ہاتھ اور کھرے کھوٹے انداز میں بات کرنا لوھار لوگوں کی خاصیت تھی۔شائد ان کی سوچ میں جواں مردی اور بہادری، لوہے کے ساتھ ان کے گہرے تعلق کی وجہ سے آ گئی تھی۔ان ہی لوہاروں میں اکبر دست قوغ بھی تھا۔۔۔(2)

آپ کے افسانوں کے کرادر اور ہیرو کوئی شہزادے، درباری عہدہ دار یا کوئی سپہ سالار نہیں بلکہ سماج کے عام طبقے سے تعلق رکھنے والے گلی کوچے کے سبزی فروش، نکڑ کے کاکا، اور علاقائی عام لوگ ہیں،

نمونہ: "در رست راست بازار، سلیمان کبابی، دستگیر قصاب، سھراب موچی، پشت کارگاہ ھا، پیشخوان ھا و دخل ھای شان قرار می گیرد۔(3)

فطری مناظر: ڈاکٹر اکرم عثمان کے افسانوں میں قدرتی مناظر مثلاً، ندی، پہاڑ، پیڑ پودے اور باغوں کا ذکر بہتات کے ساتھ ملتا ہے۔نمونے کا اردو مفہوم ملاحظہ ہو:

" کا کا اکبر شروع سے ہی لہروں کا دیوانہ تھا۔ یہاں تک کہ جب کابل کی ندی سوکھ جاتی تو کا کا" دینو" ندی کے کنارے بیٹھ جاتا بارش کے موسم اور ندی میں بہتے پانی کی کل۔کل کرتی لہروں کو یاد کر کے دیوانہ سا ہو جاتا۔اس کی دنیا ندی میں ہی بسی تھی۔"(4)

ایک اور اقتباس ماحظہ ہو:

"ایک سال بیت گیا۔ پہاڑوں اور درّوں کے راستے دوبارہ کھل گئے۔ بے شمار قافلے جنگلوں کے بیچ سے ہو کر آخر کار شہر تک پہنچ گئے لیکن اکبر دور۔دور تک کسی سواری پر نظر نہیں آیا"(5)

ڈاکٹر اکرم عثمان کے افسانوں کی زبان: ڈاکٹر اکرم عثمان نے اپنی افسانہ نگاری میں عام بول چال کی زبان کا استعمال کیا ہے۔چھوٹے۔چھوٹے سادہ و سلیس جملے، گلی کوچے کے لوگو کے درمیان علاقائی فارسی گفتاری لہجے میں مکالمے آپ کی تحریروں میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔

ضرب الامثال کا استعمال: ڈاکٹر اکرم عثمان نے اپنے افسانوں میں ضرب الامثال کا نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔آپ کے افسانوں میں فارسی ضرب الامثال مثلاً: "گِل خشک بہ دیوار نمی چسپد"، تا نباشد چیز کی مردم نگوئند چیزھا" اور چاہ کن را چاہ در پیش است" وغیرہ کثرت سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔(6)

ہندوستانی زبان کے اثرات: جب انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتا ہے تو اپنے ساتھ اپنی تہذیب وتمدّن کے ساتھ ساتھ اپنی زبان ولہجہ بھی لے کر جاتا ہے اور ان سب میں سے کچھ اس جگہ چھوڑ آتا ہے اور کچھ ان سب میں شامل کر کے لے آتا ہے۔پھر چاہے وہ مرکزی ایشیا سے فارسی زبان کا ھندوستان میں داخل ہونا اور یہاں پھلنا پھولنا ہو یا شبہ قارہ ھند سے مہاجرین کے ساتھ اردو کا دنیا کے بیشتر ممالک میں پہونچنا ہو یہ سب زبانوں کی ھجرت کی زندہ مثالیں ہیں۔جس طرح فارسی نے ھندوستان کی تقریباً سبھی زبانوں کو متاثر کیا ہے اسی طرح ھندوستانی زبانوں بالخصوص اردو نے بھی

فارسی زبان پر پلٹ کر اپنا اثر چھوڑا ہے اوران اثر پذیر لوگوں میں سے ایک ڈاکٹر اکرم عثمان بھی ہیں اکرم عثمان کے افسانوں میں بھی ھندوستانی زبان کے اثرات کثرت سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ چنانچہ ان کے افسانے" قحط سالی" کی ایک عبارت بطور مثال پیش کی جاتی ہے، لکھتے ہیں:

"سالِ بسیار سختی فرا رسیدہ بود۔ قحط غلہ، قحط چوب و ذغال، قحط میوہ و دانہ، قحط تیل وتمبا کو، قحط نان و آب، قحط عقل وہوش، قحط امن و آسایش، الیٰ آخرہِ۔۔۔۔(7)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:" ازھر دوسو، سر وصدا بالا است وسلام ھا، احوالپرسی ھا وبگومگو ھا ردو بدل وتیر و میری شوند و بہ زندگی، مرچ ومصالح ورنگ ورخش می بخشند۔"(8)

مندرجہ بالا عبارتوں میں لفظ" تیل وتمبا کو" اور مرچ ومصالح" خالص ھندوستانی الفاظ ھیں جن کو ڈاکٹر اکرم عثمان نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنی فارسی تخلیق میں استعمال کیا ہے۔

خلاصہ: خلاصہ یہ کہ ڈاکٹر اکرم عثمان کا شمار جدید دری افسانہ نگاری کے بنیاد گذاروں کی صف میں ہوتا ہے جنہوں نے عام جن کو روزمرہ پیش آنے والے مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دی اور نہ صرف جگہ دی بلکہ جا بجا ادبی محفلوں میں اپنے افسانوں کو روایت کی شکل میں لوگوں کو سنایا جس کی وجہ سے ناقدین نے آپ کو" روایتگر کابل" کے لقب سے یاد کرنا شروع کر دیا۔(9)

ڈاکٹر اکرم عثمان افسانہ نگاری میں ایرانی ادیب" بزرگ علوی" اور" سید محمد علی جمالزادہ" سے کافی متاثر تھے۔ اکرم عثمان نے عام لوگوں کی زندگی اور روزمرہ کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا جس کی وجہ سے ان کو گلی کوچہ اور بازار کا راوی کہا جاتا ہے مشہور فارسی ناقد حسین فخری لکھتے ہیں: جس کا اردو مفہوم ہے:

بنیادی طور پر اکرم عثمان گلی، کوچہ، نکّڑ، کابل کی قدیم روایات، گلی کے کاکا چاچا لوگ اور سماجی رسم و رواج کے راوی ہیں۔(10)

بیسویں صدی کے نصف اخیر میں افغانستان نے جو بے امنیّتی اور بے چینی دیکھی ایسی مثال ہزاروں سال کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ ڈاکٹر اکرم عثمان ان سب رواد ید کے عینی شاہد رہے اور ان کی تحریروں پر اس کا گہرا اثر پڑا۔ ایک نیوز چینل کو دئے گ؟ انٹرویو میں خود اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ ان حادثات کا ان کی ادبی تخلیقات پر اثر ناگزیر تھا۔ انٹرویو کے کچھ حصے کا اردو مفہوم پیش ہے:

" کچھ سال قبل ایک انٹرویو میں مجھ سے میرے نثری ادب کے بارے میں سوال ہوا تو میں نے جواب دیا کہ ہمارا داستانی ادب بالخصوص افسانہ اور ناول ان برسوں میں شدید متاثر ہوئے ہیں۔"

(11)

ڈاکٹر اکرم عثمان کی بیشتر تخلیقات کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے جیسے: ھندی، اردو، انگلش، جرمن، سویڈش، تاجک اور بلغاری وغیرہ۔ حاصل کلام یہ کہ ڈاکٹر اکرم عثمان آج کے افغانستان میں ایک ہمہ جہت شخصیّت کا نام ہے۔ آپ کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک طرف جہاں آپ نے ڈپلومیٹک فرائض انجام دئے تو وہیں دوسری طرف اپنے افسانوں میں استعارہ و کنایات کے ذریعہ سیاست پر بھی تنقید کی۔ ایک طرف جہاں آپ نے تاریخ کو اپنے افسانوں اور ناولوں میں جگہ دی، تو دوسری طرف سماج کے حال کو بھی اپنا موضوع سخن بنایا۔ ایک طرف جہاں بستیوں کے گلی کوچے، ناکے اور نکڑ کی نشان دہی کی تو وہیں پھول پودوں کی خوشبو، دریا کی موجوں کی کلکلاہٹ، پہاڑوں کی اونچائی اور دیگر فطری مناظر سے اپنے افسانوں کو سجایا ہیا یک طرف جہاں گلی کوچہ کی سادہ زبان کا استعمال کیا ہے تو وہیں دوسری طرف ضرب الامثال اور اردو الفاظ کے چیدہ۔چیدہ استعمال نے فارسی کی چمکتی پیشانی پر بندیہ کا کام کیا ہے۔

حواشی

http://afghandata.org:8080/xmlui/bitstream/handle/azu/4323/azu_acku_pamphlet_pk6561_i5_d87_1985_w

2۔ادھوری تصویر،ص35، باہمکاری سفارت افغان،(فارسی کہانیوں کا ترجمہ)

3۔کوچہ ما،جلد1 ص18، اکرم عثمان، مؤسسہ انتشارات عرفان، تھران، 1392ش۔

4۔ادھوری تصویر ص41

5۔ادھوری تصویر ص46

6– کوچہ ما، جلد1،ص19–20، اکرم عثمان، مؤسسہ انتشارات عرفان، تھران، 1392ش۔

https://www.kabulnath.de/salae_doum_s/

8۔کوچہ ما،ص،18 جلد2، اکرم عثمان، مؤسسہ انتشارات عرفان، تھران، 1392ش۔

https://tavaana.org/fa/Akaram_Osman

10 ۔ ادبیات معاصر،ص173، یادکرد، فصلنامہ فرھنگی، ادبی ھنری، شمارہ چھارم، خزان 1395

11– مقدمہ کوچہ ما، اکرم عثمان، مؤسسہ انتشارات عرفان، تھران، 1392ش۔ ☆☆☆

Nayi imagery aur Bashir Badr by Shams ul din Malik(Shams Niyazi)
research scholar,dept.of Urdu Cen.University of Kashmir,gandarbal
شمس نیازی (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر، گاندربل)

نئی امیجری اور بشیر بدرؔ

امیجری شاعری کی ایک کلیدی خصوصیت ہے۔شاعری لفظوں کی جمالیاتی تنظیم اور آہنگ کی ایک اعلیٰ ترین صورت ہے لیکن یہ محض لفظوں کی ساحری نہیں ہے بلکہ لفظوں کی دنیا سے بہت دور شاعر کے قلب وذہن میں اس وقت پہنچنے لگتی ہے، جب تخیل کی لہریں تیز ہونے لگتی ہیں، تخیل کی یہی لہریں اُبالِ جوش سے جب شاعر کے دریائے شعور سے نکل کر کاغذ کے ساحل پر آ کر شاعر کے باطنی طوفان کے نقوش لفظوں کی تصویروں سے دکھاتی ہیں تو شعر وجود میں آتا ہے۔مصوری اور شاعرانہ مصوری میں عمومی فرق یہ ہے کہ مصور رنگوں سے تصویریں بناتا ہے اور شاعر لفظوں سے تصویر کشی کرتا ہے۔ بنیادی طور پر مصور اور شاعر دونوں فن کار ہیں جو فرد اور معاشرے کے داخلی اور خارجی کرب و انبساط کا گہرا احساس رکھتے ہیں، اسی داخلی اور خارجی کرب وانبساط کی حسیت اور جذباتیت کا اظہار دونوں اپنے فن کے ذریعے کرتے ہیں۔مصور یہ اظہار رنگوں کی تصویروں سے کرتا ہے اور شاعر لفظوں کی تصویروں سے۔ مصوری یا امیجری جیسی اصطلاحات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تصور، امیجینیشن یا تخیل سے ان کا ازلی رشتہ ہے۔ ہر وہ فن جو تخیل سے ابھر کر سامنے آتا ہے، اسے تصویروں ہی میں ڈھل کر آنا پڑتا ہے، چاہے وہ ’’رنگ ہو یا خشت وسنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت!‘‘فنون لطیفہ میں رنگوں کی تصویروں کو مصوری کا نام پڑا، اینٹ گارے سے فن تعمیر کی تصویریں بنیں، پتھروں پہ کندہ نقوش سے سنگ تراشی کی تصویریں وجود میں آئیں، آلات وآواز کی خوشنما لہروں سے موسیقی نے جنم لیا اور لفظوں کی جمالیاتی مصوری کا نام شاعری پڑ گیا۔اہم یہ ہے کہ تصویر جس قدر حقیقت کی اعلیٰ مظہر ہوگی اسی قدر فن کو قبولیت نصیب ہوگی۔

شاعری میں امیجری کی باتیں صدیوں پہلے افلاطون اور ارسطو کے مباحث ہی سے دیکھنے کو ملتی ہیں۔افلاطون اپنی مثالی ریاست سے شعرا کو اس لیے ملک بدر کرتا ہے کہ اسے شعرا حقیقت کی تصویر کشی میں دو قدم دور نظر آتے ہیں۔اس کے برعکس ارسطو کا نظریہ ہے کہ شاعر اپنے تخیل کی پرواز

سے براہ راست عالم امثال تک رسائی حاصل کرتا ہے لہٰذا جو کچھ کہتا ہے وہ نقل کی نقل نہیں بلکہ اصل کی نمائندگی ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ ارسطو کے مطابق شاعر حقیقت کے بالواسط مشاہدے سے تصویر کشی کرتا ہے۔تخیل کی پرواز سے شاعر حقائق کی صورتوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور انھیں لفظوں کے پیکروں میں بالکل ایسا ہی حسن عطا کرتا ہے، جیسا کوئی مصور رنگوں سے بنائی گئی تصویروں کو عطا کرتا ہے۔ادب میں امیجری کو محاکات، تمثیل کاری، تجسیم کاری اور پیکر تراشی جیسے کئی نام دیے گئے۔اردو شاعری میں امیجری کا حسن شروع ہی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ولیؔ کے محبوب کا یوں برآمد ہونا کہ ''جیوں مشرق سے نکلے ہے آفتاب آہستہ آہستہ!'' امیجری ہی تو ہے۔میرؔ کی ''کلیوں کے تبسم'' اور غالبؔ کے'' نقش فریادی'' سے کون واقف نہیں۔لیکن شاعری میں امیجری کا رجحان جدید دور میں کچھ زیادہ ہی ابھر کر آیا، اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ اس دور میں ہماری شاعری نے نظریاتی، فنی اور تکنیکی سطح پر تیزی سے مغربی اثرات کو قبول کیا۔ان نئے تجربات میں تمثیل کاری (allegory) اور تجسیم کاری (personification) کو خاص طور سے اہمیت حاصل ہے۔تمثیل کاری (allegory) میں کرداروں یا شکلوں کے ذریعے مجردات کی نمائندگی ہوتی ہے۔

جب کہ تجسیم کاری (personification) میں کسی غیر مجسم شے، کسی تصور کو مجسم کیا جاتا ہے یا انسانی صفات سے آراستہ کیا جاتا ہے۔جیسے کہ ناصر کاظمی کے درج ذیل اشعار میں اُداسی اور فراق جیسے غیر مجسم اور مجرد تصورات کو مجسم کیا گیا ہے۔

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر اداسی بال کھولے سو رہی ہے
کدھر چلے گئے وہ ہم نوائے شامِ فراق کھڑی ہے در پہ مرے سر جھکائے شامِ فراق
بجھی بجھی سی ہے کیوں چاند کی ضیا ناصرؔ کہاں چلی ہے یہ کاسہ اٹھائے شامِ فراق

جدید غزل میں ناصر کاظمی سے امیجری کا نیا اسلوب سامنے آیا اور بعد کے آنے والے کئی شعرا کے ہاں بھی یہ تجربات ملتے ہیں، بشیر بدرؔ اس انداز میں سب سے نمایاں اور منفرد لہجے کے شاعر ہیں۔

کوئی پھول دھوپ کی پتیوں میں ہرے ربن سے بندھا ہوا وہ غزل کا لہجہ نیا نیا نہ کہا ہوا نہ سنا ہوا

بشیر بدرؔ جدید غزل میں نئی امیجری اور منفرد رنگِ تغزل سے پہچانے جاتے ہیں۔ان کا تعلق دور آزادی کے بعد کے شعرا میں ہوتا ہے۔۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے، آزادیِ ہند کے زمانے میں شعر گوئی شروع کی اور ۲۰۱۲ء تک محفل شعر و سخن میں متحرک رہے۔ابھی با حیات ہیں لیکن آواز اور قلم خاموش ہے۔اُس زمانے میں انھوں نے جو ظاہری و باطنی مشاہدات کیے انھیں اپنے منفرد اسلوبِ

شعر میں نئی نسل کے حوالے کیا۔ بشیر بدرؔ نے غزل میں تغزل کی نئی روح، امیجری کے نئے رنگ اور استعارات وعلامت کے نئے پن سے دبستانِ غزل میں اپنی اہمیت وافادیت کوتسلیم کرایا۔ ان کی غزلیں طرح طرح کے محاسن سے لبریز ہیں یہاں ہم ان میں سے صرف امیجری کے منفرد انداز پر بات کرنا چاہتے ہیں ؎

ابھی اس طرف نہ نگاہ کر میں غزل کی پلکیں سنوارلوں مرا لفظ لفظ ہو آئینہ تجھے آئینے میں اتارلوں

محبوب کے خدوخال یا سراپا نگاری کی تصویر کشی غزل میں ہوتے آئی ہے لیکن بدرؔ محبوب کی پلکوں اور گیسو سنوارنے پر قناعت نہیں کرتے بلکہ صنف غزل ہی کی پلکیں سنوارنے پہ اتر آتے ہیں۔ وہ لفظوں کو تراش کر آئینہ بنانے کی بات کرتے ہیں تاکہ وہ محبوب کے حسن کو دکھانے میں مطمئن ہوسکیں۔ بات صرف محبوب اور حسن محبوب کی نہیں ہے، بدرؔ ہر موضوع کی بہترین منظر کشی کا ہنر رکھتے ہیں لیکن محبوب چوں کہ غزل کا محبوب موضوع ہے لہٰذا بات یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ بدرؔ امیجری کے فن میں یدطولیٰ رکھتے ہیں اوراس کی دلیل ان کے سینکڑوں اشعار ہیں۔ شاعری کی سب سے نازک اوراہم ترین جہت خود کلامی کی ہے بدرؔ اس جہت میں بھی امیجری سے کام لیتے ہیں:

میں خزاں کی دھوپ کا آئینہ کہ میں ایک ہو کے ہزار ہوں
کہیں آنسوؤں کا ہوں قافلہ کہیں جگنوؤں کی قطار ہوں

بشیر بدرؔ کا پہلا شعری مجموعہ ''اکائی'' 1969ء میں شائع ہوا تو ان کی امیجری کے نت نئے انداز نے دنیائے شعروادب کو چونکا دیا، دوسرے مجموعے ''امیج'' کے آنے سے بدرؔ کی امیجری کا رنگ اور تیز ہوگیا۔ ''امیج'' 1973ء میں منظر عام پر آیا اس میں موجود شاعری امیجری کے وصف سے بھری ہوئی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مجموعہ بھی اسم بامسمّیٰ ہے۔ اس مجموعے کی امیجری کا اچھوتا رنگ ان کی شاعری کو اپنے معاصرین سے منفرد پہچان عطا کرنے کے لیے کافی ہے۔ اگر چہ اس میں دورائے نہیں کہ غزل امیجری کے نئے پن سے بدرؔ سے پہلے ہی آشنا ہو چکی تھی لیکن بدرؔ کی امیجری اتنی مختلف اور منفرد ہے کہ اس کے توسط سے وہ جدید شاعری میں ایک منفرد نام کے ساتھ جگہ بنانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ''امیج'' کی اشاعت کے ساتھ ہی بدرؔ اپنی امتیازی حیثیت قائم کرنے میں ایک طرح سے کامیاب نظر آتے ہیں لیکن ان کی شاعری کا تیسرا موڑ بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ یہ موڑ ''آمد'' کی اشاعت (1985) سے شروع ہوتا ہے اور بعد کے سبھی مجموعوں میں یہی رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ''آمد'' سے قبل بدرؔ اپنے معاصرین میں جگہ بنانے کے لیے کوشاں تھے لیکن ''آمد'' کی اشاعت

کے بعدان کی انفرادیت کواُردودنیانے تسلیم کرلیا۔ڈاکٹرمحمدحسن جیسے سربرآوردہ ناقدبھی یہ کہنے پرمجبور ہوگئے کہ ''غزل گوکی حیثیت سے بشیر بدرؔ کی شاعری پرایمان نہ لانا کفر ہے۔'' (سہ ماہی انتساب، بشیر بدرؔنمبر، شمارہ نمبر ۴۴،ص100) اس دور میں بشیر بدرؔ کونئی امیجری کا مقبول شاعرتسلیم کرنے کے ساتھ انھیں مشاعروں میں ''جدید غزل کے امام'' جیسے القاب سے یاد کیا جانے لگا۔ (https//:youtu.be/cC_q3MPEYIw) ''آمد'' کے بعدمجموعہ ''آسمان'' کی اشاعت (1993ء) سے بدرؔشہرت کے آسمان چھونے میں کامیاب ہوئے۔اس کے بعدآس، آہٹ اور بعد کے کلام کی اپنی انفرادیت ہے۔یہاں ان کے ابتدائی کلام سے ایک مثال درج ہے ۔

مست وسرشار تھے کوئی ٹھوکر لگی آسماں سے زمیں پہ یوں ہم آ گئے
شاخ سے پھول جیسے کوئی گر پڑے رقصِ آواز پر جھومتے جھومتے
آنکھیں آنسو بھری، پلکیں بوجھل گھنی، جیسے جھیلیں بھی ہوں نرم سائے بھی ہوں
وہ تو کہیے انہیں کچھ ہنسی آ گئی، بچ گئے آج ہم ڈوبتے ڈوبتے

یہ اشعار بدرؔ کے بالکل ابتدائی دور کی غزل سے ماخوذ ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ بدرؔ ابتدا ہی سے غزل میں نادر تشبیہات کے استعمال سے امیجری کا نیا رنگ بھرنے کا ہنر رکھتے تھے۔درج بالا شعر میں دیکھیے کس قدر دلکش حسّی بصری پیکر ظاہر ہوا ہے۔زندگی کے کسی موڑ پر اچانک ایک خوش وخرم اور مست وسرشار شخص کسی حادثے کا شکار ہوجائے یا اپنوں سے جدا ہوجائے اور سب کی سب خوشیاں پل بھر میں چھن جائیں، اس منظر کو بدرؔ شاخ سے گرتے ہوئے ایک ایسے پھول سے دکھاتے ہیں جو جھومتے جھومتے اپنے وجود کو مضمحل ہوتے دیکھے۔بلاشبہ ایک عاشق عشق میں مست وسرشار ہوتا ہے لیکن محبوب سے بچھڑتے وقت اس کا ایسا حال ہوتا ہے جیسے کوئی ٹھوکر اسے آسمان سے زمیں پر گرا دے۔دوسرے شعر میں بھی بہترین حسی بصری تصویر رقم ہے۔

بدرؔ کے کلام میں حواس خمسہ سے محسوس کی جانے والی تمام طرح کی تصویریں ملتی ہیں لیکن جدید دور کا انسان سب سے زیادہ دیکھنے کا عادی ہو چکا ہے۔بدرؔ بھی اپنے کلام میں زیادہ سے زیادہ حسی بصری تصویریں دکھاتے ہیں۔یہ تصویریں بعض مقام پر اتنی دلکش اور دلپزیر ہوتی ہیں کہ رنگوں کی تصویریں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتی ہیں۔

ہمارے ہاتھوں میں اک شکل چاند جیسی تھی تمھیں یہ کیسے بتائیں وہ رات کیسی تھی
مہک رہے تھے مرے ہونٹ اس کی خوشبو سے عجیب آگ تھی بالکل گلاب جیسی تھی

بدرؔ کو امیجری کا فن خوب آتا ہے اور تشبیہات سے وہ خوب سے خوب مناظر کو دو سطروں میں قید کرتے ہیں۔ سادہ لفظوں میں درج بالا پہلے شعر کا منظر یہ ہے کہ وصل کی رات میں محبوب شاعر کے روبرو ہے۔ شاعر ہاتھوں میں چاند جیسی شکل لے کر مصرعِ ثانی میں جو استفہام کا رنگ پیدا کرتا ہے، وہ دراصل قاری کے قلب وذہن پر ایک دستک ہے جو نئے در وا کرتے ہوئے اسے چاندنی رات کے ماحول میں لے جاتی ہے۔ ''تمھیں یہ کیسے بتائیں وہ رات کیسی تھی؟'' اس استفہام کے استفسار کے لیے بس اتنی سی فہم کافی ہے کہ آدمی وصل کی رات اور محبوب کے چاند جیسے مکھڑے سے واقف ہو تو نظروں کے سامنے چاندنی رات کا منظر آتے دیر نہ لگے۔ دوسرے شعر میں شاعر وصل سے پیدا شدہ آگ کو گلاب سے تشبیہ دیتا ہے۔ ''آگ'' (اس سے آتش عشق مراد ہے) مشبہ ہے، ''گلاب'' مشبہ بہ ہے۔ آگ اور گلاب کی تیز رنگت میں ایک وصفی مشابہت شعلہ سامانی کی ہے۔ لہٰذا ''شعلہ سامانی'' وجہ شبہ ہے۔ آتشِ عشق کا بیان غرضِ تشبیہ ہے اور حرفِ تشبیہ ''جیسی'' ہے۔ اس شعر کی فن کاری ہونٹوں کے خوشبو سے مہکنے میں بھی پوشیدہ ہے، اگرچہ گلاب کی پنکھڑی کو ہونٹوں سے تشبیہ دینا غزل میں عام ہے لیکن آتشِ عشق کو گلاب سے تشبیہ دینے میں بڑی جدّت طرازی ہے۔ جس طرح عشق کی آگ حُسن سے بھڑکتی ہے بالکل اسی طرح گلاب کی تیز رنگت کی نسبت بھی حُسن ہی سے ہے لہٰذا محبوب کے دیدار سے بھڑکی ہوئی آگ کو گلاب سے تشبیہ دینا عین موافق ہے۔ عشق کی آگ کو گلاب سے تشبیہ دینے میں یہ وجہ بھی کارفرما ہے کہ جس طرح عشق کی آگ اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہے اور اس کی شدت سے عاشق کے چہرے کا رنگ سرخ ہوجاتا ہے لیکن بہت تند و تیز ہونے کے باوجود بھی اس آگ کے شعلے ظاہر نہیں ہوتے، اسی طرح کا معاملہ گلاب کا ہے، جس میں اندر ہی اندر قدرت اپنے حُسن کی جلوگری کو تیزی بخشتی ہے، اس کا رنگ آگ سا ہوجاتا ہے۔ گلاب کی آگ اور آتشِ عشق میں یہ اشتراک ہے کہ دونوں میں ظاہری آگ کی طرح شعلے یا تپش ظاہر نہیں ہوتے بلکہ یہ اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہیں۔ بہرحال محبوب کے لب و رخسار، زلفوں اور چشم و ابرو کے بیان میں اکثر شعرا نے غزل میں تشبیہات کا سہارا لیا ہے۔ بدرؔ سب سے زیادہ آنکھوں کے شیدائی نظر آتے ہیں اور ان آنکھوں کی مستی کے افسانے چھیڑتے ہوئے بدرؔ کبھی جھیلوں کی بات کرتے ہیں تو کبھی تاروں کی۔ کبھی کبھی ایک ڈرامائی فضا بھی قائم کرتے ہیں ؎

جیسے کشمیری جھیلوں کی آغوش میں ننھے ننھے ستارے اتر آئے ہوں
رات ان نیلی آنکھوں میں کچھ ایسے ہی آنسوؤں کے دیے جھلملاتے رہے

آنسوؤں کے دیے تشبیہ بالاضافت ہے۔ بدرؔ کی شاعری میں آنکھ اور آنسو کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ بدرؔ آنسو کے بڑے قدر دان ہیں، انھیں وہ ہیرے موتی ہی نہیں چاند تاروں سے بھی انمول سمجھتے ہیں اور ان کے لیے نئے نئے پیکر تراشتے ہیں ؎

اندھیری رات کا تنہا مسافر مری پلکوں پہ اب سہما ہوا ہے
اک پل کی زندگی مجھے بے حد عزیز ہے پلکوں پہ جھلملاؤں گا اور ٹوٹ جاؤں گا

اندھیری رات کا تنہا مسافر بدرؔ نے آنسو کو کہا ہے، یہ ترکیب بلا مبالغہ قابل تحسین ہے۔ اندھیری رات میں ایک تنہا مسافر کو سفر درپیش ہو، وہ تنہائی اور تاریکی کے عالم میں کسی اسٹیشن پر سہما ہوا ہے۔ یہ بہترین اور قابل صد تحسین منظر بدرؔ نے اپنے منفرد استعاراتی انداز سے آنسو کے لیے لایا ہے۔ آنسو تنہائی ہی میں آتے ہیں اور بہتے جاتے ہیں یا پھر پلکوں پر سہمے سہمے سے ٹھہر جاتے ہیں۔ تشبیہات کا حُسن اپنی جگہ لیکن ابھی تک جو اشعار مثالوں میں پیش کیے گئے، ان میں امیجری یا پیکر تراشی قابلِ ستائش ہے۔ بدرؔ جدید امیجری کے شاعر ہیں، شاید اسی لیے ان کے ہاں حسّی بصری پیکر سب سے زیادہ نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ جدید دور کا انسان سب سے زیادہ دیکھنے کا عادی ہو چکا ہے۔ اسے باقی حواسِ خمسہ سے زیادہ آنکھوں سے دیکھے جانے والے منظر پسند ہیں، بدرؔ بھی ان مناظر کو کسی ویڈیو فلم ہی کی طرح قید کرتے ہیں ؎

پیار کی نئی دستک دل پہ پھر سنائی دی چاند سی کوئی صورت خواب میں دکھائی دی
وہ چاندنی سا بدن خوشبوؤں کا سایا ہے بہت عزیز ہمیں ہے مگر پرایا ہے

ان اشعار میں پیار کی دستک، چاندنی کا بدن اور خوشبوؤں کا سایا جیسی تراکیب سے دلکش پیکر بنے ہیں۔ شاعر نے سمعی، بصری اور شامی وسائل کا بہترین استعمال کیا ہے۔ پیار کی دستک کا دل پہ سنائی دینا سمعی ہے، چاند سی صورت کا دکھائی دینا بصری ہے اور خوشبو کا تعلق قوت شامہ یعنی سونگھنے سے ہے۔ ایک اور حسّی بصری پیکر ملاحظہ کیجیے ؎

تیرا جسم اشعار کے آئینے میں ایسا لگتا ہے چاند کو جیسے قید کیا ہو شیشے کی دیواروں میں

شاعر نے محبوب کے حُسن کو اپنے اشعار کے آئینے میں اتارا ہے لیکن یہاں آئینہ اپنے مجازی معنوں میں مستعمل ہے، جو شیشے کی مناسبت میں ایک شعری حُسن رعایت کا کام بھی دیتا ہے۔ غزل میں رمز و کنایہ میں بات ہوتی ہے اور ابتدا ہی سے اس میں رمز وایما کی آرٹ گیلری بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ تشبیہ ہو یا استعارہ، صنعتوں کا برمحل استعمال ہو یا مرقع نگاری، غزل کے لیے کوئی نئی

بات نہیں ہے۔ نئے دور میں نئے استعارات اور نئی علامات کا عمل بھی بدرؔ سے قبل ہی کئی شعرا نے بروئے کار لایا تھا لیکن بدرؔ نے جو تشبیہات اور استعارات وضع کیے وہ اپنے معاصرین سے بالکل مختلف اور منفرد نوعیت رکھتے ہیں۔ جس طرح کی پیکر تراشی اور تصویر کشی بدرؔ کے کلام میں ملتی ہے یہ ان کو ایک الگ پہچان دینے کے لیے کافی ہے۔ بطور مثال چند اشعار جن میں عشقیہ اور عصری حسیت کے مضامین ہیں ملاحظہ کیجیے ؎

اگر آسماں کی نمائشوں میں مجھے بھی اذن قیام ہو
تو میں موتیوں کی دکان سے تری بالیاں ترے ہار لوں

تجھے بھول جانے کی کوششیں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں   تری یاد شاخ گلاب ہے جو ہوا چلی تو لچک گئی

مرے بازوؤں میں تھکی تھکی ابھی محو خواب ہے چاندنی
نہ اٹھے ستاروں کی پالکی ابھی آہٹوں کا گزر نہ ہو

بت بھی رکھے ہیں نمازیں بھی ادا ہوتی ہیں   دل میرا دل نہیں اللہ کا گھر لگتا ہے

سر جھکاؤ گے تو پتھر دیوتا ہو جائے گا   اتنا مت چاہو اسے وہ بے وفا ہو جائے گا

آہستہ آہستہ دل پر دستک دو   دھیرے دھیرے یہ دروازہ کھلتا ہے

خون پانی بنا کے پیتی ہے   دھوپ سرمایہ دار لگتی ہے

جدید دور کے انسان نے ترقی کے کئی مدارج طے کیے ہیں لیکن یہ جسمانی ترقی جس سرعت سے طے ہوئی اسی سرعت سے روحانی اور اخلاقی قدروں کا تنزل بھی دیکھنے کو ملنے لگا۔ انسان ترقی کرتے ہوئے یقیناً آسمان چھونے لگا لیکن زمین سے دور ہوتا گیا۔ لالچ اور ہوس کی بڑھتی ہوئی روش نے انسان کو انسانیت سے دور کر دیا۔ اب حال یہاں تک پہنچ گیا کہ اس تنزلی پر ضمیر نے کوسنا بھی چھوڑ دیا۔ بے حسّی، بے غیرتی اور غفلت اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ انسان آنکھوں دیکھے ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ انسان کے لیے شاہین اور عقاب جیسے استعارے تو غزل میں موجود تھے لیکن بدرؔ نے اس کے منفی کردار کے لیے سانپ کا استعارہ بھی گھڑ لیا۔ انسان کے مردہ دل کو پتھر پایا تو پتھر ہی کہہ دیا ؎

پتھروں کی زمیں پتھروں کے شجر پتھروں کے مکاں پتھروں کے بشر
کب سویرا ہوا ہم کدھر کو چلے کس گلی شام آئی کہاں سو گئے

سرخ پٹی جو خطرے کی الارم کے طور پر لہرائی جاتی رہی ہے اور جس کو دیکھ کر انسان

دوڑے دوڑے، بچاؤ کے لیے نکل پڑتے تھے اب وہ سرخ کپڑا دیکھ کر پتھر دل کہاں پگھلتا ہے ۔
چونچ پتھر کی ہل نہیں سکتی گھاس میں ایک سرخ کپڑا ہے

سبھی اشعار کی وضاحت کا یہ محل نہیں ہے البتہ ایک شعر پر ایک مختصر وضاحت کیے دیتا ہوں۔ واضح رہے کہ بدرؔ نے نئے دور کے بعض ایسے اہم مسائل کو غزل میں شامل کیا ہے، جن کا ذکر منٹو کے افسانوں میں بھی برداشت نہیں ہوا۔ غزل کے مزاج میں ان موضوعات کو بیان کرنے کے لیے بدرؔ نے علامتی پیرائے میں امیجری کا بھرپور سہارا لیا ہے۔ درج ذیل شعر کا موضوع بھی کچھ ایسا ہی ہے، جس میں کالے پرندے، زرد پانی، فاختہ اور دھوپ کا پل جیسی ترکیبوں سے ایک کہانی رقم ہے، جس پر One act play کا گمان ہوتا ہے ۔

ان گنت کالے کالے پرندوں کے پر ٹوٹ کر زرد پانی کو ڈھکنے لگے
فاختہ دھوپ کے پل پہ بیٹھی رہی رات کا ہاتھ چپ چاپ بڑھتا رہا

کسی ہولناک واقعے کا ایک پورا منظر دو مصرعوں میں تغزل کے رنگ میں رقم ہے۔ منظر یوں ہے کہ ایک پل ہے، جس پر لاچار فاختہ بیٹھی ہے، اسی مقام سے کچھ کالے پرندوں کے پر ٹوٹ کر گرتے ہیں۔ ضرور یہ کالے پرندے فاختہ پر ٹوٹ پڑے ہوں گے اور اسی اتھل پتھل میں ان کے پر ٹوٹ کر گر رہے ہیں۔ پل بیٹھنے کے لیے نہیں بلکہ پار کرنے کے لیے ہوتا ہے اور پھر ایسا پل جس پر چلچلاتی دھوپ ہے فوراً ہی پار کیا جانا چاہیے لیکن فاختہ اسی پل پر بیٹھی ہے اور آج تک اسے یہ پل پار کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ کالا ہمیشہ ڈر، خوف اور وحشت کی علامت ہے، زرد رنگ کمزوری اور ناتوانی کی علامت ہے، دھوپ جبر کی علامت ہے اور رات بے سروسامانی کی! ان ساری علامتوں کو سمجھتے ہوئے شعر میں باندھے گئے منظر کی طرف توجہ دی جائے تو فاختہ پر ہونے والے ظلم و جبر کی تصویر نمایاں ہوتی ہے۔ بدرؔ نے فاختہ کی علامت کے ذریعے صنف نازک پر ہونے والے جبر کو اکثر بیان کیا ہے ۔

فاختہ کی مجبوری یہ بھی کہہ نہیں سکتی کون سانپ رکھتا ہے اس کے آشیانے میں

نئے استعارات اور امیجری کے حسن سے بدرؔ نے اپنے دور اور اپنے معاشرے کی بے رحم اور سنگین حقیقتوں کو بھی بیان کیا ہے۔ استعاراتی خوبیاں اپنی جگہ لیکن وہ استعارے سے شاعرانہ تمثالیں بنانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ استعارات اور علامتی انداز میں معنوی گہرائیاں ہوتی ہی ہیں شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ معنوی حسن پیدا کرنے میں کوئی کسر نہ رکھے اور یہ جبھی ممکن ہے کہ شاعر کمال کا

مصور ہو۔ بشیر بدرؔ کے درجنوں ایسے اشعار بطور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں جو تغزل کی انفردیت اور بے پناہ مصورانہ خلاقی کی دلیل ہیں۔ یہاں ہم ایسے ہی تین اشعار درج کرتے ہیں جنھیں پڑھ کر یہ تسلیم کرنے میں دشواری نہیں ہوتی کہ بشیر بدرؔ نئی امیجری کے امام ہیں ؎

جسے لے گئی ہے ابھی ہوا وہ ورق تھا دل کی کتاب کا
کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا کہیں آنسوؤں سے لکھا ہوا

مجھے حادثوں نے سجا سجا کے بہت حسین بنا دیا
مرا دل بھی جیسے دلہن کا ہاتھ ہو مہندیوں سے رچا ہوا

مرے ساتھ جگنو ہے ہم سفر مگر اس شرر کی بساط کیا
یہ چراغ کوئی چراغ ہے نہ جلا ہوا نہ بجھا ہوا

الغرض بشیر بدرؔ کی شاعری جدید غزل کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ انھوں نے روایتی مضامین کے مستعار لبادے سے ہٹ کر ایک نئی روش پر غزلیں کہنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود ان کی غزل میں کلاسیکی روایات کی پاسداری بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کے چند اشعار ایسے بھی ہیں جو نہ صرف اُردو کی تمام بستیوں میں اپنا لوہا منوا چکے ہیں بلکہ غیر اُردو دنیا میں بھی کافی مقبول ہیں۔ ان کی شاعری کو عوامی حلقوں میں جس قدر مقبولیت ملی ہے، اسی طرح ادبی حلقوں میں بھی خوب پذیرائی ہوتی رہی ہے۔ آج ان کا قلم خاموش ہے لیکن ان کی شاعری بول رہی ہے۔ وہ بسترِ علالت پر دراز ہیں دنیائے اردو انھیں ان کے اشعار سے یاد کر رہی ہے ؎

نہ جی بھر کے دیکھا نہ کچھ بات کی — بڑی آرزو تھی ملاقات کی
کئی سال سے کچھ خبر ہی نہیں — کہاں دن گزارا کہاں رات کی

☆☆☆

Ek afsana nigar: Dr. Syed Nasreen Ramzan by Sadaf Ara Mohd. Shafi Chaubdar(Research Scholar,dept.of Urdu Punya Shlok Ahelya devi holkar salar University Sola pur,M.S)

صدف آراء محمد شفیع چوبدار (ریسرچ اسکالر، پُنیہ شلوک اہلیا دیوی ہولکر سولا پور یونیورسٹی سولا پور)

ایک افسانہ نگار: ڈاکٹر سیّد نسرین رمضان

سیّد نسرین رمضان کی ایک طویل عمر ریاستِ مہاراشٹر کے شہر ’بارسی‘ میں گزری جو ’شولا پور‘ میں واقع ہے۔ وہاں اُنھوں نے پرائمری سے لے کر حاصل ڈی ایڈ تک کی تعلیم حاصل کی۔ تحصیلِ علم اور اعلیٰ تعلیم کی ہوس انھیں علمی شہر ’پونہ‘ لے آئی اور ’ساوتری بائی پھلے‘ یونی ورسٹی سے ’ڈاکٹریٹ‘ کی تعلیم حاصل کرنے لگیں۔ اسی عہد میں انھیں ’پونے مہانگر پالیکا‘ کی ایک اسکول میں ملازمت مل گئی اور وہ پونے ہی میں آبسیں۔ شہر پونے کی ادبی فضا میں ماہنامہ ’اسباق‘ کے مدیر نذیر فتح پوری اور معروف افسانہ نگار و مبصّر قاضی مشتاق احمد کی تحریریں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔ اسی گونج میں ’سیّد نسرین‘ نے ’اُردو ناول نگاری‘ کے موضوع پر اپنا مقالہ تحریر کیا اور ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ مقالے کے موضوع ہی سے ڈاکٹر سیّد نسرین کے ادبی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ ناول نگاری پر تحقیقی مقالہ لکھتے ہوئے اُنھیں بھی قلم برداشتہ ہونے کا شوق ہوا۔ درس وتدریس اور گھریلو ذمہ داریوں کی تکمیل کے بعد انھوں نے کہانیاں لکھنی شروع کیں۔

انھوں نے پہلا افسانہ ’ایسا بھی ہوتا ہے‘ کے عنوان سے ۱۹۹۰ء میں لکھا۔ دوسرا افسانہ ’بیچاری‘ کے عنوان کے تحت لکھا۔ انھیں علم تھا کہ ابتدائی تحریریں پختگی سے عاری ہوتی ہیں شاید اسی لیے ان دونوں افسانوں کی اشاعت ان کے لیے گراں رہی اور دونوں افسانے اشاعت کی زحمت سے محروم رہے۔ جنوری ۲۰۱۰ء میں انھوں نے تیسرا افسانہ ’بھرم‘ لکھا۔ اس افسانے میں کردار نگاری ،واقعات کا تسلسل اور زبان بیان قدرے بہتر محسوس ہوئے تو اشاعت کے لیے انھوں نے اس افسانے کو ماہنامہ ’فنون‘ میں بھیجا۔ ’بھرم‘ ان کا پہلا افسانہ ہے جس نے ماہنامہ ’فنون‘ کی زینت بن کر سیّد نسرین کو بحیثیت افسانہ نگار متعارف کرایا۔ اس افسانے کی پذیرائی نذیر فتح پوری صاحب جیسے مشاہیر نے کی۔ جس سے انھیں افسانے لکھنے کا مزید حوصلہ ملا۔

نسرین سیّد کا مزاج ان کے اسلوب نگاری کا خاصہ جو بہ یک نظر شعلہ بھی ہے اور شبنم بھی۔ ان کے افسانوں کا راست بیانیہ، اگرچہ تلخ اور قابلِ قبول نہیں مگر حق گوئی کا غماز ہے۔ ان کی تحریریں صاف گوئی اور بے باکی کی حامل ہوتی ہیں۔ وہ سماجی سرگرمیوں کا نہ صرف بغور مشاہدہ کرتی ہیں بلکہ ایک حساس دل کے ساتھ ہو بہو تحریر کرنے پر قادر ہیں۔ وہ اپنے اطراف و اکناف میں ہو رہے حادثات و واقعات کو دیکھتی، سمجھتی اور تجزیہ کرتی ہیں اور ہزار فکر کے بعد انھیں افسانوی رنگ میں ضبط تحریر کرتی ہیں۔ ان کا ایک افسانہ 'بوہنی'، جیسی کرنی ویسی بھرنی کی حقیقت کو پیش کرتا ہے۔ اس افسانے کی مرکزی کردار خاتون شراب فروش ہے جو روزانہ ایک نوعمر لڑکے کو مفت شراب پلا کر 'بوہنی' کرتی ہے۔ ایک روز اتفاق سے اُسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی 'بوہنی' سے پہلے ہی روزانہ اس کے بیٹے ہی شراب پی لیتے ہیں۔ تب وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر پاتی۔ یہ افسانہ ان کے اندازِ فکر کو درشاتا ہے اور نفع کے حصول کے خاطر سماج میں ہو رہی بُرائیوں کی بشارت دیتا ہے۔

نسرین سیّد ان انسانی نفس کی کمزوریوں اور نفسانی خواہشات سے آشنا ہیں جو انسان کو اشرف المخلوق کے زمرے سے گھسیٹ کر حیوانات و شیاطین کی صف میں لا کھڑا کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانے 'بھیگی پلکیں' میں دو مختلف زبانوں کے کردار مزین کیے ہیں جو اپنے اپنے علاقوں کی زبان بولتے ہیں۔ ان کرداروں کے مکالموں سے ہندوستانی اختلاطی تہذیب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اس افسانے کے ایک معصوم کردار 'ناصر' کے مکالموں میں 'دکن' کی بولی استعمال ہوئی ہے۔ لیکن اس کی علاقائی زبان 'مراٹھی' ہونے کے سبب اس کردار پر 'مراٹھی' زبان کے اثرات بھی پڑتے ہیں۔ ریاستِ مہاراشٹر میں بہت سے مسلم گھرانوں میں اُردو بول چال کے درمیان مراٹھی اور کنڑی زبان کے الفاظ بھی کہے جاتے ہیں۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے ایسی ہی زبان افسانے کے کردار اور اس کے والدین کی زبانی پیش کی ہے۔ اسی طرح 'ناصر' کی بیوی 'شہناز' صاف و شفاف اُردو میں کلام کرتی ہے۔ 'شہناز' کا یہ اندازِ گفتگو اس کے شہری ہونے کی دلیل ہے۔ اس افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں؛

''اس کا شوہر بچوں جیسا رو رہا تھا۔ اب وہ کیا کرے؟ اندر سے نند نے آواز لگائی، ''ماں، ناصر بھئی کا سن۔ اسے نئی جانے کا تو نکو جانے دیو، وہاں جاکے کچھ کم جیادہ ہوا تو ناصر بھئی کو دیکھنے والا بی نئی کوئی۔ سمجھنے والا بی نئی۔ یہاں سب ہتھے ڈر نتھا۔''

دیور، جواب تک چُپ تھا بولا، ''باپ مجھے لگتا ناصر بھئی نے نہ گیلا چ پروڈیگا۔'' ناصر سب

کو باری باری دیکھ رہا تھا۔ باپ نے کہا،''سیچ جن بولتیں تو مَیں بھی بولتوں پن تمھاری ماں کو بی پچّو،''ماں بولی،''مَیں کیا! تمھارے سب کے بھائی نئیں۔ بھلا ناصر کوئی جانے کا تو نکو جانے دیو۔ ابی چلو بھائیلئی لوگا جمع ہو لیے ہیں۔''(افسانہ بھیگی پلکیں، ڈاکٹر نسرین سیّد، سہ ماہی اسباق، پونے، مدیر نذیر فتح پوری، اکتوبر ۲۰۱۷ء تا مارچ ۲۰۱۸ء، صفحہ نمبر ۲۹)

ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ 'زندگی ایک افسانہ' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں ڈاکٹر نسرین سیّد کے گیارہ اور ڈاکٹر طاہرہ شیخ کے بارہ افسانوں کا مشترکہ مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ ۲۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے کو 'مہاراشٹر راجیہ اُردو ساہتیہ اکادمی ممبئی' نے لائقِ انعام جانا۔ اس حوصلہ افزائی کے سبب ڈاکٹر نسرین سیّد کا قلم کسی رخش کی مانند دوڑ پڑا۔ ۲۰۱۱ء میں ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ منظرِ عام پر آیا۔ اس تصنیف کا نام 'بھیگی پلکیں مسکراتے ہونٹ' ہے۔ اس مجموعے میں 'بھیگی پلکیں، اَن کہی، کٹھور، نصیبوں والی، یادداشت' اور 'مسکراتے ہونٹ' جیسے چھے (۶) افسانے موجود ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے کی طباعت 'نورانی آفسیٹ پریس' میں ہوئی ہے۔ اس تصنیف پر 'بہار اُردو اکادمی' پٹنہ نے 'شکیلہ اختر ایوارڈ' تفویض کیا ہے۔

افسانوں کے مذکورہ دونوں مجموعوں کے سبب خواتین افسانہ نگاروں کی فہرست میں ڈاکٹر نسرین سیّد کا نام نمایاں نظر آنے لگا۔ ان کے افسانوں کے موضوعات عام انسانی معاشرے کے بہترین انتخاب تسلیم کیے جانے لگے۔ جس کے باعث نسرین سیّد کا قلم مزید روانی اختیار کر گیا۔ ان کے افسانے ریاست مہاراشٹر اور دیگر ریاستوں کے موقر رسائل میں نظر آنے لگے۔ اس مرتبہ بھی انھوں نے اپنے اطراف بکھرے ہوئے موضوعات وحادثات کو بہ رنگِ افسانہ، اپنے گرد چلنے پھرنے والے افراد کو بنام 'کردار' پیش کیا۔ جلد ہی ان کے تحریر کردہ افسانوں کا تیسرا مجموعہ بعنوان 'خواہشوں کے بھنور' قارئین کے ہاتھوں میں پہنچا۔ اس مجموعے میں تیرہ افسانے ہیں۔ ان میں 'سیکس پے کمیشن'، 'ضرورت'، 'انسانیت'، 'اور موسم بدل گئے' اور 'کامل یقین' ایسے افسانے اور کہانیاں ہیں جن کے مطالعے سے سیّد نسرین کی عمیق فکری اور تدبّر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس مجموعے کے افسانے قاری کے شعور ولاشعور پر دستک دینے کے ساتھ ساتھ اُسے دعوتِ فکر بھی دیتے ہیں۔ ان افسانوں کا تاثر ایک عمر تک قاری کے ذہن سے چپکا رہتا ہے۔ اس مجموعے کے افسانوں میں عورتوں کے نہ صرف خانگی مسائل کا ادراک ہوتا ہے بلکہ معاشرتی سطح پر ہو رہے نسائی استحصال کے کرب کا بھی احساس دلوں میں جاگزیں ہوتا ہے۔

ان کا افسانہ 'اور موسم بدل گئے' اس لحاظ سے بھی بے حد متاثر کن ہے کہ یہ ایک امیر و کبیر سیاست دان کی بیٹی 'مریم' کی کہانی ہے جسے ایک نوجوان 'آدم' سے محبت ہو جاتی ہے اور اسے طبقاتی نظام کا علم نہیں رہتا۔ وہ یہ جاننا نہیں چاہتی کہ 'آدم' کس طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ بیٹی کی خوشی کے لیے اس کے والدین 'آدم' سے اس کی شادی کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ مریم کی سیاہ مائل رنگت پر آدم کی والدہ اُسے روز طعنے دیتی ہے اور جہیز کا مطالبہ کرتی ہے۔ تعلیم یافتہ مریم اپنے شوہر کی محبت کے سبب ساس کے طعنے ہنس کر سہتی ہے۔ دوسری طرف اس کے ساس اس پر جبر کی شدّت میں اضافہ کرتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ مریم کے حاملہ ہونے کی خبر سن کر وہ آدم کو اسقاطِ حمل کا مشورہ دیتی ہے۔ مریم اس پر راضی نہیں ہوتی تو اُسے زدو کوب کیا جاتا ہے اور زبردستی آپریشن کر دیا جاتا ہے۔ اس جبر کے سبب مریم والدین کے گھر لوٹ آتی ہے اور سیاست دان بن کر اُبھرتی ہے۔

اس طرح نسرین سّید نے اس افسانے میں عورتوں کے خانگی مسائل سے لے کر معاشرتی مسائل تک کی جھلکیاں قارئین کے سامنے جوں کے توں پیش کر دی ہیں۔ چونکہ نسرین سیّد خود ایک عورت ہیں اس لیے انھیں عورت کی نفسیات اور اس کے احساسات و کرب کا بخوبی اندازہ ہے۔ ان ہی نفسیات، احساسات اور کرب کو انھوں نے شستہ اسلوب میں قارئین کی ذہنی سطح کو مدنظر رکھ کر سلیس زبان و بیان میں تحریر کیا ہے۔

☆☆☆

Wahab khaar: Kashmiri Zaban ke Barguzida Sufi Shair by

Sajad Zahoor(Pulwama,J&K) cell-9906028541

سجاد ظہور (پلوامہ، جموں وکشمیر)

وہاب کھار ؎۱۔کشمیری زبان کے برگُذیدہ صوفی شاعر

کشمیری صوفی شاعری کے باب میں وہاب کھارآیک اہم نام ہے۔وہاب کھار انیسویں صدی کے صوفی شعرامیں شمار کیے جاتے ہیں۔کشمیری صوفی شاعری کی یہ اہم شخصیت تحصیل پانپور کے ایک گاوں کھریوجس کوعرفِ عام میں کھریوشار کے نام سے جانا جاتا ہے۔محققین ان کی پیدائش ۱۸۴۲ مانتے ہیں(۲)۔ان کے والد کا نام حاط کھار تھا جو پیشے سے ایک لوہار تھے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے اچھے شاعر بھی تھے حتا کہ فارسی زبان پر بھی اُن کی اچھی خاصی دسترس تھی۔قصہ شیخ صنعان اور مانچھ تلر کے نام سے انہوں نے دو نظمیں لکھی ہیں ؎ (۳)۔وہاب کھار کی بیوی کا نام رحمت تھا جوایک پاک سیرت خاتون تھی اور وہاب کھار اُنہیں بنہ گامچے کے نام سے پکارتے تھے جس سے یہ پتا چلتا ہے کہ اُن کی شادی اپنے ہی گاوں کے دوسرے محلے میں ہوئی تھی۔وہاب کھار کے تین بیٹے تھے جن کا نام اسمٰعیل کھار، لالہ کھار اور کمال کھار تھا۔

ظاہری طور پر وہاب کھار ان پڑھ تھے یعنٰے اُنہوں نے کسی سکول یا کالج میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر اُن کی شاعری سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک ذہین اور بالغ ذہن شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا خاندان لوہاری کے پیسے سے منسلک تھا لہٰذا وہاب نے کم سنی میں ہی اپنے والد صاحب کا ہاتھ بٹایا پھر عمر بھر اِسی پیشے سے منسلک رہے۔وہاب کو اپنے پیشے سے اس قدر محبت تھی کہ اپنا پیشے کو ہی بطور تخلص استعمال کیا۔چونکہ والد کا شاعر ہونا اور فارسی زبان سے وابستگی ہونے کی وجہ سے ان کے گھر میں بڑے بڑے صوفی بُزرگوں، عالموں اور شاعروں کا آنا جانا رہتا تھا اور ان صوفی بُزرگوں کے لیے موسیقی کی محفلوں کا اہتمام کیا جاتا تھا جہاں بڑے بڑے صوفی شاعرں کا کلام گایا جاتا تھا۔وہاب کھار نے بچپن سے ہی ان محفلوں سے فیض حاصل کیا جس سے اس کے دل میں شاعری کا شوق بڑتا گیا اور پھر آگے چل کر وہاب کے اس شوق نے کشمیری صوفی شاعری کی ریوایت کو پروان چڑھایا۔وہاب کھار کے متعلق یہ بھی ریوایت ہے کہ وہ صوفی محفلوں میں بحثیت گلوکار شریک ہوتے تھے جسے ان

کا شوق کہا جا سکتا ہے نہ کہ پیشہ۔جب کہ پیشے سے تا عمر لوہاری سے ہی وابستہ رہے اور اسی سے اپنا رزقِ حلال کما کر زندگی بسر کرتے رہے۔

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ ایک باکمال صوفی شاعر بننے کے لیے اور صوفیت کے مختلف مقامات پانے کے لیے روحانی تربیت کا ہونا ضروری ہے۔چونکہ ان کے والد ایک صوفی شاعر اور صوفی بُزرگ تھے لہٰذا ابتدایٔ تربیت اپنے والد سے ہی حاصل کی۔والد صاحب کے بعد مزید تربیت حاصل کرنے کے لیے کچھ عرصے تک وہ ضلعہ پلوامہ کے ایک گاوں پنگل گام کے رہنے والے رحمان صاحب نامی صوفی بُزرگ کے پاس جاتے تھے ۔(۴)۔صوفیت کے مقامات میں غوطہ زن ہونے کے لیے عرق ریزی کی ضرورت ہوتی ہے یہ مقام پانے کے لیے وہاب کھار آخر میں امداد صاحب مچامہ کے پاس گیے جو ایک مایا ناز صوفی بُزرگ تھے جہاں وہاب کھار کو روحانی فیض حاصل ہوا اور یہی وہ صوفی بُزرگ تھے جنھیں وہاب نے پھر اپنا مُرشد تسلیم کیا۔

وہاب کھار کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ وہ حیات زندگی میں ہی مشہور ہوے اُن کی عظمت اور شہرت کے متعلق بے شمار لوک ریواتے موجود ہیں ایک ریوایت یہ ہے کہ اُس زمانے کے تخت نشین بادشاہ جس کا نام راجہ امر سنگھ تھا اُس نے وہاب کھار کی عظمت سُن کر وہاب کھار کو اُس زمانے کے ۳۰۰ روپے اور گھوڑا تحفے نزر کیے تھے مگر وہاب کھار نے وہ قبول نہیں کیے اور واپس بھیجے جس سے اس بات کا پتا چلتا ہے کی وہ دُنیا داری کے قایل نہیں تھے۔

کشمیری ادب کی صوفی ساعری کے باب میں وہاب کھار کی شاعری کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے خاص کر "ژندن کل" اور" طوطہ" نظمیں صوفی شاعری کی اہم نظموں میں شمار کی جاتی ہیں۔

حضرت آدمس اسی زے گبر تم اس دو یہ سلسلے
اک رٹ آورین بے رٹ قبر دونون چھے کنی ذاتھ (ژندن کل)
طوطہ آوشہار لولو آغس کروزار پار لولو
پادگیہ تم مُدادار لولو آغس کروزار پار لولو (طوطہ)

وہاب کھار کا سارا کلام تقریباً وژن صنف پر ہی مشتمل ہے ان کی شاعری سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک برگذیدہ صوفی بُزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کہنہ مشق شاعر بھی تھے اور فن شاعری پر مکمل دسترس تھی۔ان کی شاعری پڑھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح اُنھوں نے لطیف پیراے اور دیدہ زیب الفاظ کا انتخاب کیا ہے ہے مثال کے طور کچھ وژن شعر ۔

کھوغرق دریاوکورتھس بتے ےدامہ دریاوچوم
دریا وعشقن ماران گتے سہٕ کس پتے گوم
شمع زا جوم ہٹہ کےرتے سہٕ گہہ ظلمات پیوم
اتھ ظلماتس لال کیا چھ تے سہٕ کس پتے گوم

ان اشعار میں روحانی تجربات استعاروں کے ذریعے بہتر انداز میں پیش کیا گیا ہے یہ اشعار بقول شاد رمضان کسی مبالغہ کے بغیر اعلی پایہ کی شاعری میں شمار کیے جاسکتے ہیں(۵)۔ان اشعار میں آہنگ وصوت نے جوحُسن پیدا کیا ہے وہ کمال کا ہے۔وہاب کھار کی شاعری سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاجب کمال صوفی تھے ان کی شاعری میں تصوف کے اصطلاحات شعریت،طریقت،معرفت،ملکوت،ناسوت وغیرہ جگہ جگہ ملتے ہے۔

شریعت گژھ پالن تے طریقت ژلیوزنگار
حقیقت چھےدیدن تے معرفت چیتھ رٹھ قرار
ناسوتہ کن سپن تے ملکوتہ نش گژھ بیدار
جبروتہ قراران تے لاہوتہ سپنکھ عیار

کشمیری صوفی شاعری کا سارا کلام ریاستی کلچرل اکاڈمی سرینگر نے "صوفی شاعر(ترتیب کارامین کامل، ۱۹۶۴)اور" کاشرصوفی شاعری"(ترتیب کارموتی لال ساقی،۱۹۸۵) کے نام سے پانچ جلدوں میں شایع کیے ہیں،اس کے علاوہ صوفی شاعروں کا کلام الگ الگ کُلیاتوں میں بھی ترتیب دیا گیاہے۔وہاب کھار کا کلام کُلیات وہاب کھار کے نام کے سے آفاق عزیز محفوظہ جان نے ترتیب دیا ہے یہ کلیات کلچراکاڈمی نے ۱۹۹۹ میں شایع کیا۔اس کے علاوہ وہاب کھار کی شاعری کے متعلق تنقیدی مضامین بھی لکھے گیے ہے جومختلف رسالوں میں قلم بند ہے۔کشمیری ادب کے اس صوفی شاعرنے تادمِ آخر سادگی وفقیری کی زندگی بسر کی۔محققوں کے مطابق ویاب کھار نے ستر سال عمر پا کر ۱۹۱۲ میں اس جہاں فانی سے رخصت ہوے(۶)۔اوراپنے ہی آبائی گاوں کھریو میں مدفون ہے جہاں پرآستان عالیہ بھی تعمیر کیا گیا ہے اس آستان عالیہ کی سنگ بنیاداسمعل نامی ایک شخص نے رکھی جوکھریو کے پڑوسی گاوں بارسو کے رہنے والے تھے(۷)۔وہاب کھارکو کشمیر کے عقیدت مندلوگ وہاب صاب کے نام سے یاد کرتے ہیں اور کشمیر کے کونے کونے سے لوگ ان کی زیارت پر حاضری دینے کے لیے آتے ہیں خاص کرجمعرات اوراتوار کی راتوں کوعقیدت مندان

وہاں روحانی محفلوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ کشمیر کے بہت سارے لوگوں کو اس مبارک زیارت سے دلی وابستگی ہے۔

حوالے:

(۱) لوہار کو کشمیری میں کھار کہتے ہیں۔
(۲) ناجی منور، شفیع شوق، کاشر زبان تہ ادبک تاریخ، علی محمد اینڈ سنز، سرینگر ۲۰۱۴ صفحہ ۱۸۰۔
(۳): عبدالاحد آزاد، کشمیری زبان اور شاعری، جلد ۲، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر ۲۰۰۵، صفحہ ۴۴۸
(۴)۔ شاد رمضان، مانوگراف: وہاب کھار، ساہتیہ اکاڈمی ۲۰۰۴، صفحہ ۱۱
(۵) شاد رمضان، مانوگراف: وہاب کھار، ساہتیہ اکاڈمی ۲۰۰۴، صفحہ ۲۲
(۶) امین کامل، صوفی شاعر، جلد ۲، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر ۱۹۶۴، صفحہ ۸۳
(۷) عبدالاحد آزاد، کشمیری زبان اور شاعری، جلد ۲، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر ۲۰۰۵، صفحہ ۴۴۸

☆☆☆

Ashk Amritsari ki shairi mein bangla zaban-o-tahzeeb by
Asif Parvez(Research Scholar,Dept. of Urdu,Alia University,Kolkata)
آصف پرویز (ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، عالیہ یونیورسیٹی، کولکاتا)

اشک امرتسری کی شاعری میں بنگلہ زبان وتہذیب

ہندوستان کے دیگر علاقوں کی طرح بنگال بھی اردو زبان وادب کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔ جیسا کہ تحقیق سے ثابت ہے سرزمین بنگال میں ابتدائی دور میں اردو اور بنگلہ دونوں زبانیں ایک ساتھ پروان چڑھیں اور آگے بڑھی ہیں۔ لہٰذا دونوں زبانوں کے اثرات ایک دوسری زبانوں پر پڑنے لازمی تھے یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کے اثرات ایک دوسری زبانوں میں ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں اور بولیوں کی شکل میں ان زبانوں کے الفاظ ایک دوسرے میں شیر وشکر ہو گئے ہیں۔ بنگال کی تہذیب و ثقافت اور یہاں کی زبان کا اردو سے بڑا گہرا رشتہ ہے ایک دوسرے کی زبان میں ایسے سیکڑوں الفاظ شامل ہیں جو مقبول عام ہیں۔ بنگلہ زبان میں شامل اردو الفاظ جیسے خیال، دام، داغی، روج روج (اردو میں روز روز)، موسم، ڈاک گھر، بڑا، چڑیا خانہ، آگے، کاج، خوش، دعا، دانہ، ڈال (اردو میں دال) دن، کھوبور (اردو میں خبر)، گاڑی، خرچہ (اردو میں خرچ)، نواب، روشوگلہ (اردو میں رس گلا) مساپھر (اردو میں مسافر)، روانہ، (اردو میں روانہ)، بھائی، مرگی (اردو میں مرغی) حاکم، ملا، حجت وغیرہ۔ اردو بنگال کی زبان نہیں بلکہ ملازمت اور تجارت کی غرض سے آنے والے یوپی وبہار کے وہ لوگ جنھوں نے بنگال (بالخصوص کلکتہ) کو اپنا وطن ثانی بنایا تھا اردو پڑھتے، بولتے، لکھتے اور سمجھتے ہیں خاص طور پر یہاں کی بازاری زبان جسے عام طور پر لوگ کلکتیا زبان کہتے ہیں مقامی زبان اور بول چال ہی میں خلط ملط ہو گئے ہیں۔ اردو اور بنگلہ تہذیب کے عنوان اپنے ایک مضمون میں خوا جہ اکرام الدین لکھتے ہیں:

''اردو کو شروع سے ہی (LINGUA FRANKA) رابطے کی حیثیت حاصل رہی اور پنجاب سے بنگال تک بولی جانی والی اس زبان نے ہر جگہ کے اثرات بھی قبول کیے اور یقیناً بنگال کے اثرات بھی اردو پر ہیں اسی طرح بنگلہ میں اردو کے اثرات بھی نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ بہت سے ایسے ضرب الامثال اور محاورات رائج ہیں جن سے اس بات کی تصدیق ہوسکتی ہے۔ لین دین کا یہ لسانی

عمل ضروری بھی ہے اور فطری بھی۔ ''

(بحوالہ Khwajaekram.com) اردو اور بنگلہ تہذیب۔خواجہ اکرام الدین)

بیرون بنگال سے یہاں آ کر بسنے والوں جن کی زبان بھوجپوری، میتھلی، مگدھی، اودھی، ما گھی وغیرہ زبانوں کا اثر کلکتے کی زبان و بولی پر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ان میں بیشتر وہ افراد ہیں جنہوں نے کلکتے میں مستقل سکونت اختیار کی اور پھر یہی انہوں نے کسی بنگالی خاتون سے شادی کر لی۔ آبادی کے اس میل جول کے نتیجے جو نسل سامنے آئی اس کی زبان پر متذکرہ بالا زبانوں کے اثرات کا پڑنا لازمی تھا۔کلکتے کی زبان یا کلکتیا اردو کے حوالے سے شانتی رنجن بھٹا چاریہ لکھے ہیں۔

'' کلکتے کی اردو رہندی دراصل ایک ایسی زبان ہے جو مگدھی، میتھلی، بھوجپوری، اودھی، ماگھی، دہلوی، پنجابی، گجراتی، بہاری راجستھانی وغیرہ وغیرہ پر مقامی زبان بنگلہ کے اثرات سے مل جل کر وجود میں آ ئی ہے، یہی کلکتے کی اردو رہندی ہے جس کو اردو والے عام طور پر '' کلکتیا اردو' کہتے ہیں۔''

(بنگال کی زبانوں سے اردو کا رشتہ: ایک لسانی مطالعہ، ص۔ ۱۴۴)

بنگال کی سرزمین سے بھی کئی شعرائے کرام ابھرے جن میں اشک امرتسری، ابراہیم ہوش (جندگی کا میلا)، لطیف الزماں، اختر حمید، عطا آصفی، شمیم انور، علقمہ شبلی، اویس احمد دوراں وغیرہ قابل ذکر ہیں جن کے یہاں خاص طور پر بنگال کی تہذیب وثقافت اور زبان وادب کی قابل دید جھلکیاں ملتی ہیں اور جن کی شاعری میں علاقائی یعنی بنگلہ اور کلکتیا زبان وتہذیب کا خاص اثر نظر آتا ہے۔آزادی سے قبل جو بنگال کے نام سے ایک وسیع وعریض صوبہ موجود تھا وہ تقسیم ہند کے ساتھ ہی مغربی بنگال کی شکل میں سامنے آیا۔کلکتہ مغربی بنگال کی راجدھانی ہے جو بذات خود بنگلہ زبان وتہذیب کا مرکز ومحور ہے۔کلکتہ کی باگ دوڑ اور روزمرہ کا ذکر نظیر ثانی اشک امرتسری کے یہاں بڑی خوبصورتی کے ساتھ ملتا ہے۔اشک امرتسری کی پیدائش تو امرتسر (پنجاب) میں ہوئی لیکن انہوں نے اپنی پوری زندگی کلکتے میں گزاری۔ چونکہ وہ معاشی اعتبار سے آسودہ حال نہ تھے اور بڑی محنت ومشقت سے سامان زیست کیا۔ان کا حلقہ بھی زیادہ وسیع نہ تھا۔عام لوگ اور عوامی بولی ٹھولی الفاظ ومحاورے اشک کے کلام میں جابجا بکھرے نظر آتے ہیں جس کی وجہ کلکتہ کی تہذیب وثقافت کی زندہ اور دلآویز تصویریں ان کی متعدد نظموں مثلاً ٹن ٹن ٹن، ہلہ آتا ہے، کلکتہ، تب دیکھ بہار کلکتہ، ڈھول وغیرہ میں بخوبی نظر آتی ہیں۔ رکشہ ہندوستان کے کئی شہروں میں ایک اہم سواری کے طور پر جانی جاتی ہے مگر کلکتے میں چلنے والے رکشے کی خاص بات یہ ہے کہ اسے رکشہ والا ہاتھ سے کھینچتا ہے اور سوار پیچھے بیٹھا ہوتا ہے۔اشک کی نظم

''ٹن ٹن ٹن'' ایک غریب رکشہ والا کی آہ وکرب کا بیانیہ ہے اس کے رکشہ پر سوار شخص ایک شاعر ہے جو سخن فہمی میں گم ہے رکشہ والا اس سے مخاطب ہوکر اپنی حالت زار کا ذکر یوں کرتا ہے۔ کہتا ہے۔

بخت نے یوں پلٹا کھایا کھینچ کے کلکتہ لایا
اور پلٹ ہی دی کایا روح نکالی رکھا تن
ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن

شہر کلکتہ تہذیب وثقافت کا مرکز ہے۔ اسے شہر نشاط یا پھر ہرتالوں اور ہنگاموں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اسے غریب پرور شہر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یوپی، بہار اور آس پاس کی دیگر ریاستوں سے ہجرت کر کے آنے والے مزدوروں کا یہ شہر پسندیدہ مسکن ہے۔ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو شہر کی فٹ پاتھ پر رہتے ہے مختلف کھانے پینے کی چیزوں کو فروخت کر کے اپنا اور اپنے اہل خانہ کا گزر بسر کرتے ہیں۔ بعض تو اتنے غریب ہیں فٹ پاتھ ہی پر جہاں وہ چوڑی، کپڑا، سبزیاں اور دیگر ضروریات زندگی کی اشیا بیچتے ہیں وہی اپنے سامان کو لپیٹ کر شب گزاری بھی کر لیتے ہیں لیکن انہیں ہر دم پولس کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ اشک امرتسری نے اپنی نظم ''ہلہ آتا ہے'' میں شہر کلکتہ کے سڑک اور چوراہوں بسنے والے ایسے ہی غریبوں کا نقشہ بڑی دردمندی کے ساتھ کھینچا ہے جن کو ''ہلہ'' یعنی پولس کا دستہ چین سے رہنے نہیں دیتا۔

جو شہر بڑا ہے کلکتہ وہ شخص ہے مورکھ البتہ
جو منہاری کپڑا لتہ فٹ پاتھ پہ یوں پھیلاتا ہے
اٹھ بھاگ کہ ہلہ آتا ہے
تو بھوکا ننگا بیوپاری اور بیچے بھجیا ترکاری
لیکن یہ سڑک ہے سرکاری قانون تجھے دوڑاتا ہے
اٹھ بھاگ کہ ہلہ آتا ہے

اس نظم کی لسانی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے شانتی رنجن بھٹاچاریہ فرماتے ہیں۔

''کلکتیا اردو اور بنگلہ میں ''ہلہ'' پولیس کے اس دستے کو کہتے ہیں جو سڑکوں کے کنارے فٹ پاتھ پر غیر قانونی طور پر دکان لگانے والوں کے خلاف کاروائی کرتا ہے اور ہاتھ آنے پر دکان داروں کا سامان اٹھا کر لے جاتا ہے۔'' (بنگال کی زبانوں سے اردو کا رشتہ: ایک لسانی مطالعہ، ص۔ ۱۵۵)

اس کے علاوہ ''لتہ'' کی اصطلاح بھی کلکتہ کی بول چال میں رائج ہے۔

دیگر نظموں میں ایک اہم نظم ''ریس'' ہے۔کلکتہ کا ریس کورس دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہ انگریزی حکومت کی نشانی اور ذوق وشوق کی ایک حسین یادگار ہے۔اس ریس میں کئی لوگوں نے اپنی قسمت کو بدلتے دیکھا ہے۔گھوڑ دوڑ یعنی اس ریس میں بہتوں کی قسمت کے ستارے چمکے ہیں شاعر بھی اس قسمت کے کھیل کا شوقین ہے اسی لیے وہ مشورہ دیتا ہے کہ یہ ایک عمدہ کاروبار ہے جہاں پیسہ لگا نا گھاٹا کا سودا نہیں۔

کاروبار میں گھاٹا ہو تو اس سے آس لگاؤ ڈوبیں چند ہزار تو کیا غم ہمت ہار نہ جاؤ
سودو سو مل جائیں گر تو جگ میں دھوم مچاؤ بچا کھچا سب اس میں لگا دو ریس کا ہے سندیس
کھیل کے دیکھو ریس

اشک کی نظموں کی یہ سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ عوامی الفاظ ان کے یہاں نہایت خوبصورت انداز میں استعمال ہوئے ہیں۔نظم ''ریس'' میں ان غریبوں، مجبوروں اور محنت کشوں کا ماتم کیا گیا ہے جو غربت اور مفلسی کی وجہ سے ریس میں اپنی قسمت آزماتے ہیں اور بار بار ہار کر بھی اسی امید کے ساتھ آئندہ پیسہ لگاتے ہیں کہ کبھی نہ کبھی تو قسمت کی دیوی ان پر مہربان ہوگی۔اس نظم کے الفاظ بھی عوامی ہیں۔''گھاٹا''، ''روپیہ ڈوبنا''، ''بچا''، ''کھچا''، ''سندیس''، ''بیوپار'' وغیرہ الفاظ روز مرہ اور محاورات اور لسانی انفرادیت کا پتہ چلتا ہے جو کلکتہ اور اس کے اطراف کی زبان اس وقت بھی تھی اور آج بھی ہے۔اشک کی زبان اور لسانی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے معصوم شرقی لکھتے ہیں۔

''اشک کلکتہ ومضافات کے عوامی حلقوں میں کافی مقبول تھے۔اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ جس زبان اور لہجے کے شاعر تھے وہ عوامی زبان تھی اور لہجہ بھی عوامی تھا۔۔۔۔۔۔انہوں نے اپنی نظموں میں بول چال کی زبان اور روزمرہ کے الفاظ کو اچھی طرح کھپایا ہے۔اشک نے اپنی مختصر سی مدت میں بے نظیر اور مقبول ترین نظمیں کہی ہیں۔'' (معصوم شرقی، ڈاکٹر، نظیر ثانی اشک امرتسری: تعارف، تنقید اور تدوین کلام، ایم۔آر پبلیکیشنز، دہلی، 2012، ص 101)

کسی بڑے شہر کی طرح کلکتہ کی رونق اور چمک دمک دیکھنا ہو تو غروب آفتاب کے بعد دیکھیے۔جدید ترقمقموں اور خیرہ کن ضوفشانیوں میں شہر کی خوبصورتی دیکھنے سے قابل دید نظارہ پیش کرتی ہے۔شام ہوتے ہی لوگ اپنے کام کاج اور دیگر مصروفیتوں سے فارغ ہو کر سیر سپاٹے کے لیے نکل پڑتے ہیں۔خاص طور پر یہاں کا بنگالی طبقہ جنہیں لذیذ کھانوں اور فرصت کے اوقات میں قریبی دوستوں اور رشتہ داروں کے درمیان وقت گزارنا جسے وہ ''اڈہ'' کہتے ہیں کافی پسند ہے۔لیکن ایک

طرف اگر شہر کی خوبصورتی، امارت اور سیر وتفریح کی دھوم ہے تو دوسری طرف جھگی جھونپڑیوں میں زندگی گزارنے والے وہ افراد بھی ہیں جنہیں صاف ہوا اور میسر ہے اور نہ صحت بخش غذا۔ شہر کلکتہ کے لوگوں کی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے اپنی ایک نظم ''تب دیکھ بہار کلکتہ'' میں اشک امرتسری فرماتے ہیں:

جب دن کا جوبن ڈھلتا ہوتب دیکھ بہار کلکتہ اندھیارا روپ بدلتا ہوتب دیکھ بہار کلکتہ
تخریب کا ایندھن جلتا ہوتب دیکھ بہار کلکتہ تعمیر کا لوہا گلتا ہو تب دیکھ بہار کلکتہ
تہذیب کا چکر چلتا ہوتب دیکھ بہار کلکتہ جب شہر کی گندی گلیوں میں ہر بچہ بوڑھا گریاں ہو
ماں دکھیا، باپ اپاہج، بیٹا بھوکا، بیٹی عریاں ہو اور اونچے اونچے محلوں کا ہر کنکر پتھر خنداں ہو
ہر حرص وہوس کی محفل میں انگور کی بیٹی رقصاں ہو بلور میں بادہ ڈھلتا ہو تب دیکھ بہار کلکتہ

اشک امرتسری کو سماجی اور تہذیبی زندگی کا گہرا مطالعہ تھا وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر وقت کلکتہ میں گزارا۔ جہاں اور جس عوامی ماحول و معاشرت میں ان کا ادبی ذہن بالیدہ ہوا اس کے نمایاں اثرات ان کی شاعری پر پڑے ہیں۔ اشک نظیر ثانی کہلاتے ہیں۔ اشک امرتسری کے یہاں نظیر کی طرح عوام کی زندگی اور ان کی کسم پرسی کے ساتھ شہر نشاط کی رنگا رنگی اور قہقہوں کے بیچ غریب طبقے کی سسکیاں اور آنسو، ان کی محرومیاں اور مجبوریاں فنکارانہ فکر وبصیرت کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ قومی یکجہتی، انسانی حقوق، محبت واخوت اشک کی شاعری کے خاص جوہر ہیں۔ انہوں اپنی شاعری کے ذریعہ ہمیں یہی پیغام دیا ہے کہ انسانیت سب سے بڑا مذہب ہے۔ مذہب کے نام پر فساد پھیلانے والے امن وشانتی کے دشمن ہیں۔ اشک خود بھی فساد سے متاثر ہوئے تھے اور انسانی جانوں کے زیاں کو اپنی آنکھوں سے انہوں نے دیکھا تھا۔ اسی لیے انہوں نے اپنی نظم ''امن کا پیغام'' میں کہا تھا۔

ہند کے سبز کھیتوں، مرغزاروں کی قسم لہلہاتے سبزہ زاروں کی، بہاروں کی قسم
گنگناتے رقص کرتے آبشاروں کی قسم مسکراتی صبح ہنستی شام لے کر آئے ہیں

دوستوں ہم امن کا پیغام لے کر آئے ہیں

مذہبی ہم آہنگی کا ذکر کرتے ہوئے اپنی نظم ''ڈھول'' میں کہتے ہیں۔

پریم کے پرچارک ہیں دونوں وید ہو یا قرآن پریم ہی شکتی، پریم ہی مکتی، پریم شری بھگوان

اس طرح ایک اور اہم نظم ''عید آئی'' کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ عید نہ صرف مسلمانوں کا اہم تہوار ہے بلکہ مشترکہ تہذیب کی علامت بھی ہے جسے صدیوں سے ہم ہندی باشندے

نہایت شان وشوکت اور آپسی بھائی چارے کا پیغام دیتے ہوئے مناتے ہیں۔ جب کسی کو بہت زیادہ خوش یا خوشی مناتے دیکھتے ہیں تو کلکتہ کے لوگ اس کے لیے ’اودھم مچانا‘ اور ’ہاؤ ہو‘ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ جیسے اشک اپنی نظم میں کہتے ہیں۔

اشکؔ اٹھ! اودھم مچا کیوں چپ ہے تو   دیکھ یہ رشک و سرود ہاؤ ہو

اس طرح کی نظموں اور ان کی شاعری میں ایسے الفاظ، محاورات، تمثیلات، ترکیبات وغیرہ کی بھرمار ہیں جس کا اس مختصر مضمون میں احاطہ تحریر میں لانا ممکن نہیں۔ لیکن اس کے باوجود اشک کی شاعری میں بنگلہ زبان وتہذیب کے اس مطالعے سے اشک کی شاعری میں ایک نئی تحقیق وتلاش کے دروازے ضرور کھلتے ہیں۔ اشک اسی زمین اور عوام کے شاعر تھے بالخصوص کلکتے کی عوام اور یہاں کی تہذیب وزبان کو انہوں نے جس فنکاری اور ہنرمندی کے ساتھ اپنی شاعری کا حصہ بنایا وہ نہ صرف ان کی شاعری بلکہ اردو زبان اور یہاں کی علاقائی تہذیب وثقافت کا نادر نمونہ اور قیمیتی سرمایہ بھی ہے جسے ہم اردو والے کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

☆☆☆

Jammu-o-|Kashmir ke naamvar Mohaqqeqeen by Salima Akhtar
(research scholar,dept.of urdu delhi university,delhi)
سلیمہ اختر (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی)

جموں وکشمیر کے نامور محققین

تحقیق عربی زبان کے لفظ ''حق'' سے مشتق ہے جس کے معنی حقیقت کے ہیں انگریزی میں اسے (Research) ریسرچ اور ہندی میں انو سندھان کہتے ہیں جس کے معنی دریافت، تفتیش، کھوج، چھان بین اور تلاش کے ہیں۔ تحقیق کا یہ عمل ایک فرد کے بچپن سے شروع ہو کر موت تک جاری وساری رہتا ہے۔ ڈاکٹر تلک سنگھ تحقیق کی تعریف یوں کرتے ہیں:

''تحقیق علم کا وہ شعبہ ہے جس میں منظم لائحہ عمل کے تحت سائنسی اسلوب میں نامعلوم ونا موجود حقائق کی کھوج اور معلوم وموجود حقائق کی نئی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ علم کے علاقے کی توسیع ہوتی ہے''

(گیان چند جین۔ تحقیق کا فن۔ قومی اردو کونسل کی پہلی اشاعت۔ ۲۰۰۸۔ ص۔ نمبر ۲۲)

قاضی عبدالودود: **''تحقیق کسی امر کو اصل شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے''**

(گیان چند جین۔ تحقیق کا فن۔ قومی اردو کونسل کی پہلی اشاعت۔ ۲۰۰۸۔ ص۔ نمبر ۱۹)

کسی بھی امر کی اصل شکل پوشیدہ ہو تو اس کی اصل شکل دریافت کرنے کے عمل کو تحقیق کہتے ہیں۔ تحقیق کے ذریعے جن چیزوں کو دریافت کیا جاتا ہے۔ انہیں مستند قرار دیا جاتا ہے۔ اور کسی بھی امر کی چھپی یا پوشیدہ اصل شکل کی دریافت بہت ضروری ہوتی ہے تاکہ وہ صحیح صورت حال میں سامنے آئے جب اس کی اصلیت معلوم ہو جاتی ہے تو اس میں دلچسپی دوگنا ہو جاتی ہے۔ جہاں برصغیر ہندوپاک میں اردو زبان میں تحقیق کے کارہائے کارنامے انجام دیے ہیں (جموں وکشمیر جو گذشتہ ریاست تھی اور اب مرکز کے زیر اہتمام ہے) وہیں جموں وکشمیر میں اردو تحقیق کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ یہاں اردو تحقیق کے ابتدائی نقوش ہمیں ڈوگرہ حکومت کے دور سے ہی دیکھنے کو ملتے ہیں مختصر سے عرصے میں اس سرزمین نے ادب کے میدان میں ایسے محققین پیدا کئے جن میں پروفیسر اکبر حیدری، پروفیسر حامدی کاشمیری، محمد یوسف ٹینگ، پروفیسر ظہور الدین اور پروفیسر محمد زماں آزردہ، ڈاکٹر برج پریمی وغیرہ کے علاوہ اور بھی قابل اہم نام ہیں جنہوں نے تحقیق کے سائنٹفک

اصولوں کوملحوظ رکھ کراردو تحقیق کی تاریخ میں ایک روشن مقام پیدا کیا ہے۔

پروفیسرا کبرحیدری: پروفیسرا کبرحیدری نہ صرف جموں وکشمیر کی علمی وادبی تاریخ کا ایک اہم ستارہ تھے بلکہ پورے برصغیر میں ان کے تحقیقی کارناموں کوسراہا گیا ہے۔ان کی مادری زبان کشمیری ہونے کے باوجودوہ اردو تحقیق ایک اعظم محقق کہلائے۔بے شک تحقیق ان کا اصل میدان رہا ہےلیکن وہ ایک بلند پایہ کے نقاد،ادیب،قلمکار،مولف،استاد،تذکرہ نویس اورادبی صحافت میں بھی ایک خاص مقام کے مالک تھے۔پروفیسرا کبرحیدری کی کم وبیش پچاس کتابیں اور چارسو سے زائدمقالے شائع ہوکرداد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔جن میں اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا، باقیات انیس، باقیات دبیر، میرانیس بحیثیت رزمیہ شاعر،تحقیقی جائزے،مراثی دبیر،تحقیقی نوادر،روح جذبات،عبرت کدہ،سیر خرابات، بہارستان شاہی، مقالات حیدری اورمنظومات دیگروغیرہ قابل ذکر ہیں۔موصوف کے کئی مضامین مرثیہاورمرثیہ نگاروں کےحوالے سے ہندوپاک کے رسائل وجرائدکی زینت بنتے رہےجن میں اقبال اورحسن،مرزادبیر کے قلمی آثار،مرزادبیرایک تحقیقی مقالہ،مرثیہ میں ہندوستانی عناصر،رزمیہ شاعری اور میرانیس کا ایک مرثیہ،ہندومرثیہ گوشعرا،میرانیس کا غیر مطبوعہ کلام،سحرالبیان،مرزا غالب کاغیر مطبوعہ کلام اورغلام حسن دلگیرلکھنوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

موصوف نے اپنی مسلسل کوشش اورلگن سے دیوان،تذکرے اورشخصیتوں پراعلی معیار کا کام سرانجام دیا۔جن میں دیوان ذوق،دیوان ترقی،دیوان قائم اوردیوان میرتقی میروغیرہ تذکروں میں تذکرہ شعرائے ہندی، تذکرہ گردیزی، تذکرۂ بہارے خزاں، تذکرہ قدیم شاعرات اورتذکرہ ریختہ گویاں وغیرہ اورشخصیتوں میں میر ببرعلی انیس،مرزاسلامت علی دبیر،میرتقی میر،مرزااسداللہ خان غالب، اورعلامہ اقبال جیسی عظیم ہستیوں کی شخصیات اورکارناموں کے نہ جانے کتنے پوشیدہ گوشوں کواجاگر کیا ہے۔پروفیسرا کبرحیدری وہ نامورمحقق ہیں جنہوں نے اقبالیات، غالبیات،اور کلاسیکی ادبی سرمائے میں وہ تحقیقی کارنامے انجام دیئے ہیں جوواقعی تحقیق میں اضافے کا باعث ہیں اس بارے میں قدوس جاوید لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ حقائق وواقعات سنہ وتاریخ کی چھان پھٹک،غیرمطبوعہ،غیرمدون کلام،نایاب اورکمیاب قلمی نسخوں اور کتابوں کے حوالے سے پروفیسرا کبرحیدری مروجہ معلومات اورحقائق و معروضات سے متعلق جونتائج اخذ کرتے ہیں اور بازیافت وانکشاف کی بنیاد پرترمیم واضافہ کی جو صورتیں پیش کرتے ہیں ان میں سے بیشترعمدہ تحقیقی آداب اورتقاضوں کی بناپراہم قرار پاتے ہیں اور

معیار کے اعتبار سے ایسا لگتا ہے جیسے حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی وغیرہ کے بعد اکبر حیدری ہی ہیں جو اردو تحقیق کی شمع روشن رکھے ہوئے ہیں۔"

(بازیافت شمارہ ۳۶۔۷۔۳۔۰۶۔۲۰۰۵ ص۔نمبر 154)

پروفیسر اکبر حیدری نے جس تصانیف میں سب سے زیادہ تحقیق کی وہ "مرثیہ" ہے۔ موصوف کی تصانیف اور مقالوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مرثیہ اور مرثیہ نگاروں پر ان کی گہری نظر رہی ہے۔ انہوں نے گمنام شعرا اوران کے گمنام کلام کو وقت کی گرد میں منوں مٹی کے نیچے دفن ہونے سے بچا کر آنے والی نسلوں کیلئے تحقیق کا بہترین خزانہ مہیا کیا۔ بے شک مرثیہ کے ضمن میں پروفیسر نیر مسعود، پروفیسر محمد زماں آزردہ، پروفیسر شبیہ الحسن، اور کاظم علی خان نے قابل قدر کارنامے انجام دیئے لیکن ان سب میں موصوف کا کام سب سے زیادہ ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو تحقیقی راہ میں وقف کر کے تحقیقی اصولوں کو ملحوظ رکھ کر تحقیق کے دامن کو وسعت بخشی اور اردو تحقیق کو بلندیوں پر پہنچایا۔ مجموعی طور پر موصوف کی تحقیقی خدمات ہمیشہ قائم دائم رہیں گی۔

پروفیسر حامدی کاشمیری: جموں وکشمیر میں اردو تحقیق کے حوالے سے حامدی کاشمیری کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے بحیثیت نقاد اپنی شناخت قائم کی لیکن تنقید کے ساتھ ساتھ تحقیقی میدان میں بھی طبع آزمائی کی۔ موصوف کا پی۔ ایچ۔ ڈی (P.hd) مقالہ "اردو نظم میں یورپی اثرات"، تحقیق کی بہترین اور عمدہ مثال ہے۔ ان کی ادبی صلاحیتوں کو برصغیر ہندو پاک کے باہر بھی سراہا گیا ہے۔ موصوف ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۳ء تک کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے انہوں نے اس دوران اردو شعر و ادب کی تفہیم وتعبیر کی کوشش کرتے ہوئے ایک نئی روح پھونکی۔ موصوف نے اردو زبان کے ساتھ ساتھ اپنی مادری زبان کشمیری کو بھی بام عروج تک پہنچانے میں ناقابل فراموش خدمات انجام دی جن کی بنا پر انہیں پدم شری ایوارڈ سے نوازا گیا۔ پروفیسر حامدی کاشمیری کی بچاس سے زائد تصانیف وقتاً فوقتاً شائع ہوئیں۔ ان کی بعض تصانیف جن میں کارگہ شیشہ گری (۱۹۸۲) شیخ العالم: حیات اور شاعری (۱۹۹۷) نئی حسیت اور عصری شاعری (۱۹۷۴) ناصر کاظمی کی شاعری (۱۹۸۲) جدید اردو نظم اور یورپی اثرات (۱۹۶۸) اقبال اور غالب (۱۹۷۸) جدید شعری منظر نامہ (۱۹۹۰) ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب (۱۹۹۱) اکتشافی تنقید کی شعریات (۱۹۹۹) اقبال کا تخلیقی شعور (۲۰۰۱) حرف زار اقبال کا مطالعہ (۱۹۸۳) امکانات (۱۹۸۷) آئینہ ادراک، اقبال کا مطالعہ (۱۹۹۴) غالب جہان دیگر (۲۰۰۹) جدید کاشر شاعری (۱۹۸۳) غالب کے تخلیقی سرچشمے

(۱۹۶۹)اردو نظم کی دریافت (۲۰۰۴)متن اور تجزیہ(۲۰۱۱)وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حامدی کاشمیری کو’’اردو شاعری پر مغربی اثرات کا تحقیقی مقالہ‘‘(۱۹۶۶)مقالہ لکھنے کے بعد تنقید سے باقاعدہ طور پر دلچسپی پیدا ہوئی۔جس طرح کوئی بھی مستند اور بڑا محقق تنقید اور تحقیق کے متعلق معتبر رائے رکھتا ہے کہ تحقیق وتنقید آپس میں لازم وملزوم ہیں کہ نہ تنقید کے بغیر تحقیق اور نہ تحقیق کے بغیر تنقید وجود میں آتی ہے۔اسی طرح حامدی کاشمیری کا بھی ماننا ہے کہ معیاری تنقید کے ساتھ تخلیق کے کردار کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

’’چونکہ نقاد کا واسطہ ابتداء متن سے رہتا ہے۔اس لیے متن کی صحت،اس کے الحاقی عناصر،مصنف سے اس کے زمانی بعد جیسے مسائل سے اس کا متصادم ہونا قابل فہم ہے،بظاہر یہ وہ مسائل ہیں جو تحقیق کے زمرے میں آتے ہیں،تاہم تحقیق نقاد کے لیے شجر ممنوعہ نہیں ہے۔اسے اپنے نتائج فکر کی درستگی کو یقینی بنانے کے لیے محقق کا رول بھی ادا کرنا پڑتا ہے،چنانچہ متن کے حوالے سے بعض ایسے الفاظ،تلمیحات اور ارسطو کی تاریخی،مذہبی یا ثقافتی معنویت،اثر انگیزی اور گہرائی کی تلاش وتعین ضروری ہو جاتی ہے،جو سیاقی اہمیت کے حامل ہوں،ظاہر ہے تحقیق بھی تنقیدی عمل کے دائرہ کار میں آتی ہے،تنقیدات میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں،جہاں الفاظ کے اشتقاق یا ان کی تاریخی وثقافتی حیثیت سے لاعلمی نقادوں کو استخراج نتائج کی ذمہ داری سے کماحقہ عہدہ برآ ہونے میں مزاحم ہوتی ہے،اور ان کو خلط مبحاث کے دلدل میں دھکیلتی ہے۔پس نقاد کے لیے تحقیق کے آداب سے بھی واقف ہونا ضروری ہے‘‘(اکتشافی تنقید کی شعریات۔ص۔19-18)

حامدی کاشمیری نے تنقید کے ساتھ ساتھ تحقیق کے معیار کو بلند کر کے اعلی نمونے پیش کیے جس سے اردو تحقیق وتنقید میں ایک نئی راہ کا پتہ چلتا ہے۔اسی لحاظ سے موصوف کی تحقیقی وتنقیدی کاوشوں کو اردو ادب کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔

محمد یوسف ٹینگ: محمد یوسف ٹینگ (ایم وائی ٹینگ) کا نام جموں وکشمیر کے گراں قدر اور معتبر محققین میں سرفہرست ہے۔وہ بیک وقت ایک قابل قدر نقاد،محقق،مصنف،تاریخ داں اور سیاست دان ہیں۔ان کی تحقیق وتنقید کے میدان میں جو تصانیف منظر عام پر شائع ہوئی ہیں۔ان میں شناخت (۱۹۸۸)جستہ جستہ(۲۰۰۱)کشمیر قلم (۲۰۰۹)کشمیری زبان،شیش رنگ اور تلاش وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔موصوف کے تحقیقی کارناموں کو سراہتے ہوئے کلچر اکیڈمی کشمیر نے بطور خاص شمارہ تیار کیا۔جس میں موصوف کی تحقیق وتنقید نگاری کے مختلف پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے پروفیسر قدوس

جاوید، مشعل سلطان پوری، پروفیسر مرغوب بانہالی، پروفیسر حامدی کاشمیری، ڈاکٹر شفیع شوق اور نور شاہ وغیرہ نے اپنے اپنے مضامین میں روشنی ڈالی ہے۔ جس سے موصوف کی تحقیقی وتنقیدی بصیرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کے تین طرح کے مضامین دیکھنے کو ملتے ہیں خالص تنقیدی مضامین، خالص تحقیقی مضامین اور وہ مضامین جن میں تحقیق وتنقید دونوں کا حق ادا کیا گیا ہو۔

محمد یوسف ٹینگ کے تحقیقی مضامین میں قرآن کی نادر یافت، مغل مصوری کے نادر نمونے، یہی حال، تاریخ اور ادب، ارسطو، ایک ادبی سرقے کا سنسنی خیز انکشاف، غنی کاشمیری اور نسخہ فتح اللہ الکشمیر ی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان مضامین کا جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ نسخہ فتح اللہ الکشمیر ی کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ موصوف نے گہرے ذوق اور جانفشانی سے کام لے کر یہ ثابت کیا ہے کہ نسخہ فتح اللہ الکشمیر ی کس دور میں لکھا گیا ہے۔ اس بارے میں موصوف ''کشمیر قلم ''میں یوں لکھتے ہیں:

''نسخہ فتح اللہ کو جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی نے (۱۹۸۰) کی دہائی میں دریافت کیا تھا۔ یہ دلی کی ملکہ رضیہ سلطان کے عہد حکومت (۱۲۳۵) میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس کی گواہی خود اس بے مثال نسخے کے اندر خوشنویس کے Colophon میں موجود ہے۔ وہ سنہ تحریر درج کرنے کے بعد عربی زبان میں اپنا نام درج کرتا ہے۔ ''علی ید فتح اللہ الکشمیر ی'' یہ ''کشمیری'' کی خاصیت ظاہر کرنے کا اولین تحریری ثبوت ہے اس نسخے سے پہلے کا کوئی قرآنی نسخہ برصغیر ہندو پاکستان میں ابھی تک دریافت نہیں ہوا ہے اور اس طرح سے کشمیریوں کو یہ سعادت ملتی ہے اس صحیفے کی پہلی تمثال ان ہی کے حصے میں آئی ''(محمد یوسف ٹینگ، کشمیر قلم۔ ص۔ 297)

الغرض محمد یوسف ٹینگ کی یہ تصانیف کشمیر میں تحقیقی سرمائے کی بہترین اور عمدہ مثال ہے۔ موصوف نے نسخہ فتح اللہ الکشمیر ی کے بارے میں کئے گئے تمام سوالات کے جوابات پورے ثبوت اور دلائل سے دیئے ہیں۔ محمد یوسف ٹینگ کا طریقہ تحقیق نہایت ہی واضح اور مدلل ہے۔ انہوں نے مختلف پہلو پر گہری نظر رکھ کہ ایسے مضامین تحریر کیے جو مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔ الغرض موصوف نے بڑی محنت وجگر کاوی سے کام لے کر ہمارے علمی وتحقیقی معیار کو زمین کی پستی سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں سے روشناس کیا۔ جس کی بدولت نئی نسل کافی استفادہ حاصل کر رہی ہے۔ مختصر طور پر محمد یوسف ٹینگ تحقیق کے حوالے سے ایک بلند اور پختہ ذہن رکھتے ہیں اور اس میدان میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔

پروفیسر ظہور الدین: پروفیسر ظہور الدین کا نام جموں وکشمیر کے اہل فکر ونظر ادبا، اور دانشوروں میں نا قابل فراموش ہے۔ انہوں نے اپنی ذہانت سے علمی اور ادبی دنیا میں اعلی مقام حاصل کیا۔ وہ بیک وقت ایک شاعر، نقاد، محقق، ڈراما نگار، صحافت اور ترجمہ نگار تھے۔ وہ مختلف قسم کی صلاحیتوں سے لیس تھے۔ اردو ادب کے میدان میں وہ برصغیر کے صف اول کے مصنفین میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس میں ان کا تخلیقی جوہر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ ان کی ادبی سرگرمیوں کے خاص ادارے تحقیق وتنقید ہی ہیں تو بے جا نہ ہوگا گویا وہ اس میدان کے بہترین خدمت گزار تھے۔ ان کی دو درجن سے زائد تصانیف شائع ہوکر مقبول ہوچکی ہیں۔ ان میں تنقیدی مباحث وتجزیے، جدید ادبی وتنقیدی نظریات، حقیقت نگاری اور اردو ڈراما، جدید اردو ڈراما، فن صحافت، اطراف ادب، فن ترجمہ نگاری، فن صحافت، محروم کی شاعری، کہانی کا ارتقا، تفکرات، تعلیل وتاویل، وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ موصوف نے مختلف رسائل وجرائد کیلئے جو متفرق مضامین لکھے انہیں ملک کے ادبی حلقوں میں کافی قدر ومنزلت حاصل ہوئی۔ ''جموں میں اردو زبان کا آغاز وارتقا'' ان کی بہترین تحقیقی تصانیف ہے۔ انہوں نے اس تحقیقی کارنامے کی تکمیل اور ترتیب میں کافی عرق ریزی سے کام لے کر تحقیق کے سارے حقائق بالکل واضح طور پر قاری کے سامنے پیش کئے۔ ان کی اس تصنیف کو اردو ادب میں ایک قابل قدر تحقیقی تصنیف قرار دیا گیا ہے۔

پروفیسر ظہور الدین نے ایم۔اے (M.A) کے دوران ہی چند ایسے مضامین تحریر کیے جن سے ان کے ادبی شعور کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خاص علوم کی تلاش میں تھے۔ ان کا پی۔ ایچ۔ ڈی مقالہ بہ عنوان ''بیسویں صدی کے اردو ادب پر انگریزی رجحانات'' تھا یہ مقالہ ۱۹۷۲ میں پایہ تکمیل تک پہنچا اور جموں وکشمیر کی مالی معاونت سے ۱۹۷۸ء میں شائع ہوکر منظر عام پر آیا۔ موصوف نے اس مقالے میں بیسویں صدی کی ابتدا سے ۱۹۷۰ء تک عالمی سطح پر پیدا ہونے والی ادبی رجحانات کو سامنے لایا جنھوں نے خاص کر اردو ادب کو متاثر کیا۔ اسے موصوف کی محققانہ صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے انتھک محنت اور لگن سے مغربی ادب کو کھنگالا ہے۔ موصوف نے ہر موضوع میں ایک نئی فضا قائم کی ہے۔ رومانیت کے حوالے سے ایک جگہ یوں لکھتے ہیں:

''لفظ رومانٹک'' سب سے پہلے سترھویں صدی عیسوی کے نصف میں اس ادب کے لیے استعمال کیا گیا جو فرضی موضوعات کا حامل تھا۔ کچھ وقت کے بعد اس مفہوم میں تبدیلی رونما ہوئی اور اب اسے قدرتی مناظر کے بیان کے لیے استعمال کیا جانے لگا اور ایک سو سال تک یہ لفظ اس مفہوم کی ترجمانی

کے لیے رہا۔ رفتہ رفتہ یہ مفہوم بھی بدلا اور بالآخر اسے جذبے اور وجدان کی تجدید کے لیے مخصوص کیا گیا
''(عبدالحق نعیمی۔ بحوالہ۔ دریا بہ دریا جو بہ جو۔ ص۔ 304)

موصوف کا مطالعہ نہایت وسیع ہے وہ بہت جلد متقدمین کی باتوں سے مطمئن نہیں ہوتے تھے بلکہ اس کی تہہ تک جا کر اس میں مضبوط و مربوط دلائل سے اضافے بھی کرتے تھے جو ان کی علمی بصیرت اور تقابلی مطالعے کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ موصوف نے Development of Urdu language and literature میں معروضی انداز میں صوبہ جموں کے اردو ادب کا تجزیہ کر کے محققانہ جگر کاوی سے ان رجحانات پر روشنی ڈالی ہے جو تاریخی سفر کے دوران رونما ہوتے رہے اس میں بہت سارے دلچسپ واقعات اور معلومات ملتی ہے جسے کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔

پروفیسر محمد زماں آزردہ: جموں وکشمیر ہمیشہ سے ہی علم وادب کی آبیاری کرتی رہی ہے۔ وادی کشمیر جس طرح قدرتی مناظر اور خوبصورتی کی وجہ سے حسین ہے ٹھیک اسی طرح اس حسین وادی کے قلم کاروں کے قلم سے حسین اور دلکش تحریریں ابھری ہیں۔ پروفیسر محمد زماں آزردہ کا نام بھی جموں وکشمیر کے گراں قدر اور معتبر محققین ناقدین اور انشائیہ نگاروں میں کافی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی جو تصانیف شائع ہوکر مقبول ہوئیں ان میں بطور خاص اور وہ ٹاپ کر گئی (۱۹۷۰) شیریں کے خطوط (۱۹۷۴) غبار خیال (۱۹۷۳) موج نقد (۲۰۰۴) کانٹے (۱۹۸۹) شیریں کے خطوط (۱۹۷۴) گل دستہ اور مرزا سلامت علی دبیر حیات اور کارنامے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

تحقیق کے شعبے میں پروفیسر موصوف کی گراں قدر تصنیف ''مرزا سلامت علی دبیر حیات اور کارنامے'' کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک بہترین تحقیقی مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مقالے پر انہوں نے لکھنو یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند حاصل کی۔ اس مقالے کا مطالعہ کرنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ موصوف ایک روشن دماغ اور مکمل نقاد و محقق ہیں۔ اس بارے میں پروفیسر ظہورالدین لکھتے ہیں۔

''ڈاکٹر محمد زماں آزردہ بھی اگرچہ تحقیق کی طرف زیادہ مائل نظر آتے ہیں لیکن اپنے تحقیقی مقالے ''سلامت علی دبیر حیات اور کارنامے'' کے بعد وہ تنقید کی طرف زیادہ مائل ہوئے جس کی وجہ سے ان کی بعد کی کاوشوں کو تنقید کے ہی زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ اپنے تحقیقی مقالے میں انہوں نے یقینا تحقیق کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے نہ صرف دبیر کی ادبی شخصیت سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے بلکہ ان کے کلام کو بھی مرتب کر کے اصلی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس مقالے کا تنقیدی حصہ بھی خوب

ہے اور اس سے دبیر کے کلام کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔''

(بازیافت۔شمارہ ۴۱۔۴۰۔۲۰۰۷۔ص۔110-111)

پروفیسر محمد زماں آزردہ نے مرزا سلامت علی دبیر کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی پوری تحقیقی وتنقیدی بصیرت کو بروئے کار لایا ہے۔موصوف نے دبیر کے کلام کو پرکھ کر ان کے ادبی مقام کا تعین کیا ہے ۔ایک محقق کو جس وسیع مطالعہ ، باریک بینی، تیز نگاہ، اور تجزیاتی شعور کی ضرورت ہوتی ہے۔موصوف میں یہ تمام اوصاف موجود ہیں۔ پروفیسر موصوف نے اپنی تحقیقی وتنقیدی تصنیف ''مرزا سلامت علی دبیر حیات اور کارنامے'' کو سات ابواب میں تقسیم کیا ہے۔باب اول میں مرزا سلامت علی دبیر کی حالات زندگی ،خاندانی پس منظر، شجرہ نسب، تعلیم ، ذرائع معاش اور ان کے قیام لکھنو وغیرہ کے بارے میں مفصل جائزہ لیا ہے۔ باب دوم میں مرزا سلامت علی دبیر کے شعری کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔باب سوم میں مرثیہ کی روایت اور مرزا دبیر کی مرثیہ گوئی کا بھر پور جائزہ لیا ہے۔ باب چہارم میں مرزا سلامت علی دبیر کی دیگر خصوصیات کا احاطہ کیا ہے۔باب پنجم میں مرزا دبیر کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کا مطالعہ کیا ہے۔باب ششم میں مرزا دبیر کے نثری کارنامے اور باب ہفتم میں مرزا دبیر کے ادبی مرتبے کا تعین کیا ہے۔ پروفیسر موصوف کی تصنیف مرزا سلامت علی دبیر حیات اور کارنامے اس بات کا ثبوت ہے کہ موصوف کا طریقہ تحقیق نہایت مدلل اور واضح ہے۔ موصوف اپنے تحقیقی وتنقیدی کارناموں کی وجہ سے ایک بالغ نظر نقاد اور محقق بن کر سامنے آئے۔

مختصراً جموں وکشمیر میں اردو محققین کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ جموں وکشمیر میں اردو تحقیق کی صورت حال کافی حد تک اطمینان بخش ہے یہاں دن بہ دن تحقیقی سرمایے میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔جموں وکشمیر کے نامور محققین پروفیسر اکبر حیدری ، پروفیسر حامدی کاشمیری، محمد یوسف ٹینگ ، پروفیسر ظہور الدین اور پروفیسر مرزا محمد زماں آزردہ کے تحقیقی کارناموں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے جنھوں نے اپنی تصانیف کو نہایت محنت ، لگن اور ایمانداری کے جذبے سے مقبول اور مستحکم بنا کر تحقیق کو اعلی وقار اور معیار بخشنے میں اہم رول ادا کر کے تحقیق وتنقید میں ماہرانہ دسترس حاصل کی۔ان کے تحقیقی وتنقیدی کارناموں کو برصغیر ہندو پاک کے محققین وناقدین کی صف میں برابر رکھا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

Muntakhab Demography ke tanazur mein zere tarbiyat asateza ki kaseer-ul-saqafati tadrisi istedad ka mutalea by Shaqueeb Sehar Amani(Research Scholar,Dept.of education&Training MANUU Hyd.

شاقب سحر امانی (ریسرچ اسکالر، شعبۂ تعلیم وتربیت، مانو، حیدرآباد)
ڈاکٹر شمشاد بیگم (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ تعلیم وتربت، مانو، حیدرآباد)

منتخب ڈیموگرافک خصوصیات کے تناظر میں

زیرتربیت اساتذہ کی کثیر الثقافتی تدریسی استعداد کا مطالعہ

تلخیص: ہندوستان کا کمرہ جماعت مجموعی طور پر ملک کے معروف تنوع کی عکاسی کرتی ہے۔ ہندوستان میں کمرہ جماعت شمولیاتی اور متنوع ثقافتی پس منظر کے طلباء پر مشتمل ہیں۔ وہ اپنی زبان، مذہب، ذات اور طبقے، سماجی اقتصادی حیثیت اور یہاں تک کہ صلاحیتوں کے لحاظ سے بھی مختلف ہیں۔ اسکولوں اور اساتذہ کے لین یہ ضروری ہے کہ وہ بچے کی کموانٹی، عقائد کے نظام اور ثقافت کا احترام اوران کی نمائندگی کریں۔ ایک حساس استاد ہی ایسا ماحول فراہم کرسکتا ہے جہاں طلباء کمرہ جماعت کے اندراور باہر آزادانہ طور پر بات چیت اوراپنے نسلی تنوع سے متعلق تجربات کو بیان کرسکتے ہیں۔ اس تحقیق میں مطالعہ کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیر وضاحتی تحقیاوڈیزائن کواختیار کیا گیا ہے۔ تحقیق کے نتجے۔ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مرد اور خواتین متوقع اساتذہ کی کثر الثقافتی تدریسی استعداد میں نمایاں فرق نہیں ہے۔ اس تحقیق سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ متوقع اساتذہ کی کثراالثقافتی تدریسی استعداد میں نمایاں فرق نہیں ہے۔ مطالعہ کے نتیجے میں یہ بھی سامنے آیا کہ معاشرے میں رہنے کے تجربے کے ساتھ اوراس کے بغر متوقع اساتذہ کی کثرل الثقافتی تدریسی استعداد میں نمایاں فرق ہے۔

تعارف: ہندوستان لسانی اور مذہبی تنوع سے لے کر علاقائی اور ذات پات کے تنوع تک بے پناہ ثقافتی تنوع کی سرزمین ہے۔ اس طرح کے متنوع پس منظر میں ہندوستانی نظام تعلیم تمام طلباء کو accommodate کرنے اور یکساں اور مساوی تعلیمی مواقع فراہم کرنے میں چیلنج کا سامنا کرتا ہے۔ آزادی کے بعد، ہندوستان اسکولی تعلم میں زبردست ترقی کی، جس کے نتیجے میں بڑی

تعداد میں بچے اسکولی تعلیم تک رسائی حاصل کرنے کے قابل ہوئے، اور کمرہ جماعت کے تنوع میں اضافہ ہوا جس سے اسکول کی آبادیاتی پروفائل متاثر ہوئی۔ ہندوستان کا کمرہ جماعت مجموعی طور پر ملک کے معروف تنوع کی عکاسی کرتی ہے۔ ہندوستان میں کمرہ جماعت شمولیاتی اور متنوع ثقافتی پس منظر کے طلباء پر مشتمل ہیں۔ وہ زبان، مذہب، ذات اور طبقے، سماجی اقتصادی حیثیت اور یہاں تک کہ صلاحیتوں کے لحاظ سے بھی مختلف ہیں (Nadda, 2017)۔ اسکولوں اور اساتذہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ بچے کی معاشرے، عقائد کے نظام اور ثقافت کا احترام اور ان کی نمائندگی کریں۔ اس طرح کی وسیع متنوع آبادی سے تعلق رکھنے والے طلباء اور سیکھنے والوں کی مختلف قسم کی ضروریات کو پورا کرنا بہت اہم ہے تاکہ انہیں ہندوستانی جمہوری معاشرے کا باخبر ممبر بنایا جا سکے۔ ہر بچہ اپنے آپ میں منفرد اور انوکھا ہوتا ہے، جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں۔ وہ مختلف طریقے، رفتار اور مختلف صلاحیتوں کے ساتھ سیکھتے ہیں (Gollnick and Chinn, 2017)۔

ایک بچہ اپنے خاندان سے باہر سب سے زیادہ قابل احترام اور قابل اعتماد لگاؤ اپنے استاد سے رکھتا ہے۔ ان کے متنوع ثقافتی پس منظر کے نتیجے میں، ان میں سے ہر ایک اپنا ذاتی شخصیت کو سنوارا ہے۔ ایک حساس استاد ہی ایسا ماحول فراہم کر سکتا ہے جہاں طلباء کمرہ جماعت کے اندر اور باہر آزادانہ طور پر بات چیت اور اپنے نسلی تنوع سے متعلق تجربات کو بیان کر سکتے ہیں۔ ایسے میں استاد ایک کلدی عنصر کے ساتھ ساتھ یکساں تعلیمی مواقع فراہم کرنے کے لئے ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے (Kennedy,2017)۔ ان کا کردار اپنے سیکھنے والوں کو متنوع ثقافت، لوگوں اور ان کے نقطہ نظر کی تفہیم پیدا کرنے، متنوع ثقافت کو قبولیت اور حوصلہ افزائی کا احساس پیدا کرنے میں بہت اہم ہو جاتا ہے۔ یہ تبھی ممکن ہے جب اساتذہ خود درسگاہ کی متنوع ثقافت کو سمجھیں اور اس کے تئیں مثبت رویہ رکھیں۔

متعلقہ مواد کا جائزہ Yilmaz,Fatih(2016) کے ذریعہ کثیر الثقافتی اور کثیر الثقافتی تعلیم کے عنوان پر ایک مطالعہ نے یہ نتیجہ اخذ کا و کہ کثیر الثقافتی تعلیم کی ٹرانزیشن میں اساتذہ کی بنیادی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی نتیجہ اخذ کیا کہ کثر والثقافتی تعلیم کے تئیں اساتذہ کی تعلیم اور اساتذہ کے مثبت رویے، پرامن اور قابل احترام ہونے، ملک کی علحدگی کے خوف کے بغرہ تمام شناختوں کو ان کی ثقافتی خصوصاعت کے ساتھ قبول کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ Alismail, Halah Ahmad(2016) نے کثیر الثقافتی تعلیمی کے نظریہ وعمل، اساتذہ کے تاثرات اور

تیاری کا مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ کے نتیجہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ مکمل اور متوازن کورسز ثقافتی طور پر متنوع طلباء کو پڑھانے کے لیو پری سروس ٹیچرس کو تیار کرتا ہے جو تمام طلباء کو یکساں تعلیم فراہم کرنے میں اساتذہ کی بیداری، علم اور مہارت کی حمایت کے لے ضروری ہیں۔ (Brown,
Lashonda(2009 نے طلباء اساتذہ کے رویوں اور ثقافتی طور پر متنوع طلبہ کی آبادی کو پڑھانے کی اپنی صلاحیت کی سمجھ کا جائزہ لنے, کے لئے ایک مطالعہ کیا۔ مقداری اعداد وشمار کے تجزیے سے طلباء کے رویوں میں ثقافتی طور پر متنوع طلباء کی آبادی کو سیکھانے کے لئے ان کی تیاری کے حوالے سے کوئی شماریاتی فائدہ نہیں دیکھا اور ساتھ ہی اساتذہ کی تعلیمی پروگراموں کی ضرورت کی طرف اشارہ کیا گیا تاکہ ایسی تبدیلیاں لائی جائیں جو پری سروس ٹیچرس کو ان کی کثیرالثقافتی صلاحیتوں کو بڑھانے کے مواقع فراہم کرسکیں۔

مطالعہ کے مقاصد 1.مرد اور خواتین ء زیر تربیت اساتذہ کی کثیر الثقافتی تدریسی استعداد کا موازنہ کرنا۔ 2۔ گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ زیر تربیت اساتذہ کی کثیرلثقافتی تدریسی استعداد کا موازنہ کرنا۔ 3۔ مختلف معاشرے میں رہنے والے تجربہ اور غیر تجربہ زیر تربیت اساتذہ کی کثیر الثقافتی تدریسی استعداد کا موازنہ کرنا۔

مطالعے کے مفروضات 1۔ مرد اور خواتین زیر تربیت اساتذہ کی کثر الثقافتی تدریسی استعداد کے درمیان کوئی معنی خیز فرق نہیں ہوگا۔

.2 گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ زیر تربیت اساتذہ کی کثیر ثقافتی تدریسی استعداد کے درمیان کوئی معنی خیز فرق نہیں ہوگا۔

.3 مختلف معاشرے میں رہنے والے تجربہ اور غیر تجربہ زیر تربیت اساتذہ کی کثر الثقافتی تدریسی استعداد کے درمیان کوئی معنی خیز فرق نہیں ہوگا۔

تحققن کے طریقہ کار: اس تحقیق میں مطالعہ کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے بیانیاں تحقیقی ڈیزائن کو عمل میں لایا گیا ہے۔ موجودہ مطالعہ کی آبادی بی ایڈ کرنے والے زیر تربیت اساتذہ پر مشتمل ہے۔ دہلی کے مرکزی یونیورسٹیوں سے IASE، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور CIE، دہلی یونیوسٹی کے بی ایڈ پروگرام میں داخل ہوئے طلباء سے کل 207 نمونوں کا انتخاب proportionate random sampling technique کے ذریعے سے کیا گیا۔ ڈیٹا کی حصولیابی کے لئے ایک خود ساختہ اور معیاری آلہ، "ملٹی کلچرل ٹچنگ کم پیٹینسی اسکل"، کا استعمال کیا گیاء جو کہ Licket-type

Five Point 45scale آئٹمز پر مشتمل ہے۔معطیات کی تجزیہ کرنے کے لیے بیانیاں اور تخمینی شماریات کا استعمال کیا گیا۔

ڈیٹا کا تجزیہ اور تشریح: مقصد 1: مطالعہ کا پہلا مقصد مرد اور خواتنز زیر تربیت اساتذہ کی کثر الثقافتی تدریسی استعداد کا موازنہ کرنا تھا۔ Independent-samples t-test کی مدد سے ڈیٹا کا تجزیہ کا گات اور نتائج جدول 1 میں دیے گئے۔

جدول 1: صنف کے لحاظ سے کثیر الثقافتی تدریسی استعداد کا موازنہ:

Gender	N	Mean	SD	t-value	P.Value
Male	98	167.13	21.458	.325	.746
Female	109	166.07	25.078		

تشریح:۔مندرجہ بالا جدول 1 سے، یہ واضح ہے کہ ٹی ویور (t-value) .325 ہے جو 0.05 کی سطح پر significant نہیں ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرد اور خواتین زیر تربیت اساتذہ کی کثیر الثقافتی تدریسی استعداد کے اوسط اسکور نمایاں طور پر کوئی نہیں ہے۔اس طرح، مرد اور خواتین زیر تربیت اساتذہ کی کثر ک الثقافتی تدریسی استعداد کے اوسط سکور کے درمیان کوئی خاص فرق موجود نہ ہونے کے صفر مفروضہ کو قبول کیا جاتا ہے۔

مقصد 2: مطالعہ کا دوسرا مقصد گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ زیر تربیت اساتذہ کی کثیر الثقافتی تدریسی استعداد کا موازنہ کرنا تھا۔ڈیٹا کا تجزیہ Independent-samples t-test کی مدد سے کیا گیا اور نتائج جدول 2 میں دیے گئے ہیں۔

جدول 2: تعلیمی استعداد کے لحاظ سے کثیر الثقافتی تدریسی استعداد کا موازنہ:

Edu. Qualification	N	Mean	SD	t-value	P.Value
Graduation	104	166.15	23.275	.260	.795
Post-Graduation	103	167.00	23.599		

تشریح: مندرجہ بالا جدول 2 سے یہ واضح ہے کہ ٹی ویود (t-value) .260 ہے 0.05 کی سطح پر significant نہیں ہے۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ زیر تربیت اساتذہ کی کثیر الثقافتی تدریسی استعداد کے اوسط اسکور میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس طرح گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ زیر تربیت اساتذہ کی کثیر الثقافتی تدریسی استعداد کے اوسط اسکور کے درمیان کوئی

معنی خیز فرق نہیں ہے اس لئے صفر مفروضہ کو قبول کیا جاتا ہے۔

مقصد3: مطالعہ کا تسرا مقصد مختلف معاشرے میں رہنے والے تجربہ اور غیر تجربہ زیر تربیت اساتذہ کی کثیر الثقافتی تدریسی استعداد کا موازنہ کرنا تھا۔ Independent-samples t-test کی مدد سے ڈیٹا کا تجزیہ کاوگاے اور نتائج جدول 3 میں ردیے گئے ہیں۔

جدول3: معاشرے میں رہنے والے کا تجربہ کے لحاظ سے کثیر الثقافتی تدریسی استعداد کا موازنہ:

Living Exp.in Communities	N	Mean	SD	t-value	P.value
Not Lived	31	156.74	24.010	2.573	.011
Lived	176	168.31	22.906		

تشریح: مندرجہ بالا جدول 3 سے، یہ واضح ہے کہ ٹی ویواز (t-value) 2.573 ہے، جو 0.05 کی سطح پر significant ہے۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ مختلف معاشرے میں رہنے کا تجربہ اور غیر تجربہ زیر تربیت اساتذہ کی کثرق الثقافتی تدریید استعداد کے درمیان میں معنی خیز فرق ہے۔ اس طرح مختلف معاشرے میں رہنے کا تجربہ اور غیر تجربہ زیر تربیت اساتذہ کی کثرق الثقافتی تدریسی استعداد کے درمیان معنی خیز فرق پایا گیا اس لئے صفر مفروضہ کو مسرد کر دیا جاتا ہے۔

نتائج: موجودہ تحقیق سے یہ نتائج اخذ ہوتا ہے کہ مرد اور خواتین زیر تربیت اساتذہ کی کثیر الثقافتی تدریسی استعداد میں نمایاں فرق نہیں تھا۔ اس تحقیق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ زیر تربیت اساتذہ کی کثیر الثقافتی تدریسی استعداد میں نمایاں فرق نہیں تھا۔ مطالعہ کے نتیجے میں یہ بھی سامنے آیا کہ معاشرے میں رہنے والے تجربہ اور غیر تجربہ زیر تربیت اساتذہ کی کثر الثقافتی تدریسی استعداد میں نمایاں فرق ہے۔ اس طرح یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ معاشرے میں رہنے والے تجربہ زیر تربیت اساتذہ غیر تجربہ زیر تربیت اساتذہ کے مقابلے نمایاں طور پر کثرے الثقافتی تدریسی استعداد حاصل کرتے ہیں۔

تعلیمی مضمرات: اساتذہ کی تعلم میں، مختلف معاشرے کی سماجی، اقتصادی وثقافتی زندگی سے متعلق سیمینار، ورکشاپ، پینل ڈسکشن کا انعقاد کیا جانا چاہیے تاکہ زیر تربیت اساتذہ کو اپنے طالب علم سے سمجھنے میں مدد ملے جو مختلف تہذیب وثقافت سے تعلق رکھتے ہیں۔

- اساتذہ کی تعلم کے نصاب میں مختلف معاشرے کی سماجی، اقتصادی اور ثقافتی زندگی سے

متعلق مواد کو شامل کی جائے۔

References

" Alismail, Halah Ahmad (2016). Multicultural Education: Teachers' Perceptions and Preparation Journal of Education and Practice Vol.7, No.11. https://files.eric.ed.gov/fulltext/EJ1099450.pdf

" Banks, J. A. (Eds). Multicultural education: Issues and perspectives (10th ed.), Ally & Bacon, Boston.

" Best, J. W. & Kahn J. V. (2005), Research in Education, 10th Edition, PHI publication. New Delhi.

" Creswell, J. W., & Creswell, J. D. (2018). Research Design: Qualitative, Quantitative, and Mixed Methods Approaches, Fifth Edition (5th ed.). SAGE Publications.

Creswell, John W. (2018), Educational Research: Planning, Conducting, and Evaluating Quantitative and Qualitative Research Fourth Editions, Pearson Education Services Pvt. Ltd, India

" Fatih, Y?lmaz (2016). Multiculturalism and multicultural education: A case study of teacher candidates' perceptions, Cogent Education, 3:1. doi:10.1080/2331186X.2016.1172394

" Gollnick, Donna M. and Chinn, Philip C. (2017). Multicultural education in a pluralistic society, Pearson, Tenth Edition, Boston.

" Kennedy, C. J. (2017). Roles of Teachers in

Multicultural Classrooms, Shanlax International Journal of Education, Vol. 6, Special Issue I, pp. 163-167, https://www.shanlax.com/wp-content/uploads/SIJ_EDU_Dec2017_V6_N1_035.pdf

" Lashonda D. Brown (2009). Preservice Teachers' Attitudes Toward Their Preparedness to Teach Culturally Diverse Student Populations A Dissertation Doctor of Education, Department of Curriculum and Instruction Graduate School of The University of Alabama, Tuscaloosa Alabama https://ir.ua.edu/bitstream/handle/123456789/656/file_1.pdf?sequence=1&isAllowed=y

" Nadda, Prachi (2017). Teaching Strategies in a Multicultural Classroom Imperial Journal of Interdisciplinary Research (IJIR) Vol 3, Issue- 2, 2017, pp. 741-743

☆☆☆

Mahnama "Sabras":ek Ijmaali jaeza by Sartaj Ahmad mir
(Research Scholar,Dept.of Urdu University of Hyedrabad,Hyd.)
سرتاج احمد میر (ریسرچ اسکالر یونیورسٹی آف حیدرآباد،حیدرآباد)

ماہ نامہ ''سب رس'' - ایک اجمالی جائزہ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک بلند پایہ محقق، نقاد، مورخ، افسانہ نگار، شاعر، مخطوطہ شناس، صحافی اور اعلیٰ پایہ کے استاد ہونے کے علاوہ ماہر لسانیات وصوتیات اور ماہر دکنیات بھی تھے۔ ڈاکٹر زور نے اپنے چند رفقاء پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، پروفیسر عبدالقادر صدیقی اور مولوی نصیرالدین ہاشمی کے تعاون سے دکن اور دکنیوں کی تخلیقی، تحقیقی، تنقیدی اور شعری صلاحیتوں کی نشونما اور دکنی کلچر کو فروغ دینے کے لیے 25 جنوری 1931 کو ''ادارہ ادبیات اردو'' حیدراباد کا قیام عمل میں لایا۔ اس ادارے کے قیام کے اغراض مقاصد میں سب سے اہم اور اوّلین مقصد اردو زبان وادب کی توسیع وحفاظت اور سرزمین دکن میں اردو زبان وادب کا صحیح ذوق پیدا کرنا تھا۔ ادارے کے قیام کے بعد اس کے اغراض ومقاصد کے نشر واشاعت کے لیے ڈاکٹر زور نے جنوری 1938ء ماہ نامہ ''سب رس'' جاری کیا۔ رسالے کے پہلے شمارے کے پیش لفظ میں اس کے مقاصد اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

''سب رس'' ''ادارہ ادبیات اردو'' کا ترجمان ہے جو ہر مہینے اردو زبان اور ادب کی خدمت کے لیے شائع ہوا کرے گا۔ اس ادارے نے اب تک سنجیدہ علمی وادبی کتابیں شائع کر کے اردو کی جو خدمت کی ہے وہ علم دوست اصحاب سے مخفی نہیں ہے۔۔۔۔۔ ہمارے بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جن کا اثر یا فائدہ ایک خاص حلقہ یا طبقہ تک ہی پہنچتا ہے۔ اب ایسے کاموں اور تحریکوں کی زیادہ ضرورت ہے جو سب رس بن سکیں اور ایسے ماہنامے اور روز نامے نکالے جائیں جن میں بھانت بھانت کی باتوں اور طرح طرح کی معلومات کا نچوڑ ہو اور جن کو ہر وہ شخص دلچسپی سے پڑھ سکے جو کسی خاص علم و فن کا ماہر نہ ہو اور اپنی فرصت کی گھڑیوں کو خوشگوار طریقہ پر گزارنا چاہتا ہو۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے اردو زبان کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا اور ہماری اواز دور تک پہنچ سکے گی۔۔۔۔۔ سب رس کا سب سے بڑا مقصد یہی ہوگا کہ وہ سب کے لیے ہو وہ سب کے لیے اسی وقت بن سکے گا جب اس کی

زبان سلیس اور سادہ ہوگی اور جب اس میں سب طرح کے موضوعوں پر دلچسپ مضمون، نظمیں اور افسانے چھپتے رہیں۔ ادارہ اسی وقت خود کو کامیاب سمجھے گا جب ''سب رس'' بچوں اور بوڑھوں، عورتوں اور مردوں سب کے لیے دلچسپی کا باعث بن سکے۔''1؎

ادارہ ادبیات اردو کے ترجمان رسالہ ''سب رس'' کا پہلا شمارہ جنوری 1938 میں مکتبہ ''ابراہیمیہ مشین پریس'' میں طبع ہوکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت اباد سے منظر عام پر ایا۔ ڈاکٹر زور معتمد عمومی ''ادارہ ادبیات اردو'' رسالہ ''سب رس'' کے نگران مقرر ہوئے اور دکن کے ذہین وفطین شاعر وادیب صاحبزادہ میر محمد علی خان میکش ؟ کو ''سب رس'' کی ادارت کے فرائض سونپے گئے۔ خواجہ حمید الدین شاہد، مہتمم ادارہ نے میکش کو اپنے بھرپور تعاون سے نوازا۔ ''سب رس'' کے پہلے شمارے کے لیے مایہ ناز حسن کار عبدالرحمن چغتائی نے ایک خوبصورت سرورق تیار کیا تھا۔ جس نے رسالہ ''سب رس'' کے ظاہری حسن کو دوبالا کر دیا۔ ''سب رس'' کی دلکشی اور جاذبیت میں اضافہ کرنے کے لیے بہت ساری قدیم، نایاب اور قلمی تصویریں بھی شائع کی گئیں۔ رسالہ کو ایک طرف معلومات افریں بنایا گیا تو دوسری طرف اس میں سلاست اور افادیت کا بھی خاص خیال رکھا گیا جس سے یہ رسالہ نہ صرف حیدراباد بلکہ حیدراباد سے باہر بھی بہت مشہور ہوا۔

رسالہ ''سب رس'' کے پہلے شمارے میں جو اغراض ومقاصد اور قواعد تحریر کیے گئے ہیں ان میں چند اہم حسب ذیل ہیں:

(۱) یہ سلسلہ ادارۂ ادبیات اردو کا ماہوار علمی وادبی رسالہ ہے جس میں اردو زبان وادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابل اشاعت متصور نہیں ہوں گے۔

(۳) اردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کر کے اردو تصنیف وتالیف کا ذوق صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اردو میں منتقل کر کے اردو کے علمی وادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہ رسالہ کم از کم ۶۴ صفحات اور زیادہ سے زیادہ ۹۶ صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا۔

رسالہ ''سب رس'' ایک سال تک پابندی سے شائع ہوتا رہا مگر جب اس کی مانگ بڑھی تو اس کے لیے ایک مجلس انتظامی کی ضرورت محسوس کی گئی۔ چنانچہ 1939 کے اغاز میں ڈاکٹر زور نے ادارے کے دوسرے شعبوں کی طرح ''سب رس'' کی بھی ایک مجلس ادارت قائم کر دی جس کے اراکین میں صاحبزادہ محمد علی خان میکش، سکینہ بیگم، خواجہ حمید الدین شاہد اور معین الدین انصاری شامل تھے۔ خواتین کے مضامین اور نظموں کا انتخاب سکینہ بیگم کے سپرد کیا گیا۔ ابتداء میں ''بچوں کا سب رس'' رسالے کے اخری صفحات پر ہی ضمیمہ کی حیثیت سے شائع کیا جاتا تھا لیکن بعد میں اس کی مقبولیت اور بچوں کی دلچسپی دیکھتے ہوئے اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ بچوں کے لیے علاحدہ رسالہ جاری کیا جائے۔ چنانچہ ''بچوں کا سب رس'' الگ سے نکالا جانے لگا جس کی ترتیب معین الدین انصاری انجام دینے لگے۔ بچوں کے سب رس کے علاوہ 1940 میں ایک اور رسالہ ''سب رس معلومات'' کے نام سے جاری کیا گیا جس میں ناموراور مشہور اشخاص کی زندگیاں، عام فہم سائنس کے مضامین، تعلیمی اور سیاسی خبریں، مسابقتی امتحانات سے متعلق معلومات اور کھیلوں کی خبریں وغیرہ شامل کی گئیں۔ اس حصہ کے اجراء کا اصل مقصد یہ تھا کہ جو لوگ حیدراباد یا برطانوی ہند کے مسابقتی امتحانات میں حصہ لینا چاہتے ہیں ان کے لیے اردو زبان میں قیمتی معلومات اور حالات حاضرہ سے متعلق تمام جانکاری فراہم کی جائیں۔ اس کی ترتیب کا کام عبدالحفیظ صدیقی سرانجام دینے لگے۔ تقریباً دو سال بعد مالی دشواری کے باعث ''سب رس معلومات'' کو بند کر دیا گیا اور اگے چل کر وسائل کی قلت کے سبب بچوں کی معلومات کا حصہ بھی ''سب رس'' میں ہی ضم کر دیا گیا۔ اس بارے میں پروفیسر سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

''سب رس ادارے کا ترجمان تھا اور جنوری 1938 میں اس کا پہلا شمارہ طبع ہو کر منظر عام پر ایا تھا۔ بچوں کے لیے ''بچوں کا سب رس'' اور ''سب رس معلومات'' شائع کیے تھے جو بعد میں بند کر دئے گئے اور ''سب رس'' ہی میں چند صفحات بچوں کے لیے مختص کر دئے گئے تھے۔''2؎

رسالہ ''سب رس'' کی ادارتی ذمہ داریوں کو ڈاکٹر زور کی حیات اور نگرانی تک صاحبزادہ میکش، خواجہ حمید الدین شاہد، سلیمان اریب، وقار خلیل اور پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی نے مشاورتی بورڈ کے تعاون سے احسن طور پر انجام دیا۔ ڈاکٹر زور کی وفات کے بعد رسالہ ''سب رس'' کو ان کی یادگار ہونے کا شرف حاصل ہوا اور صدر ادارہ سید علی اکبر نے اس کی ادارت قبول فرمائی۔ اس کے بعد محمد اکبر الدین صدیقی، میر حسن اور غلام جیلانی نے ''سب رس'' کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔

ڈاکٹر زور کے بعد ''سب رس'' کو امتیازی خصوصیت عطا کرنے میں نامور نقاد پروفیسر مغنی تبسم کا غیر معمولی کردار رہا ہے۔ انھوں نے ''سب رس'' کے معیار پر اس قدر توجہ کی کہ اج ''سب رس'' کا شمار اردو کے صف اوّل کے رسائل میں ہوتا ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم اکتوبر 1978 میں رسالہ ''سب رس'' سے وابستہ ہوئے۔ ان کے ساتھ کچھ عرصہ تک وقار خلیل بھی ''سب رس'' کی ادارت میں بہ حیثیت معاون مدیر مصروف کار رہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے دشوار اور نامساعد حالات میں بھی ادارے اور ''سب رس'' کی سرگرمیوں کو خوش اسلوبی کے ساتھ جاری رکھا۔ پروفیسر فضل اللہ مکرم ''سب رس'' کے تئیں ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

''اپ (پروفیسر مغنی تبسم) نے دریا دلی سے رسالے کی ضخامت، کتابت وطباعت اور خوبصورت گٹ اپ دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ انھوں نے سب رس کے کئی خصوصی نمبر اور قلمکاروں کے کئی خصوصی گوشے شائع کیے ہیں۔ ''سب رس'' کو امتیازی خصوصیت عطا کرنے میں پروفیسر مغنی تبسم کا غیر معمولی کردار رہا ہے۔'' ۳؎

پروفیسر مغنی تبسم نے علالت کے باعث نومبر 2009 میں ''ادارہ ادبیات اردو'' کے معتمد عمومی کی حیثیت سے استعفیٰ پیش کیا اور ساتھ ہی ''سب رس'' کی ادارت سے بھی کنارہ کشی اختیار کرلی۔ 2010 کے اغاز سے ستمبر 2012 تک رسالہ ''سب رس'' کی ادارت کے فرائض عہد حاضر کے مشہور فکشن نگار، ساہتیہ اکیڈمی ایواڈ یافتہ پروفیسر بیگ احساس صاحب بہ حسن وخوبی انجام دے رہے تھے۔ انکے انتقال کے بعد رسالہ ''سب رس'' کی ادارت کے فرائض پروفیسر ایس۔ اے۔ شکور صاحب انجام دے رہے ہیں جو فی الوقت رسالے کے معتمد عمومی بھی ہیں۔ رسالے کی موجودہ مجلس ادارت میں راج کماری اندرا دیوی دھن راج گیرجی (سرپرست)، جناب زاہد علی خان (صدر) اور پروفیسر ایس۔ اے۔ شکور (معتمد عمومی) شامل ہیں جب کہ مجلس مشاورت پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر اشرف رفیع پر مشتمل ہیں۔

رسالہ ''سب رس'' نے دکن کے اہل قلم اصحاب، شاعروں، افسانہ نویسوں، جامعہ عثمانیہ کے فرزندوں اور خواتین قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کو ابتداء سے اب تک اوّلیت دی ہے۔ ان اصحاب کے ساتھ ساتھ ہندو پاک کے صف اوّل کے لکھنے والوں کا تعاون بھی رسالہ ''سب رس'' کو ہر عہد اور ہر دور میں رہا ہے۔ ان اہل قلم حضرات میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور، عبدالقادر سروری، علی عباس حسینی، فراق گورکھپوری، پروفیسر مسعود حسن رضوی، قاضی عبدالغفار، امجد حیدرابادی، نصیر الدین ہاشمی،

احمد ندیم قاسمی، سلیمان اریب، اکبرالدین صدیقی، میراں جی ؟ محبوب حسین جگر، مغنی تبسم، مجتبیٰ حسین اور بیگ احساس وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

رسالہ ''سب رس'' کی نمایاں خصوصیت اس کا علمی وادبی تنوع ہے۔ اغاز سے ہی یہ خیال پیش نظر رہا ہے کہ اس میں ''سب کے لیے سب کچھ ہو''۔ چنانچہ ''سب رس'' میں علمی، ادبی اور تحقیقی مضامین کے ساتھ ساتھ تخلیقی ادب کو بھی جگہ دی جاتی ہے۔ یہ رسالہ کسی مخصوص تحریک کا علم بردار نہیں رہا لیکن ہر دور کے بدلتے ہوئے رجحانات کا ساتھ ضرور دیتا رہا ہے۔ رسالے نے اعتدال پسندی کو ہر دور میں اپنا شعار بنایا ہے۔ رسالہ ''سب رس'' میں مضامین کے انتخاب میں بڑی وسیع النظری رکھی جاتی ہے۔ ڈاکٹر زور ؟ نے واضح طور پر کہا تھا کہ افسانوں، نظموں، تحقیقی، علمی، ادبی اور تنقیدی مضمونوں اور اردو کی مطبوعات پر غیر جانب دار تنقیدوں کے سوا ارٹ پر بھی مضامین چھپتے رہیں گے۔ اس معیار کو رسالہ ''سب رس'' نے ہر دور میں اوّلیت دی۔ رسالہ ''سب رس'' اپنے مضامین کے اعتبار سے انتہائی معیاری ہے۔ اردو کے بڑے بڑے ادباء، شعراء، محققین اور ناقدین نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اس رسالہ کو نہ صرف زینت بخشی بلکہ اس کے مقام کو بھی بلند کیا ہے۔ ادبی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ رسالہ اردو ادب میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔

ادارہ ادبیات اردو نے ''سب رس'' کے عام شماروں کے علاوہ مختلف موقعوں پر خصوصی نمبرات بھی شائع کیے ہیں جو دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں اور اردو دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان میں علمی، ادبی اور سیاسی شخصیتوں پر بھی خاص نمبرات ملتے ہیں اور ساتھ ہی ادبی تحریکوں اور ادبی اداروں پر بھی خاص نمبرات نکالے گئے ہیں۔ یہ خصوصی نمبرات اتنے مقبول ہوئے کہ ''سب رس'' کے ہم عصر رسائل وجرائد نے اپنے صفحات میں تعریفی وتوصیفی الفاظ میں ان پر تبصرے کیے، جن کو بعد میں ادارے کی رپوٹوں میں شامل کیا گیا۔ ان خصوصی نمبرات میں محرم نمبر (مارچ 1938)، اقبال نمبر (جون 1938)، دکن نمبر (جنوری 1939)، اردو نمبر (جنوری 1940)، ترقی پسند ادب نمبر (جولائی 1944)، قلی قطب شاہ نمبر (اپریل، مئی، جون 1958)، ادارہ نمبر (مارچ 1060)، ٹیگور نمبر (جون 1961)، امجد نمبر (مئی وجون 1962)، زور نمبر (اکتوبر، نومبر، دسمبر 1963)، غالب نمبر (ستمبر، اکتوبر، دسمبر 1969) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان خصوصی نمبرات کے علاوہ رسالہ ''سب رس'' میں خصوصی گوشے بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں گوشہ محی الدین قادری زور (مارچ 1983)، گوشہ جامعہ عثمانیہ (دسمبر

1993)، گوشہ شمیم حنفی (دسمبر 1998)، گوشہ عبدالستار دلوی (اکتوبر 1998)، گوپی چند نارنگ (مئی 2016)، گوشہ مشتاق یوسفی (جولائی 2018) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اردو رسائل کی تاریخ میں ''سب رس'' ایک ایسا رسالہ ہے جس نے نہ صرف اپنے معیار کو بلند رکھا بلکہ پچھلے چراسی برسوں سے اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ زمانے کے تھپیڑوں کو برداشت کرتے ہوئے اس رسالے کا مسلسل شائع ہونا اس کی مقبولیت کا غماز ہے۔

حوالہ جات 1۔ محی الدین قادری زورؔ ''اداریہ'' رسالہ سب رس حیدرآباد دکن، جنوری 1938 جلد ۱، شمارہ ۱، ص ۵،۶

2۔ پروفیسر سیدہ جعفر، ہندوستانی ادب کے معمار ڈاکٹر زورؔ (ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی 1984) ص 39

3۔ پروفیسر سید فضل اللہ مکرم ''ڈاکٹر زورؔ اور سب رس''، مشمولہ سنگ و ثمر (ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، نئی دہلی 2014) ص 129

☆☆☆

Reyasat-e-Telangana mein qanoon-e-Haq Taleeem ke Asaraat ka Jaeza by MD.Jeelani(Research Scholar.,dept.of Public Administration,MANUU Hyderabad)

محمد جیلانی (ریسرچ اسکالر، شعبہ نظم ونسق عامہ، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد)

ریاست تلنگانہ میں قانون حق تعلیم کے اثرات کا جائزہ

تعلیم کی تاریخ تقریباً اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ انسان کی تاریخ۔ تعلیم انسان کو انسانیت سے روشناس کرواتی ہے اور انسان میں موجود تمام صلاحیتوں کو نکھارنا صرف تعلیم کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ تعلیم سے ہی انسان نامعلوم سے معلومات کی جانب بڑھتا ہے اور پھر انسان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ھیکہ اس نے تعلیم جیسی نعمت کو فروغ دیا ہے۔ دنیا میں ہر انسان پیدائش سے موت تک سیکھتا ہے۔ زمانہ قدیم تا عصر حاضر تک تعلیم یافتہ افراد اپنے سماج کو مہذب بنا رہے ہیں اور مہذب سماج ہی ملک کی ترقی کا ضامن ہے۔ جب شہری تعلیم سے آراستہ ہوں تو وہ معاشی اعتبار سے بھی مستحکم ہوتے ہیں اور ملک کو استحکام بخشتے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ یہ نعمت ہر کس و ناکس کو مساوی میسر نہیں ہے۔ تعلیم ہی طئے کرتی ہے کہ آیا ملک، قوم یا سماج کی خوشحالی اور ترقی کی سطح کیا ہے۔ تعلیم کا نصب العین بہتر انسان پیدا کرنا ہے جو معقول فکر وعمل کے حامل ہوں جس میں ہمدردی اور رحم دلی کا جذبہ ہو، ہمت اور تحمل ہو، سائنسی رجحان اور تخلیقی مزاج ہو اور بہتر اخلاقی اقدار کے مالک ہوں۔ تعلیم ایک ایسا حرکی عمل ہے جس کے ذریعہ فرد کی شخصیت کی اس انداز میں نشوونما ہوتی ہے کہ وہ کائنات اور اردگرد کے ماحول کے علاوہ مظاہرات کی تخلیق کا مقصد اور اپنی روایتی ذات کی تخلیق کا مقصد معلوم کر سکے۔ 1؎ ہر زمانے میں تعلیم کو سماج میں مرکزی اہمیت حاصل رہی ہے۔ مفکرین نے تعلیم کی اہمیت و افادیت کا مختلف نوعیتوں کے اعتبار سے اظہار کیا ہے۔ تعلیم کی اہمیت کے مختلف پہلوؤں کو قدیم اور جدید مفکرین جیسے سقراط، افلاطون، ارسطو، روسو، جان ڈیوی، ہنری پیستالوزی، ہربرٹ اسپنسر، ایف۔ ڈبلیو پارکر، ہربارٹ، شنکر آچاریہ، کوٹلیا، ٹیگور، ویویکانند، علامہ اقبال، ڈاکٹر ذاکر حسین، سرسید احمد خاں نے اُجاگر کیا ہے۔ ان کے علاوہ ایک آفریقی جہد کار و سابقہ صدر جنوبی آفریقہ نیلسن منڈیلا 2؎ نے تعلیم کی تعریف یوں کی ھیکہ ''تعلیم دنیا کو بدلنے کا سب سے طاقتور ہتھیار ہے'' ان کے مطابق تعلیم معاشرے کی بنیاد ہے جو معاشی،

سماجی خوشحالی اور سیاسی استحکام لاتی ہے یہ عوام کو اپنے خیالات، حقیقی صلاحیت کے اظہار کرنیکی طاقت فراہم کرتی ہے۔ تعلیم حکومتوں میں حصہ داری کو فروغ دے کر جمہوریت کو مستحکم کرتی ہے۔ تعلیم سماجی ہم آہنگی اور قومی شناخت کو فروغ دینے کے لئے ایک مربوط قوت کے طور پر کام کرتی ہے۔3۔

بین الاقوامی سطح پر تعلیم کو ایک بنیادی حق تسلیم کیا گیا ہے۔ **عالمی انسانی حقوق قرارداد 1948، تعلیم میں تعصب کے خلاف کنونشن اور عالمی قرارداد برائے سب کے لئے تعلیم اعلامیہ 1990** تعلیمی حق کی تصدیق کرتے ہیں۔ حقوق اطفال اور انسانی تحفظ سے منسلک بین الاقوامی اداروں، کانفرنسوں، مختلف معاہدوں اور قراردادوں اور اعلامیوں کے ذریعہ تعلیم کو آئینی حق بنانے کے لئے بہت کوششیں کی گئیں۔

ہندوستان نے عالمی سطح پر طئے پانے والے کئی بین الاقوامی مسودوں اعلانوں اور معاہدات پر ہمیشہ سے ہی رضامندی کا اظہار کرتا رہا ہے بلخصوص ہندوستان انسانی حقوق سے متعلق تمام معاہدات کا پابند رہا ہے جس میں تعلیم سے متعلق کئی اقدامات بھی شامل ہیں۔ اس لئے بھی ہندوستان میں حق تعلیم کے حصول کیلئے اور اپنے طئے کئے گئے اہداف کے حصول کے لئے وقتاً فوقتاً اقدامات کرتا آیا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد دستور سازوں نے تعلیم کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے دستور میں حق تعلیم کو شامل کیا۔4۔ دستور ہند کے رہنمایانہ اصولوں میں دفعہ 45 کے تحت یہ کہا گیا کہ مملکت اس آئین کی تاریخ نفاذ سے دس سال کی مدت کے اندر سب بچوں کو 14 سال کی عمر پوری کرنے تک مفت اور لازمی تعلیم دینے کوشش کریگی۔ البتہ اس خصوص میں کئی دھوں تک کسی قسم کی پیشرفت نہیں کی گئی۔ سال 2002ء میں 86 ویں ترمیم کے ذریعہ پہلی بار تعلیم کو بنیادی حقوق میں شامل کرتے ہوئے دفعہ (21(A کا اضافہ کیا گیا جس میں کہا گیا کہ مملکت 6 سے 14 سال تک کی عمر والے سبھی بچوں کے لئے مفت اور لازمی تعلیم دینے کا ایسا طریقہ قانون کے ذریعہ متعین کریگی۔5۔

حق تعلیم کے لئے حکومت ہند و ریاستی حکومتوں نے پالیسیاں، پروگرام، اسکیمات اور قوانین بنائے ہیں جیسے کہ قومی تعلیمی پالیسی 1986، بچوں کی ترقی پر مربوط اسکیم (ICDS)، نودیاودیالیہ اسکیم 1986، آپریشن بلیک بورڈ اسکیم 1987، نیشنل اوپن اسکول 1989، معذور بچوں کے لئے مربوط تعلیم پروجکٹ 1986، اقلیتوں کے لئے ہمہ رخی پروگرام 1987، دوپہر کے کھانے کی اسکیم 1995 اور تعلیمی وظائف شامل ہیں۔ قومی نئی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی تعلیم کو عام کرنے کے لئے موثر اقدامات کئے گئے ہیں۔

قانون حق مفت اور لازمی تعلیم برائے اطفال 2009 کے اہم خدوخال

86 ویں آئینی ترمیم کے تحت **قانون حق مفت اور لازمی تعلیم برائے اطفال 2009** کو پارلیمنٹ میں 26 اگست 2009 کو صدر جمہوریہ کی رسمی منظوری حاصل کر کے ہندوستان کے قومی جریدہ (گیزٹ) میں شائع کیا گیا اور اپریل 2010 سے پورے ملک میں نافذ العمل ہوا۔ یہ قانون VII ابواب' 38 سکشن اور اسکول کے ضابطے اور معیارات کیلئے ایک شیڈول پر مشتمل ہے۔ 6۔ اسکے اہم خدو خال حسب ذیل ہیں۔

1۔ 6 تا 14 سال کی عمر والے تمام بچے اسکول میں ایلیمنٹری سطح کی تعلیم مکمل کرنے تک مفت اور لازمی تعلیم حاصل کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

2۔ اس قانون پر عمل آوری کے لئے مالیہ فراہم کرنیکی ذمہ داری مشترکہ طور پر ریاستی اور مرکزی حکومت پر عائد ہوتی ہے۔

3۔ مدارس کا قیام' عمارت کی تعمیر' تدریسی عملہ' تدریسی و اکتسابی اشیاء کے علاوہ بنیادی سہولتوں کی فراہمی متعلقہ حکومت کی ذمہ داری ہوگی۔

4۔ اس قانون کے تحت والدین یا سرپرستوں کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اپنے بچوں کو قریبی مدارس میں داخلہ دلوائیں۔

5۔ 3 سال سے زائد عمر والے بچوں کو تحتانوی تعلیم کیلئے آمادہ کرنا اور 6 سال کی عمر کی تکمیل سے قبل انہیں تحفظ اور ماقبل تحتانوی تعلیم فراہم کرنا ہوگا۔ ایسے بچوں کو مفت ماقبل اسکولی تعلیم فراہم کرنے کے لئے ضروری اقدامات متعلقہ حکومت کرے گی۔

6۔ امدادی وغیر امدادی مدارس میں اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ آئندہ تعلیمی سال سے کم از کم 25 فیصد بچوں کو داخلہ دینا چاہیے۔ غیر امدادی مدارس کو اس سے متعلق اخراجات ریاستی حکومت کی جانب سے ادا کئے جائیں گے۔

7۔ بچوں کو مدرسہ میں داخلہ کیلئے کوئی شرط نہ ہوگی اور کیا پٹیشن فیس بھی وصول نہیں کی جائے گی بصورت دیگر جتنی رقم کیا پٹیشن فیس کے طور پر وصول کی گئی اس کا دس گناہ جرمانہ عائد کیا جائے گا اور سزا بھی دی جائے گی۔ لڑکے یا لڑکیوں کے داخلے کیلئے اگر شرط لگائی جائے تو پہلی مرتبہ غلطی کے مرتکب ہونے پر 25000 روپے اور دوسری مرتبہ 50000 روپے جرمانہ عائد کیا جائے گا۔

8۔ مسلمہ حیثیت ختم کردیئے جانے کے باوجود اگر کوئی شخص مدرسہ کو بند نہ کرنے پر ایک لاکھ تک کا

جرمانہ عائد کیا جائے گا۔اگر اس کی مزید خلاف ورزی کی جائے تو یومیہ دس ہزار روپے جرمانہ عائد کیا جائے گا۔

9۔ خانگی غیرامدادی مدارس کے سوا تمام مدارس میں مقامی حکومت کیلئے منتخبہ عوامی نمائندوں اولیائے طلبہ یا سرپرستوں اور اساتذہ پر مشتمل مدرسہ انتظامی کمیٹی کا قیام عمل میں لایا جائے۔کمیٹی میں تین چوتھائی اراکین والدین رہیں گے جسمیں خواتین کی 50% نمائندگی ہوگی۔

10۔ اساتذہ وقت کی پابندی، بروقت اسباق کی تدریس، بچوں کی استعداد کا اندازہ لگا کر ضروری ہو تو زائد اکتساب فراہم کرنا، اولیائے طلبہ کے ساتھ بلاناغہ اجلاس منعقد کرنا اور بچوں کی ترقی سے متعلق مطلع کرنا جیسے امور کو انجام دینا چاہیے۔

11۔ اس قانون کے تحت اول تا پنجم جماعت کی تدریس کیلئے 60 بچوں کیلئے دو، 61 تا 90 کیلئے تین، 91 تا 120 کیلئے چار، 121 تا 200 بچوں کے لئے پانچ اساتذہ ہونے چاہئے۔150 سے زائد بچوں کی تعداد والے مدرسہ میں پانچ اساتذہ کے علاوہ ایک صدر مدرس بھی موجود ہونا چاہیے۔200 سے زائد بچوں کی تعداد والے مدارس میں صدر مدرس کے علاوہ 1:40 کے تناسب میں اساتذہ موجود رہنا چاہیے۔

12۔ ششم تا ہشتم تدریس کیلئے فی جماعت ایک معلم کے ساتھ زائد طور پر سائنس، ریاضی اور سماجی علم کیلئے فی زبان ایک معلم کا ہونا ضروری ہے۔

13۔ اگر بچے پڑھنے کے حق سے محروم کردیے جائیں تو وہ ازروئے قانون سے انصاف طلب کرسکتے ہیں۔7

قانون حق تعلیم کی اہم خصوصیات

☆ تعلیم مفت اور لازمی ہوگی۔اسکول بچے کے گھر کے پاس ہوگا۔تعلیم کا معیار اطمینان بخش ہوگا۔

☆ لازمی تعلیم کا مطلب ہے کہ حکومت اتنے اسکول کھولے گی کہ کوئی بچہ اسکول سے باہر نہ رہے۔

☆ بچے کی عمر چھ تا چودہ سال تک ہونی چاہیے اور وہ کسی قسم کی فیس نہیں دے گا۔

☆ بچوں کو کسی قسم کی سزا خواہ وہ ذہنی ہو یا جسمانی نہیں دی جائیگی۔

☆ تعلیم چھوڑنے والے بچوں کو ان کی عمر کے مطابق جماعت میں لیا جائے

☆ تعلیم ایسی ہو جو بچے کے ماحول سے مطابقت رکھتی ہو اور وہ بچے کے اردگرد گھومے۔

☆ تعلیمی خرچ سرواشکھشا ابھیان کی طرح مرکزی حکومت 90 اور ریاستی حکومت 10 فیصد برداشت

کریگی۔

☆ حق تعلیم قانون (RTE) کی باقاعدہ مانیٹرنگ ہوگی۔اس کی رپورٹ ہر چھ مہینہ میں شائع کی جائے گی۔8۔

قانون حق مفت اور لازمی تعلیم برائے اطفال 2009 کے تحت مرکزی حکومت سالانہ اخراجات کا تخمینہ تیار کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً ریاستوں کو اپنے حصہ کا مالی تناسب 80 فیصد فراہم کرتی ہے۔ریاستی حکومت مقامی حاکم یا اسکول منتظمہ کمیٹی کو وقت ضرورت رہنما خطوط جاری کرسکتی ہے۔اور اسی طرح موزوں حکومت قانون کے تحت چند قواعد بنانے کا اختیار قانون کے دفعات 4 تا34 کے تحت رکھتی ہے جس میں رقبہ اور حدود میں اسکولوں کا قیام' اساتذہ وطلبا کو خصوصی تربیت' بچوں کا ریکارڈ مرتب کرنا' ریاستی' مقامی اور اسکول منتظمہ کمیٹی کے ذریعہ انجام دیئے جانیوالے کام سے متعلق' اسکول کی ترقی کی منصوبہ بندی' اساتذہ کے مشاہرہ والاؤنس وفرائض' مرکز وریاستی مشاورتی کونسل کا قیام واراکین کی تعداد معیاد وشرائط وغیرہ سے متعلق تمام تفصیلات ان دفعات میں تذکرہ کیا گیا ہے۔9۔

ریاست تلنگانہ میں حق تعلیم کے اثرات:

ریاست تلنگانہ ہندوستان کی 29 ویں ریاست ہے' جسکا قیام 2 جون 2014 کو عمل میں آیا۔ریاست تلنگانہ کی آبادی مردم شماری 2011 کے مطابق 35193978 ہے اور شرح خواندگی کل 66.46 فیصد ہے جسمیں مرد شرح خواندگی 74.95 فیصد اور خواتین کی 57.92 فیصد ہے۔10۔ ریاست تلنگانہ میں پرائمری' اپر پرائمری اور سیکنڈری سطح پر تعلیمی صورتحال کو بہتر کرنے کے لئے اور اسکولوں میں بچوں کے داخلے کے ساتھ انکی تعلیم میں برقراری کے لئے کئی اقدامات کررہی ہے جسکی وجہ سے اسکولوں میں طلباء کی تعداد میں اضافہ' اساتذہ کی تعداد میں اضافہ اور پھر ترک تعلیم کے فیصد میں کمی ہونا حکومت کے اقدامات کے مثبت اثرات کو ثابت کرتا ہے۔اس تناظر میں ریاست تلنگانہ میں کئے جارہے اقدامات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

طلباء کی تعداد میں اضافہ:

تلنگانہ میں شرح خواندگی میں اضافہ کے لئے کئے جانے والے اقدامات کی وجہ سے کافی مثبت نتائج برآمد ہوئے ہیں جن کی تفصیلات مندرجہ ذیل پیش کی گئی ہیں۔ریاست تلنگانہ کے قیام کے بعد تعلیمی سال 15-2014 میں طلباء کے اسکولوں میں داخلہ کی تعداد 6121772 تھی۔جبکہ

تعلیمی سال 2019-20 میں یہ تعداد بڑھکر 6198418 ہوئی۔یعنی 5 سال کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اسکولوں میں مرکز و ریاستی حکومت کے اشتراک سے چلائی جارہی مڈڈے میل اسکیم اور ریاستی اقدامات جیسے تعلیمی وظائف اور رہائشی اسکولوں میں مفت تعلیمی ضروریات فراہم کرنے کی وجہ سے طلباء کے داخلوں کی تعداد میں 76646 کا اضافہ ریکارڈ کیا گیا ہے۔11؎

ترک تعلیم میں کمی:

ریاست تلنگانہ میں ترک تعلیم کی شرح میں بہتری آئی ہے اس کا پتہ تعلیمی سال 2014-15 تا 2019-20 کے اعداد وشمار کے تقابل سے ملتا ہے۔تعلیمی سال 2014-15 میں پرائمری سطح پر ترک تعلیم کا فیصد 19.25 ‘ اپر پرائمری سطح پر 31.14 فیصد اور سکنڈری سطح پر 37.56 فیصد تھا جبکہ تعلیمی سال 2019-20 میں پرائمری سطح پر ترک تعلیم کا فیصد 15.76 ‘ اپر پرائمری سطح پر 29.37 فیصد اور سکنڈری سطح پر 34.65 فیصد طلباء تعلیم ترک کئے ہیں۔جو گزشتہ کے مقابلہ بہتر ہے۔قانون حق تعلیم کے نفاذ کے بعد تلنگانہ حکومت کی جانب سے کئے گئے اقدامات جیسے دوپہر کا کھانا‘ تعلیمی وظائف‘ مفت اسکول یونیفارم‘ مفت کتابوں کی فراہمی سے طلباء میں ترک تعلیم کا رجحان کم ہوا ہے۔

معلم و متعلم بہتر تناسب:

ریاست تلنگانہ میں معلم و متعلم تناسب کو بہتر کرنے کے لئے حکومت نے اساتذہ کے تقررات کئے۔ چونکہ تعلیمی سال 2014-15 میں اساتذہ کی تعداد 240133 تھی۔ جبکہ تعلیمی سال 2019-20 میں یہ تعداد بڑھکر 276888 ہوئی یعنی 36755 اساتذہ کا اضافہ کیا گیا۔قانون حق تعلیم کے مطابق معلم و متعلم کا تناسب پرائمری سطح پر 30:1 اور اپر پرائمری سطح پر 35:1 ہونا چاہیے جبکہ ریاست تلنگانہ میں یہ تناسب قومی اوسط سے بہتر ہے۔تعلیمی سال 2014-15 میں پرائمری سطح پر 28:1 ‘ اپر پرائمری سطح پر 23:1 ‘ اور سیکنڈری سطح پر 25:1 تناسب تھا۔تعلیمی سال 2019-20 میں یہ تناسب پرائمری سطح پر 22:1 اور اپر پرائمری سطح پر 19:1 اور سیکنڈی سطح پر 29:1 ہے۔یہ اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ تلنگانہ میں معلم و متعلم کا تناسب پہلے سے بہت بہتر ہوا ہے۔12؎

مڈڈے میل اسکیم:

پرائمری سطح کے طلباء وطالبات کے لئے تغذیہ بخش غذا فراہم کرنے کا قومی پروگرام کو عام طور پر مڈڈے میل اسکیم کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس اسکیم کے تحت طلباء کو دوپہر کو کم ازکم

300 کیلوریز (Calories) اور 8 تا 12 گرام پروٹین پر مبنی کھانا سال میں 200 دن فراہم کیا جارہا ہے۔13۔ اس کا حکومت ہند نے 15 اگسٹ 1995 سے آغاز کیا۔اس میں سال 2002 اور سال 2007 میں توسیع کرتے ہوئے چھٹویں جماعت سے آٹھویں جماعت تک کے طلباء کا احاطہ کیا گیا۔ ریاست تلنگانہ میں تعلیمی سال 20-2019 میں کل 1795956 طلبا میں سے 87 فیصد یعنی 1564362 طلباء مڈڈے میل اسکیم سے استفادہ حاصل کئے اس کے لئے حکومت تلنگانہ نے 194.45 کروڑ روپئے مختص کئے اور اسکا 90 فیصد مالیہ یعنی 173.95 کروڑ خرچ کیا گیا۔14۔

رہائشی اسکولس:

ریاست تلنگانہ میں کمزور و پچھڑے طبقات اور اقلیتوں کی تعلیمی صورتحال کو فروغ دینے کیلئے رہائشی اسکولوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ درج فہرست ذات کیلئے 268، درج فہرست قبائل کیلئے 179 اور اقلیتوں کیلئے 204 رہائشی مدارس قائم کئے گئے ہیں۔ان اسکولوں میں مفت رہائش، غذاء اور کتابیں مہیا کی جارہی ہیں۔ اسکا مقصد اعلیٰ و معیاری تعلیم فراہم کرنا ہے ۔تعلیمی سال 15-2014 تا 20-2019 تک SC اور ST طبقات کے رہائشی اسکولوں سے مستفید ہورہے طلباء کی تعداد 741594 ہے۔اسی طرح اقلیتی طبقات کے طلباء کیلئے رہائشی اسکولوں کا آغاز تعلیمی سال 17-2016 سے ہوا۔تب سے 20-2019 تک کل 224232 طلباء مستفید ہوئے ہیں۔ان رہائشی اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے تمام طبقات کی کل طلباء کی تعداد 965826 ہے۔ان مدارس کیلئے حکومت نے کل 7538.09 کروڑ روپئے مختص کیا ہے۔15۔

تعلیمی وظائف:

حکومت تلنگانہ اوّل تا دہم جماعت میں زیر تعلیم طلباء کو پری میٹرک اسکالرشپ سالانہ فراہم کررہی ہے۔اس کا مقصد کمزور طبقات درج فہرست ذات وقبائل اور اقلیتوں کے طلباء کو تعلیم کی جانب متوجہ کرتے ہوئے ترک تعلیم سے روکنا ہے۔اس کے لئے تعلیمی سال 15-2014 تا 20-2019 تک حکومت تلنگانہ نے 638.12 کروڑ روپئے خرچ کیا ہے۔اس کے علاوہ بیرون ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ان طبقات کے منتخبہ طلباء کو فی کس 20 لاکھ روپئے Overseas Scholarship حکومت تلنگانہ فراہم کررہی ہے ان چھ سالوں میں 243.04 کروڑ روپئے اس اسکیم کے لئے مختص کیا گیا ہے۔16۔

مناورو۔منابڑی/منابستی۔منابڑی(ہماراگاؤں/بستی۔ہمارااسکول):

سرکاری اسکولوں کا خراب ماحول ایک مسئلہ ہے جس کی وجہ سے طلباء پر مضر اثرات ہونے سے ترک تعلیم کا خدشہ لاحق ہے۔اس تناظر میں حکومت تلنگانہ نے اسکولوں کے ماحول کو عمدہ بنانے کیلئے ریاست میں ایک پروگرام ''منا ورو۔منا بڈی/منا بستی۔منا بڈی'' کے نام سے تعلیمی سال22-2021 سے شروع کیا۔ اس کا مقصد تمام (26067) سرکاری اسکولوں کے بنیادی ضروریات جیسے صاف پینے کا پانی' قابل استعمال اور علیحدہ مرد وخواتین کے لئے بیت الخلاء' بجلی' اور امتیازی سلوک سے پاک ماحول فراہم کرنا اور سرکاری اسکولوں میں جماعتوں کی مرحمت کرنا' ضروری فرنیچر' ڈیجیٹل سہولیات وغیرہ تین سال کی مدت میں پہنچانا ہے۔اسکے لئے حکومت 7289.54 کروڑ روپئے مختص کئے ہیں۔17؎

دیگر سہولیات:

مندرجہ بالا اسکیمات کے علاوہ حکومت تلنگانہ نے طلباء و اولیائے طلباء کو تعلیم کی جانب متوجہ کرنے کے لئے اور اولیائے طلباء سے مالی بوجھ کم کرنے کے لئے تعلیمی ضروری آلات جیسے کتابیں' دو جوڑے اسکول یونیفارم' ٹی' بیلٹ' آئی۔ڈی کارڈس اور اسکول بیاگس مفت فراہم کر رہی ہے۔18؎ اس سے بہت سارے والدین کو معاشی طور پر راحت ملی ہے اور سرکاری اسکولوں کے داخلوں میں اضافہ ہوا ہے۔اس کے نتیجہ میں تعلیمی سال 21-2020 میں ترک تعلیم میں بہت کمی ہوئی ہے۔ پرائمری سطح پر صرف 76.0 فیصد' اپر پرائمری سطح پر 27.2 فیصد اور سیکنڈری سطح پر 14.04 فیصد طلبا ترک تعلیم کئے ہیں۔18؎

تعلیم کو عام کرنے کے لئے ریاستی حکومت کی جانب سے کئے جانے والے ان تمام اقدامات کے نتیجہ میں ریاست میں نہ صرف شرح تعلیم میں اضافہ ہوا ہے بلکہ تعلیم کے معیار میں بھی مثبت تبدیلی دیکھی گئی ہے۔

حواشی References

1۔اکرم محمد خان' مفکرین تعلیم' ناشر: ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان' نئی دہلی صفحہ 15-16

2۔ https://en.wikipedia.org/wiki/Nelson_Mandela

3- https://byjus.com/cbse/essay-on-importance-of-education/

4۔آفاق ندیم خاں ڈاکٹر' تعلیم کی سماجی بنیادیں' ایجوکیشنل بک ہاؤس' علی گڑھ' 2018' صفحہ 227

5۔ کھلر کے کے' تعلیم کے 66 سال' ماہنامہ یوجنا' نئی دہلی' ستمبر 2013' صفحہ 31

6۔ قانون حق مفت اور لازمی تعلیم برائے اطفال 2009

7۔ ایضاً۔ 8۔ محولہ 5، صفحہ 33 9۔ محولہ 7، قانون حق تعلیم

10۔ سدھیر کمیشن رپورٹ، مسلمانوں کی معاشرتی، معاشی اور تعلیمی صورتحال کا جائزہ لینے کے لئے مقرر کردہ تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ حکومت تلنگانہ، 2016، صفحہ نمبر 19

11۔ https://samagrashiksha.telangana.gov.in (Statistical Year Book 2019-20) 17-08-2021

12۔ ایضاً

23-1-2023http://www.education.gov.in/en/mid-day-meal-12

14۔ https://pmposhan.education.gov.in/# (22-1-2023)

15۔ Annual Reports of SC's,ST's and Minorities,Government of Telangana

16۔ ایضاً

17۔ Telangana Socio Economic Outlook 2022,P-164

18۔ Annual Report 2021-2022, Ministry of Statistics and Programme Implementatin Government of India, P-69

☆☆☆

Beesveen Sadi ke nisf aakhir mein urdu khaka nigari by Shabir Ahmad Malik(research scholar,dept.of urdu KMC Language University,Lucknow)cell-7006697724

شبیر احمد ملک (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، خواجہ معین الدین چشتی لنگویج یونیورسٹی، لکھنو)

بیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو خاکہ نگاری

خاکہ غیر افسانوی ادب کی ایک مقبول ترین صنف مانی جاتی ہے۔ خاکہ انگریزی اصطلاح (Sketch Portraite) کا متبادل ہے۔ اس کے لیے دوسری اصطلاحیں مرقع، شخصی مرقع اور قلمی تصویر بھی مروّج ہیں۔ انگریزی ادب میں بھی مرقع نگاری ایک مقبول صنف مانی جاتی ہے۔ مڈلٹن مرے، لٹن اسٹریجی اور سرسٹن چرچل نامور مرقع نگار رہے ہیں۔ ادبی نقطہ نظر سے خاکہ نگاری کی شخصیت کی ہو بہو تصویر کشی کا نام ہے۔ بہ الفاظ دیگر کسی شخص کے ہمہ جہت، ظاہری اور باطنی خصائص ونقائص اس کے ہم رنگ اور تہہ دار پہلوؤں کو موثر اور دلچسپ انداز سے اس طرح پیش کیا جائے کہ حقیقی افراد کی چلتی پھرتی تصویر سامنے اجائے۔ یہی خاکہ نگاری ہے۔

اردو ادب میں خاکہ نگاری کی تاریخ زیادہ قدیم نہیں ہے، اس کی مکمل شکل بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی سے ملنی شروع ہو جاتی ہے، لیکن اس صنف کا اغاز کب اور کس صورت میں ہوا۔ اس کا تعین کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ عام طور پر سبھی حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش ہمیں قدیم تذکروں میں دیکھنے کو ملتے ہیں یا یوں کہے تذکروں میں بھی اس کے ابتدائی نقوش تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ اگرچہ قدیم تذکروں سے بجاطور پر خاکہ نگاری کی توقع کی جاسکتی تھی لیکن یہ توقع تذکروں سے پوری نہیں ہوسکتی کیوں کہ ان میں شخصیت کا حال بیان کرنے سے زیادہ اس کے کلام کا زیادہ انتخاب کرنے پر توجہ دی گئی ہے، مگر باضابطہ اس صنف کا اغاز بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریروں سے ہوتا ہے، اس حوالے سے شمیم حنفی یوں رقم طراز ہیں:

''اصطلاحی مضمون میں اردو خاکہ نگاری کا اغاز مرزا فرحت اللہ بیگ سے ہوتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی وحید الدین سلیم کی جیسی بے مثال تصویریں فرحت اللہ بیگ نے لفظوں میں اتاری ہیں۔ انھیں

اج بھی اردو خاکہ نگاری کی روایت کا روشن ترین نقش کہا جا سکتا ہے۔"

(آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ مرتب شمیم حنفی ص:16)

اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا نام سب سے پہلے اتا ہے۔ یہ پہلے ایسے خاکہ نگار تھے، جنھوں نے اردو ادب میں مکمل طور پر خاکہ نگاری کا اغاز کیا۔ ان کا خاکہ "نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی" ان کے اپنے استاد کی یاد میں لکھا گیا بہترین خاکہ ہے، جو 1927 میں منظر عام پر ایا۔ اس کے علاوہ انھوں نے صنف خاکہ نگاری میں کئی تخلیقات پیش کیے ہیں۔ جن میں "ایک وصیت کی تعمیل میں" اور "دہلی کا یادگار مشاعرہ" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد اس صنف کو بام عروج پر پہنچانے میں مولوی عبدالحق کا نام اتا ہے۔ انھوں نے "چند ہم عصر" لکھ کر خاکہ نگاری میں وسعت گہرائی پیدا کر دی۔ انھوں نے "نام دیو مالی" اور "نور خان" جیسے خاکے لکھ کر خاکہ نگاری میں ایک منفرد مقام حاصل کر لیا۔ اس کے بعد خاکہ نگاری کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ بعد میں رشید احمد صدیقی، اغا حیدر حسن، خواجہ غلام حسن نظامی، خواجہ غلام الیدین، شوکت احمد تھانوی اور بشیر احمد ہاشمی وغیرہ جیسی شخصیات نے اس صنف کے لیے اپنا لہو تن پیش کیا اور اس کو ترقی سے ہمکنار بھی کیا۔

بیسویں صدی کے نصف اخر میں اردو ادب میں خاص کر اردو خاکہ نگاری میں ایک نیا موڑ پیش ایا ہے اور اس دور میں اردو ادب میں کئی تحریکات اور رجحانات پہلے سے ہی ظہور پذیر ہو گئے تھے۔ ان ہی میں سے ایک تحریک ترقی پسند تحریک تھی۔ اس نے اردو ادب کو ایک نیا رخ عطا کیا۔ خاکہ نگاری میں اس رجحان کی نمائندگی "نئے ادب کا معمار" کے سلسلے میں پیش کیے گئے خاکوں سے ہوتی ہے، جس کی شروعات 1948 میں ہوئی۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ خاکہ نگاروں میں فکر تونسوی کا نام قابل ذکر ہے۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ "خدو خال" 1950 میں شائع ہوا۔ اس میں کل ?۱۴ خاکے شامل ہیں اس کے بعد سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی بھی ترقی پسندی نے اثر انداز ہوتے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے ادب کا نعرہ بننے نہیں دیا۔ اور ساتھ ہی یہ مغربی رجحانات سے بھی باخبر تھے اس لیے ان کے یہاں ترقی پسندی ہوتے ہوئے بھی ایک نیا رنگ اور ڈھنگ نظر اتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر یوں رقم طراز ہیں:

"ترقی پسند تحریک نے خاکہ نگاری یا رپوتاژ ایجاد تو نہ کیے۔ لیکن ان میں قابل قدر تحریروں سے انھیں وقیع ضرور کیا۔ خصوصیات سے خاکہ نگاری کا تو انداز بدل کر رکھ دیا گیا اور پہلی مرتبہ شخصیت کی انسانی

خوبیوں اور خامیوں کو فن کارانہ بصیرت سے اجاگر کیا گیا۔ ورنہ اب تک تو شخصیت نگاری قصیدہ در مدح قسم کی چیز تھی، چنانچہ عصمت کا دوزخی ''منٹو کے گنجے فرشتے'' اس سلسلے میں نمایاں ہیں۔''

(اردو ادب کی مختصر تاریخ، ڈاکٹر سلیم اختر، ص:130)

اس سلسلے میں سعادت حسن منٹو کا نام سرفہرست ہیں۔ افسانہ نگاری کے علاوہ انھوں نے خاکہ نگاری میں بھی تمام مروّجہ اصولوں سے الگ ہوکر اپنی ایک نئی راہ نکالی۔ ان کے خاکوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں گنجے فرشتے 1952 لاوڈ اسپیکر 1955 اور فلمی شخصیتیں 1956 خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے زندہ شخصیت کو مرکزی کردار بنا کر ایک نئے ڈھنگ سے روشناس لیا۔ جن شخصیات پر انھوں نے قلم اٹھایا۔ اس کے معایب ومحاسن کو پوری ایمان داری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اپنی کتاب ''گنجے فرشتے'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''میں ایسی دنیا پر ایسے مہذب سماج پر ہزار لعنت بھیجتا ہوں، جہاں یہ اصول مروّج ہو کہ مرنے کے بعد ہر شخص کا کردار اور شخص لانڈری میں بھیج دیا جائے، جہاں سے وہ دھل دھلا کرائے اور رحم اللہ کی کھونٹی پر لٹکا دیا جائے۔'' (گنجے فرشتے: سعادت حسن منٹو، ص:348)

عصمت چغتائی بھی اس دور کے اہم خاکہ نگار تسلیم کی جاتی ہے، انھوں نے پر خاکے میں شخصیتوں کے ایک نئے پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے ''مجاز'' اور ''دوزخی'' خاکہ لکھ کر خاکہ نگاری میں اہم رول ادا کیا۔ اشرف صبوحی بھی اس دور کے اہم خاکہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں خاکہ نگاری میں انھوں نے اردو ادب کو اسلوب بیان کی سطح پر ایک نئی سمت عطا کی۔ خاکوں پر مشتمل ان کے تین مجموعے ''غبار واں''، ''جھروکے''، اور ''دلی کی چند عجیب ہستیاں'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ''دلی کی چند عجیب ہستیاں'' کی وجہ سے اشرف صبوحی کی شہرت اج بھی قائم ہیں۔ اس کتاب میں کل ?۶۱ خاکے شامل ہیں، جس میں میر انیس گھمی کبابی، مٹھو بٹھیارا، مرزا چپاتی وغیرہ خاص طور پر شامل ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے دہلی کے چند اہم کرداروں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔

خاکہ نگاری کی اس اہم کڑی میں ڈاکٹر اعجاز جن کا نام بھی قابل ستائش ہے۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ 1954 میں ''ملک ادب کے شہزادے'' کے عنوان سے منظر عام پر ایا۔ اس میں 44 شعراء پر خاکے ہیں۔ یہ خاکے اتنے مختصر ہیں کہ کوئی بھی خاکہ دو یا تین صفحہ سے زیادہ نہیں ہے۔ محمد طفیل نے بھی خاکہ نگاری کے فن کو ایک نئی بلندی عطا کی۔ اردو ادب میں ان کے سات مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جو بالترتیب ''صاحب''، ''جناب''، ''اپ''، ''محترم''، ''مکرم''، ''معظم''

اور ’’مجبی‘‘ ہیں۔ ان کے خاکوں کی تعداد 58 ہیں۔ انھوں نے لاہور سے ’’نقوش‘‘ کا شخصیات نمبر 1956 میں شائع کیا۔ اس نمبر میں 82 بلند پایہ ادیبوں اور شاعروں کے خاکے ان کے قریبی احباب سے لکھوا کر حاصل کیے گئے ہیں۔ اس دور میں عبدالمجید سالک کے خاکوں کا مجموعہ ’’یاران کہن‘‘ کے نام سے 1955 میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں بیس شخصیات کے خاکے شامل ہیں۔ جن میں علامہ اقبال، ابوالکلام ازاد، محمد علی جوہر وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شاہد احمد دہلوی کا شمار بھی جدید خاکہ نگاروں میں کہا جاتا ہے۔ انشا پرداز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جدید خاکہ نگاری کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ ان کے خاکوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں گنجینۂ گوہر ’’1962 اور ’’چند ادبی شخصیتیں‘‘ 1962 شامل ہیں۔ اس دور کے ایک اور اہم خاکہ نگار ’’علی جواد زیدی‘‘ کے روپ میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کے خاکوں کا پہلا مجموعہ ’’اپ سے ملئے‘‘ کے عنوان سے 1968 میں منظر عام پر ایا۔ انھوں نے خاکہ نگاری میں اپنا یہ مسلک بنایا ہے کہ انھوں نے بعض دوسرے خاکہ نگاروں کی طرح شخصیتوں کے بارے میں محض اپنے تاثرات قلم بند کرنے پر بلا اکتفا نہیں کیا ہے۔ انھوں نے ہر شخصیت کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ ان کا دوسرا مجموعہ ’’ہم قبیلہ‘‘ میں شائع ہوا۔

مجتبیٰ حسین بھی جدید اردو خاکہ نگاری کے روح رواں تسلیم کیے جاتے ہیں وہ طنز و مزاح کے بے پناہ بادشاہ ہے۔ ان کے یہاں فکر و تخیل کا ایک الگ رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔ انھوں نے اپنا پہلا خاکہ حکیم یوسف خان پر لکھا۔ جس سے مجتبیٰ حسین کو بہت شہرت ملی۔ اس کے علاوہ ان کے خاکوں کے کئی مجموعے منظر عام پر ائے۔ جن میں ادمی نامہ 1981 ’’سو ہے وہ بھی ادمی‘‘، ’’چہرہ در چہرہ‘‘، ’’ہوئے ہم دوست جن کے‘‘ اور ’’اپ کی تعریف‘‘ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یوسف ناظم کے نام بھی جدید خاکہ نگاروں کی فہرست میں اتا ہے۔ ان کے خاکوں کے تین مجموعے منظر عام پر ا چکے ہیں، جن میں ’’ذکر خیر‘‘، ’’علیک سلیک‘‘ اور ’’سائے ہم سائے‘‘ وغیرہ شامل ہیں۔

اس کے علاوہ بیسویں صدی کے نصف اخر میں جن جن خاکہ نگاروں نے اس صنف کو اگے لے جانے میں اپنا کلیدی رول ادا کیا ہے۔ ان میں خاص طور پر انوار ظہیر خان، الطاف تربتی، رئیس احمد جعفری، عبدالاحد خان، ممتاز مفتی چراغ حسن حسرت، ضیاء الدین مرتی اور معین الدین جذبی وغیرہ شامل ہیں۔

☆☆☆

Mohsin Khan:Sawanehi Kawaef aur Tasaneef by Aqsa Abbas
(Multan,Pakistan)cell-0092-302-731-2305
اقصیٰ عباس(ملتان، پاکستان)

محسن خان: سوانحی کوائف اور تصانیف

محسن خان کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ محسن ایک پختہ قلم کار کی حیثیت سے اردو فکشن لکھتے ارہے ہیں۔ وہ بلند پایہ افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ انہوں نے بچوں کے لیے بہت کچھ لکھا۔ محسن خان ہندوستان کے صوبہ اتر پردیش کے ضلع لکھنو کی مشہور تحصیل ملیح اباد کے محلہ کنول ہار میں ۹ جولائی 1962 میں پیدا ہوئے۔ اپ کے والد کا نام عمر حیات خان اور دادا کا نام محمد حیات خان تھا۔ محسن خان کے والد کی دو شادیاں ہوئیں اور محسن خان اپنی بہنوں سے بڑے اور بھائیوں سے چھوٹے ہیں۔ ان کا بچپن مذہبی ماحول میں گزرا۔

محسن خان نے مذہبی تعلیم محلہ کنول ہار کے مدرسے میں حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم محلہ چودھرانہ کے اسلامیہ اسکول میں حاصل کی۔ میٹرک مہاتما گاندھی ہائر سیکنڈری اسکول سے کیا۔ انٹرمیڈیت کاکوری انٹر کالج سے کیا اور ایم اے کی تعلیم لکھنو یونیورسٹی سے حاصل کی اور اب اردو اکیڈمی سے منسلک ہیں۔ اکادمی اف ماس کمیونیکشن میں اپنا کام سرانجام دے رہے ہیں۔ یہ ان کا اپنا انسٹی ٹیوٹ ہے۔ اس کے علاوہ اردو اکادمی سے بھی منسلک ہیں۔ دسویں کلاس کی تعلیم کے دوران ہی انہوں نے کہانیاں لکھنے کی ابتداء کی۔ ایم۔ اے کے بعد کہانیاں لکھنا چھوڑ دیا اور بچوں کے لیے کہانیاں لکھنا شروع کیا۔ ہندوستان کے بعض رسائل اور ڈائجسٹوں میں ادب عالیہ سے متعلق اور بچوں کی کہانیاں شائع ہوئیں۔

محسن خان کے بچوں سے متعلق ڈراموں اور کہانیوں کے نمایاں پہلو یہ ہیں کہ ان میں اخلاقی اور سبق اموز باتوں کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے بیشتر کہانیوں کے مرکزی کردار جانور ہیں اور ان جانوروں کے طرز عمل اور انسانوں کے طرز عمل کا موازنہ کرکے محسن خان انسانوں کے غیر اخلاقی پہلوؤں اور جانوروں کے اخلاقی پہلوؤں کو پیش کرکے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ جانور قدرتی نظام کے طابع رہ کر اپنے فطری اور اخلاقی دائرے میں زندگی گزار رہے ہیں۔ جبکہ انسانوں نے اخلاقی

حدود سے تجاوز کر کے وہ روش اختیار کر لی ہے جسے جانوروں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ڈراموں کی زبان صاف ستھری رواں دواں اور دلچسپ ہے۔ بعض کہانیوں اور ڈراموں میں لطیف طنز کے ساتھ ساتھ مزاح بھی ہے۔ محسن خان نے بچوں کی کہانیوں اور ڈراموں میں جانوروں کی خصوصیات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان جانوروں کے وسیلے سے اخلاق اور سبق اموز باتیں بیان کی ہیں جیسے:

''منسارام کا گدھا''(1987) میں شائع ہوئی۔ اس میں انہوں نے گدھے کی مظلومیت اور بے بسی کے ساتھ ساتھ جانوروں کے تعلق سے انسان کی بے بسی اور سفا کی کی ترجمانی کی ہے۔

''چینو خان''(1990) میں شائع ہوئی۔ چینو خان ایک ایسے انسان کی کہانی ہے جو اول جلول حرکتوں کے سبب بچوں کی دلچسپی کا محور بن جاتا ہے۔

''دوستی کا جشن''(1986) میں شائع ہوئی۔ اس میں یگانگت، محبت اور میل ملاپ کے ساتھ یہ نکتہ پوشیدہ ہے اگر حکمت میل میلاپ اور اتفاق کے ساتھ کام کیا جائے تو انسان سرخروئی اور سکون سے زندگی گزار سکتا ہے۔

''چھوٹا منہ بڑی بتیسی''(2020) میں شائع ہوئی۔ اس میں گیدڑ کی بپتا بیان کی گئی ہے جو اپنی نادانی اور ناعاقبت اندیشی کے سبب خوشگوار زندگی کو اجیرن بنا لیتا ہے۔ اس ڈرامے میں یہ نصیحت اموز نکتہ پوشیدہ ہے کہ انسان کو اپنی اوقات کے دائرے میں رہ کر زندگی گزارنا چاہیے جو لوگ دوسروں کی نقالی کرتے ہیں وہ دوسروں کی نظر میں حقیر سمجھے جاتے ہیں اور اپنی ذات کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں۔

''انصاف''(2018) میں شائع ہوا۔ اس میں انصاف کے وسیلے سے یہ پیغام دیا گیا ہے کہ راہِ راست پر چلنے اور سچ بولنے والے شرمندگی اور ہزیمت اٹھاتے ہیں۔

''طوطا کہانی''(2018) میں شائع ہوا۔ کہانی ''طوطا کہانی'' کے ذریعے انسان کی پرندوں سے وابستگی اور دو غیر مذہب کے لوگوں کی یگانگت اور محبت کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔

''کڑک مرغی انڈے دینے لگی''(2020) میں شائع ہوا۔ اس میں پیغام پوشیدہ ہے کہ کسی افادیت کے بغیر وجود دوسروں کے لیے بے معنی ہو جاتا ہے۔

''بندر کیا سوچتا ہوگا''(2020) میں شائع ہوا۔ اس میں بندروں کے طرزِ عمل اور ان کے اعمال و افعال کے ذریعے انسان کے اعمال و افعال کا موازنہ کر کے یہ پیغام دیا گیا ہے کہ انسانوں کے اخلاقی زوال پر جانوروں کو تعجب اور افسوس ہو رہا ہے۔

اس کے علاوہ محسن خان ایک عمدہ افسانہ نگار بھی ہیں۔

افسانہ نگار ایک سیاح کی مانند ہوتا ہے جس کو کسی بھی ملک کی سب سے انوکھی باتوں کا علم ہوتا ہے اور ایسی انوکھی چیزیں جو سب کی نظروں سے اوجھل رہتی ہیں لیکن افسانہ نگار اپنے افسانوں کے ذریعے مختصر جملوں میں ان کا اظہار کرتا ہے اور محسن خان ایسے ہی افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں۔

1993 میں ان کا افسانوی مجموعہ ''خواب کہانی'' شائع ہوا۔ محسن خان کے یہاں زندگی کا ہر رنگ ملتا ہے۔ ان کے یہاں کہانی پن کی شدت بہت ہے اور زبان کی تخلیقی استعمال پر پوری قدرت رکھتے ہیں اور اس کا اظہار ان کے افسانوں میں بخوبی ہوا ہے۔ ان کے بیشتر افسانے عورتوں کے مسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ ان کے مسائل کے متعلق سوال اٹھاتے ہیں لیکن ان کا دل قاری پر چھوڑ دیتے ہیں۔ عورتوں کے مسائل کو ترقی پسند افسانوں کے ذریعہ بھی اٹھایا گیا تھا لیکن وہاں صرف جنس کے پہلو پر زور دیا تھا کہ عورت بازار کی طوائف کیسے بنی لیکن محسن خان نے صرف عورت کی خانگی زندگی کو موضوع بنایا ہے کہ مرد کی زندگی اور عورت کی زندگی میں کیا فرق ہے یعنی عورت کے بھی اپنے جذبات ہوتے ہیں اگر وہ سارا دن اپ کی اور سسرال کی خدمت کرتی ہے تو اس کے بدلے میں صرف محبت چاہتی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عورتوں کے احساسات وجذبات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اگر مرد انسان ہے تو عورت بھی انسان ہے اور انسان کا خیال رکھنا ان کی ضرورتوں کو سمجھنا یہ ہمارا فریضہ ہے۔

اس کے علاوہ ان کا ایک شاہکار افسانہ ''زہرا'' بہت مقبول ہوا۔ یہ افسانہ اس قدر پسند کیا گیا کہ عمر میمن نے افسانے سے متاثر ہو کر انگریزی میں اس کا ترجمہ کیا اور یہ تراجم ''South Aisia Studies'' میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ محسن خان نے ڈرامے کیے اور ان کے ڈرامے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر پیش کیے جا چکے ہیں ار انہیں 1992 میں ال انڈیا ریڈیو کے ڈرامہ تحریری مقابلے میں اول انعام دیا گیا۔

محسن خان نے اپنی اب تک کی زندگی میں بچوں کے لیے کہانیاں، افسانے، ڈرامے اور اسٹیج ڈرامے لکھے اور ان میں مقبولیت حاصل کی لیکن ان کا شاہکار کارنامہ ان کا ناول ''اللہ میاں کا کارخانہ'' ہے۔ یہ ان کا پہلا ناول ہے اور یہ ناول اس قدر مقبول ہوا کہ ہندوستان اور پاکستان میں شائع ہوا اور اس کے علاوہ ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں اس کے تراجم بھی ہو رہے ہیں۔

محسن خان ایک اچھے مصنف ہونے کے ساتھ ایک اچھے انسان بھی ہیں۔ محسن خان کی

شادی ان کے ماموں کی بیٹی ''مسرت خان'' سے ۲۴ اگست 1983 میں ہوئی۔ان کی اہلیہ پاکستان سے ہیں۔ان کے دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔بڑی لندن میں مقیم ہے اور دوسری بنگلور میں۔اس کے علاوہ محسن خان کا بیٹا بھی انگریزی میں مضامین لکھ رہا ہے۔

تصانیف: ڈرامے اور کہانیاں

1۔دوستی کا جشن 1986 2۔منسا رام کا گدھا 1987 3۔چینو خان 1990

4۔طوطا کہانی 2018 5۔انصاف 2018 5۔ساجھے کا گھونسلہ 2020

6۔جامن والے بابا 2020 7۔کڑک مرغی انڈے دینے لگی 2020

8۔بندر کیا سوچتا ہوگا 2020 9۔کتا بھونکتا کیوں ہے 2020 10۔چھوٹا منہ بڑی بتیسی 2020

افسانوی مجموعہ: خواب کہانی 1993

ناول: اللہ میاں کا کارخانہ 2020

اعزازات

۱۔ ڈرامہ ''کیسی کیسی مجبوریاں'' کے لیے ال انڈیا ریڈیو کی جانب سے 1992 میں نیشنل ایوارڈ دیا گیا۔

۲۔ڈرامہ ''خواب کی تعبیر'' کے لیے ال انڈیا ریڈیو کی جانب سے 1994 میں نیشنل ایوارڈ دیا گیا۔

۳۔ بچوں کی کتاب ''انڈا کیسے پھوٹا'' 1994 کے لیے اتر پردیش اردو اکادمی کی جانب سے انعام دیا گیا۔

۴۔ اتر پردیش اردو اکادمی کی جانب سے 2011 میں ادبِ اطفال کے لیے مجموعی ادبی خدمات کا انعام دیا گیا۔

۵۔اتر پردیش جرنلسٹ ایسوسی ایشن کی جانب سے 2013 میں ''شانِ اودھ ایوارڈ'' دیا گیا۔

۶۔ سلام لکھنو کی جانب سے ''مصنفین اودھ'' ایوارڈ 2012 میں دیا گیا۔

☆☆☆

Shabbir Misbahi ke afsanchon ka majmua"Idrak": ek jaeza by
Mukhtar Ahmad Zahid(Research Scholar,Dept.of Urdu Khwaja
Moinuddin chishti Language University,Lucknow)
مختار احمد زاہد(ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ)

شبیر مصباحی کے افسانچوں کا مجموعہ" ادراک" ایک جائزہ

افسانچہ ادبی دنیا میں مِنی افسانے کے نام سے بھی معروف ہو رہا ہے۔ انسانی زندگی کے مختلف تجربات فکشن نگار اپنے قلم کے ذریعے نثر کی صورت میں بالکل کم سے کم لفظوں میں بیان کرے وہ افسانچہ کہلاتا ہے۔ شاعری میں مختصر نظم اور نثر میں افسانچہ ایک ہی نوع کی چیزیں ہیں۔ اردو ادب میں افسانچے کا آغاز سعادت حسن منٹو نے کیا۔ 1948ء میں ''سیاہ حاشیے'' کی شکل میں ان کے افسانچے منظر عام پر آئے۔ اس کے بعد 1962ء میں جوگندر پال کے افسانچوں کی کتاب ''میں کیوں سوچوں'' منظر عام پر آئی جس میں کل 35 افسانچے شامل تھے۔ اس طرح اردو ادب میں یہ صنف اب آہستہ آہستہ اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو رہی ہے۔

لداخ میں اردو ادب کی تاریخ میں شبیر مصباحی کی کتاب ''ادراک'' کے ذریعے اس صنف کا باقاعدہ آغاز ہوا ہے۔ شبیر مصباحی سوشل میڈیا میں ابنِ رشید کے نام سے بھی معروف ہیں۔ آپ اپنے مضامین اور افسانچوں کے ذریعے فیس بک اور وٹس ایپ میں بھی کافی مقبول ہیں۔ آپ کا تعلق ضلع کرگل کے سب ڈویژن دراس سے ہے۔ دراس میں ہی 1986ء میں آپ کی ولادت ہوئی۔ پرائمری تک کی تعلیم دراس میں ہی حاصل کرنے بعد آپ نے اعظم گڑھ یو۔ پی کا رخ کیا جہاں سے آپ کئی برس مروجہ تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے۔ آپ ایک اعلیٰ پائے کے ادیب ہونے کے علاوہ ایک سماج سیوک، صحافی اور کالم نویس بھی ہیں۔ آپ وقتاً فوقتاً اپنے علاقے میں کانفرنس، سیمینار اور مشاعرے منعقد کرتے رہتے ہیں۔ چند سال پہلے مصباحی نے اپنے چند احباب کے تعاون سے دراس کرگل میں ایک کُل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا تھا جس میں لداخ کے علاوہ ملک کے مختلف شہروں سے کئی شعراء نے شرکت کی۔ اسی طرح آپ دراس میں ہی ''درہ زوجیلہ اور ہمارے مسائل'' کے عنوان سے ایک کامیاب سیمینار بھی منعقد کر چکے ہیں۔

شبیر مصباحی صاحب دینی علوم سے بھی فیضیاب ہوئے ہیں ۔آپ ریاست اتر پردیش کے مختلف مدرسوں سے دینی علوم کے ساتھ ساتھ مروجہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اپنے آبائی وطن دراس کرگل لوٹے اور محکمہ تعلیم میں مدرسی کا کام شروع کیا۔ دراس لوٹنے کے بعد آپ نے چند رفقاء کے ساتھ مل کر علاقہ دراس میں ایک ادبی جریدہ ''علم نما'' کی بنیاد رکھی۔ جو آج کل ادارہ علم نما کے نام سے معروف ہے۔آپ کی ایک کتاب ''تعلیمی نفسیات اور بیداری'' بھی منظر عام پر آچکی ہے۔جس کی تعلیمی اور ادبی حلقوں میں کافی پزیرائی بھی ہوئی ہے۔شبیر مصباحی لداخ کی نئی نسل میں نمائندہ لکھنے والوں میں شمار کئے جاتے ہیں ۔ان کی تحریریں ملک کے کئی جریدوں اور اخباروں میں شایع ہوتی رہتی ہیں۔'ادراک' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جس میں 33 ملے جلے افسانے وافسانچے شامل ہیں۔'ادراک' کا پیش لفظ جموں وکشمیر کے معروف افسانہ نگار دیپک بدکی نے تحریر کیا ہے۔کتاب کے پیش لفظ میں دیپک بُدکی،شبیر مصباحی کی افسانہ نگاری کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''مصباحی شبیر کے اکثر و بیشتر افسانچے موضوعی ہوتے ہیں کہ افسانچہ نگار کا فوکس اپنے موضوع پر ہمیشہ رہتا ہے اور کردار ضمنی رول ادا کرتا ہے ۔سماجی مسائل ،معاشرے میں پنپ رہی بدعنوانیاں ، اقدار کی شکست و ریخت اور انسانی لاچاری ان کے افسانچوں میں جا بجا ملتے ہیں ۔مصباحی کے افسانچوں مقصدیت خاص طور پر جھلکتی ہے کہ وہ بلا شبہ'ادب برائے زندگی' کے قائل ہیں۔مولوی اور استاد تو ہیں ہی اس لیے ان کے یہاں تبلیغی عنصر بھی قدرتی امر ہے۔وہ اپنے افسانچوں میں واضح طور پر پیغام دینے کے عادی ہیں۔ان کا افسانہ'پروفیسر دوست' گوجری زبان میں اور'خوف' ہندی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے''۔(1)

لداخ کے معروف ادیب وشاعر محمد شفیع ساگر''ادراک'' کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''افسانے کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ افسانہ مختصر ہو اور انسان کے ذہن میں دیر تک ایک تاثر قائم رکھ سکے۔مصباحی صاحب کے افسانے مختصر بھی ہیں اور دیر تک انسان کے ذہن میں ایک تاثر چھوڑ دیتے ہیں۔ساتھ ہی ساتھ قاری کو باندھے رکھتے ہیں۔یعنی افسانے کو ادھورا چھوڑ دینے کا جی نہیں کرتا جب تک پورا افسانہ ختم نہ ہو''(2)

افسانچہ لکھنا بظاہر جتنا آسان لگتا ہے اتنا آسان نہیں ہے۔کامیاب افسانچہ نگاری کے لئے چابکدستی اور تخلیقی صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔افسانچہ فقط کئی سطور پر مبنی ہوتا ہے مگر وہ چند سطور قاری کو سوچنے پر مجبور کرا سکتی ہیں۔کتاب'ادراک' کا آغاز افسانچہ''دلہن'' سے ہوتا ہے۔جس میں

لاکھوں لڑکیوں کی طرح صوفیہ بھی اپنی شادی کے لئے بے بس نظر آتی ہے۔صوفیہ کی پریشانی اور نفسیات کو افسانچہ نگار نے بہترین انداز سے پیش کیا ہے۔اقتباس دیکھیے:

''یہ سب جھوٹ ہے، یہ حسن، یہ اخلاق کی باتیں، یہ ایسا ہے یہ ویسا ہے یہ سب جھوٹ ہے نازنین اور کلثوم کی تو سب برائی کرتے تھے۔ پھران کے گھروں میں تو رشتوں کی لائن لگی رہتی ہے اور یہ نازنین بھی تو دلہن بن گئی ہے اور ریاض منشی کا لڑکا امتیاز اتنی دھوم دھام سے بارات لے کر آیا ہے سب جانتا تھا کہ نازنین کا چکر نوشاد بک سیلر سے چلتا تھا پھر مجھ میں کونسی خامی ہے جو اتنی عمر ہونے کے باوجود کوئی بھٹکے سے بھی میرے گھر رشتہ لیکر نہیں آیا''۔ (3)

شبیر مصباحی کے زیادہ تر افسانچے سماجی مسائل کی عکاسی کرتے ہیں،ان کے کئی افسانچوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سماج کی اصلاح چاہتے ہیں۔افسانچہ ''شہر کے پارک'' میں نوجوان لڑکے لڑکیوں کی بے حیائی کو افسانہ نگار نے نشانہ بنایا ہے۔اقتباس دیکھیے:

''نہیں اب مجھے کسی پارک میں نہیں جانا۔'' ان کا یہ جواب سن کر میں تھوڑا چونک گیا۔۔۔لیکن میں نے پھر سوال کیا: ''کل تک تو آپ بڑی بضد تھیں اب کیا ہو گیا؟'' ''نہیں اب مجھے سمجھ میں آ گیا کہ پارکوں میں جانے سے آپ کی طبیعت خراب کیوں ہو جاتی ہے۔لیکن ریحان ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ اتنے جوان لڑکے لڑکیاں سرِ عام یہ سب کرتے ہیں اور کوئی کچھ بھی نہیں بولتا ہے، اور ان خود کو تھوڑی سی شرم بھی نہیں آتی۔''

یہی تو میں بھی سمجھ نہیں سکا۔۔اور تو اور ایسے واقعات میں روز بروز اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ شہری پارکوں میں سر عام بے حیائی اور حکومت خاموش رہتی ہے، کیا ان پارکوں میں شریف لوگوں کا حق نہیں ہے؟ بات ایسی ہے صوفیہ اس سے ان کے کاروبار میں اضافہ ہوتا ہے اس لیے کوئی کچھ نہیں کرتا ہے۔۔۔۔''(4)

افسانچہ'' پروفیسر ماں'' میں نوجوان لڑکیوں کو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نہ بھیجنے اور گھروں پر ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کرانے پر ایک پروفیسر ماں کی مجبوری کو دکھایا گیا ہے۔افسانچہ ''حقوق نسواں'' کا کلائمکس بڑا زوردار ہے۔افسانہ نگار نے جس طرح کلائمکس میں افسانے کے مرکزی کردار 'یاور نسیم' کو ایک بے بس اور بے سہارا مرد ٹھہرایا ہے اور اپنی آدھی عمر حقوق نسواں کے لئے آواز اٹھانے والا یہ شخص کلائمکس میں معلوم ہوتا ہے کہ خود اپنے خانگی فسادات اور اپنی شریک حیات کے ظلم و جبر کا شکار ہے۔اس افسانے کا ایک مکالمہ آج کے سماج کی ایک بڑی حقیقت کو اجاگر کرتا ہے۔یاور نسیم

کا مکالمہ دیکھئے:

’’ایسا نہیں ہے کہ فقط عورتیں ہی ظالم مردوں کے مظالم کی شکار ہوتی ہیں بلکہ بہت سارے مظلوم مرد بھی خواتین کے ظلم کے شکار ہوتے ہیں گھر کی چار دیواری میں صرف عورتیں ہی گھُٹ گھُٹ کر نہیں جیتی ہیں بلکہ بہت سارے مرد بھی اس گھر کی چہار دیواری کے اندر نہ صرف گھٹ گھٹ کر جیتے ہیں بلکہ خون کے آنسوں روتے ہیں۔اور اس کی سب سے بڑی مثال میں خود ہوں‘‘۔(5)

نوجوان لڑکے لڑکیوں کا گھر سے بھاگ کر شادی کرنا آج کے معاشرے میں عام بات ہوگئی ہے۔ افسانچہ ’’بھگاؤ شادی‘‘ کا پس منظر اسی کہانی کے ارد گرد چلتا ہے۔ اراض اور شبنم ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔اراض شبنم کے گھر کئی بار رشتہ بھی بھیجتا ہے مگر شبنم کے گھر والے اس رشتے سے راضی نہیں ہوتے۔مجبور ہو کر اراض شبنم کو بھاگنے کے لیے کہتا ہے مگر شبنم تیار نہیں ہوتی۔شبنم کے گھر پر خاندان کے چند بزرگ لوگ بھگاؤ شادی پر بحث کرتے ہیں۔شبنم چوری سے ان کی گفتگو سنتی ہے۔ گفتگو کے دوران زیادہ تر بھگاؤ شادی کے حق پر بات ہوتی ہے۔

’’خاندان کا ایک بزرگ کہتا ہے اور ٹھیک ہے بھگا کر شادی کرنا،خواہ مخواہ کی فضول خرچی سے نجات تو ملتی ہے۔ بیچ میں بات کاٹتے ہوئے ایک کہتا ہے ہاں اس مہنگائی بھرے زمانے میں تو سونے میں سہاگہ ہے۔کم از کم دو تین لاکھ تو بچ جاتے ہیں۔اتنے میں ایک تھوڑا نادان شخص بول اٹھا کہ ارے کیا بچتا ہے ادھر سے دینا پڑتا ہے اور لڑکی بھاگنے کا الگ۔اس طرح بیٹھک میں دو نظریات کی حامل گفتگو چلتی رہی تھی،اس بیچ میں سب سے بزرگ ایک چاچا فائنل انداز میں کہتا ہے۔’’کیا بچتا ہے کیا نہیں بچتا ہے ہم بتاتے ہیں۔دیکھو نارمل شادی میں بھی ہمیں چار سے پانچ لاکھ تک کا خرچہ آجاتا ہے اور بھگا کر کی جانے والی شادیوں میں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ لاکھ تک ہی خرچہ ہوتا ہے‘‘۔(6)

شبنم کو ان بزرگوں کی باتوں سے حوصلہ ملتا ہے اور وہ فون کر کے اراض سے بھاگنے پر رضامندی کا اظہار کرتی ہے۔ پانچ روز بعد اراض اور شبنم گھر سے بھاگ جاتے ہیں۔سماج میں عصمت دری جیسی بدفعلی کے ڈر سے بیٹیوں کو گھر پر ہی پڑھانے اور باہر نہ بھیجنے کی تلقین کرتے ہوئے افسانہ نگار افسانہ ’’خوف‘‘ میں ایک دادی کی نصیحت آمیز باتیں قارئین تک پہونچاتا ہے۔ افسانہ ’’ادراک‘‘ میں افسانہ نگار نے لکھاریوں کی نفسیات اور ان کے جزبات کی بہترین تصویر پیش کی ہے۔ حالانکہ یہ جانتے ہوئے کہ ایک ادیب اور شاعر کی ادبی زندگی میں اس کی اہلیہ کی شرکت ضروری نہیں رہتی۔مگر کبھی حالات ایسے بھی آجاتے ہیں کہ اپنی شریک حیات کی شرکت بھی ایک ادیب یا شاعر کے

لئے ضروری ہوجاتی ہے۔ چند شعراء تو اکثر اپنے تازہ کلام میں سے چند اشعار پہلے اپنی بیوی کو سناتے ہیں پھر یار دوستوں کو۔ افسانہ ادراک کا مرکزی کردار اسی غلط فہمی کا شکار ہے۔ اسے اپنی اہلیہ سے شکایت رہتی ہے کہ وہ اپنے شوہر کی ادبی زندگی سے ناواقف ہیں۔ مگر کلائمکس میں یہ غلط فہمی دور ہوجاتی ہے اور ایک ایسے موڑ پر افسانہ ختم ہوجاتا ہے جہاں کرداروں کے ساتھ ساتھ قاری بھی جزبات میں ڈوب جاتا ہے۔ افسانچہ ادراک کا یہ مکالمہ دیکھئے جو بیوی اپنے ادیب شوہر کو سنا رہی ہے۔

''تم رائٹر لوگ واقعی پاگل ہوتے ہیں، میں آپ سے اتنی محبت کرتی ہوں آپ سوچ بھی نہیں سکتے شادی سے پہلے میں آپ کی تحریریں پڑھ پڑھ کر آپ سے محبت کرنے لگی تھی۔ اور شادی کے بعد بھی آپ کی تحریروں سے محبت کرتی ہوں اور آپ کی ساری تحریریں میں اخباروں سے کاٹ کاٹ کر احتیاط سے رکھتی ہوں جو میرے بکسے میں آج بھی ہونگی اور آپ جو کہتے ہیں میری کتابیں مارکیٹ میں ہاتھوں ہاتھ بِک جاتی ہیں، وہ میں ہی ہوں جو آدھی سے زیادہ آپ کی کتابیں خرید خرید کر کالج کے بچوں میں تقسیم کرتی ہوں۔'' (7)

فیس بک میں جعلی اکاونٹ بنا کر لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے سے رشتہ جوڑتے ہیں۔ جبکہ کہیں نہ کہیں ان جعلی ناموں کا نتیجہ نقصاندہ بھی ہوتا ہے۔ افسانچہ ''فیس بکی رشتہ'' میں مصباحی نے ایک ایسے ہی جعلی اکاونٹ کو موضوع بنایا ہے۔ ایک لڑکا کسی جعلی نام سے ایک لڑکی کے ساتھ فیس بک میں رشتہ جوڑتا ہے۔ ان دونوں کا زیادہ تر وقت فیس بُک چیٹنگ میں گزرتا ہے۔ ان کا رشتہ اتنا پختہ ہوجاتا ہے کہ حالات شادی کرنے تک پہونچ جاتے ہیں۔ ایک دن لڑکا لڑکی پارک میں پہلی ملاقات کے لیے پہونچ جاتے ہیں۔ مگر ایک دوسرے کو دیکھ ان کے اوسان خطا ہوکر رہ جاتے ہیں:

''دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ میں دھیرے دھیرے اس کی جانب بڑھا اور پیچھے سے اسے پیچھے مڑنے کو کہا۔ جب ہماری نظریں ایک دوسرے کے چہروں پر پڑیں تو ہمارے اوسان ہی خطا ہو گئے کیونکہ وہ کوئی اور نہیں اس شہر میں تعلیم کے لیے گئی میری بہن ہی تھی۔ تب سے آج ہے، سوشل میڈیا کا استعمال کبھی نہیں کرتا۔۔۔'' (8)

اسی طرح افسانہ ''استاد'' کے ذریعے یہ پیغام دیکھنے کو ملتا ہے کہ عصر حاضر میں محکمہ تعلیم کی طرف سے چلائی جانے والی مختلف Trainings اور اسکیمیں تب تک کارگر ثابت نہیں ہوسکتی جب تک خود استاد میں مُدرّسی کے گن موجود نہ ہوں۔ استاد کی سب سے بڑی خصوصیت شفقت ہے۔ یعنی ایک استاد جب تک مُشفق نہ ہو وہ ایک کامیاب استاد نہیں کہہ لائے گا۔ افسانہ ''استاد'' کے آخر میں

ماسٹر جی کی مار کی ڈر سے خوف کھانے والا اس لاچار غریب بچے کا مکالمہ اس افسانچے کو ایک کامیاب افسانچے کے زمرے میں شامل کرار ہا ہے۔آپ بھی دیکھئے:

''نہیں ماسٹر جی! آپ نہیں سمجھ سکتے میرے درد کو۔'' وہ روہنی سی آواز میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

''آپ آجائیں ہمارے اسکول میں، اب چیزیں کافی بدل چکی ہیں۔ہم وعدہ کرتے ہیں سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

''ماسٹر جی معافی چاہتا ہوں، آپ اس بار بھی غلط فہمی میں مبتلا ہیں''۔

''وہ کیسے''؟

''وہ اس طرح سے ماسٹر جی! میں اور میرے جیسے لاکھوں بچوں کی ضرورت سرکاری اسکیمیں نہیں ہیں۔اگر ہمیں ضرورت ہے تو صرف ایک مشفق استاد کی اور وہ آپ کہاں سے لائینگے۔''؟(9)

افسانچہ''ہیرے کی پہچان'' میں ایک ہندو ڈاکٹر کے ذریعے ایک غریب امام صاحب کا مفت علاج اور مفت ٹیسٹوں کی کہانی ہندو مسلم بھائی چارے کا پیغام پیش کرتی ہے۔امام صاحب ڈاکٹر سنگیتا کو خط لکھ کر شکریہ ادا کرتے ہیں۔اقتباس پیش ہے:

''ایک مہینے بعد ڈاکٹر صاحبہ کے نام ایک خط آیا۔جس کا مضمون کچھ یوں تھا۔محترمہ سنگیتا جی۔۔۔۔آداب، سستے ٹسٹوں کے نام پر آپ نے جو میرے سارے مہنگے ٹسٹ کروائے تھے ان کی بدولت میں آج صحت مند ہوں۔لیکن مجھے سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ آپ نے مجھ پر اتنی دیا کیوں کی۔۔۔؟(10)

ڈاکٹر سنیتا کا جواب میں آداب کے بعد اتنا لکھنا کہ آپ ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہیں جو امام و مولوی صاحبان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے، ہندو مسلم بھائی چارے کا بڑا پیغام ہے۔افسانچہ ''شکستہ بیساکھی''میں افسانچہ نگار نے ایک بوڑھے باپ کے تیئں اپنے بیٹے کی غفلت شعاری اور بہو کی اپنے سسر کے لئے محبت اور بے لوث خدمت کو خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے۔افسانچہ''عید'' کے ذریعے افسانچہ نگار نے پڑوسی کے حقوق پر ایک مختصر اور بہترین کہانی بیان کی ہے۔اس کہانی کے ذریعے افسانچہ نگار نے یہ باور کیا ہے کہ مذہب، فرقہ اور مسلک سے زیادہ انسانیت ہی سب سے بڑا مذہب ہے۔افسانچہ''سلامو مستری کی پہلی کوشش''میں 15 اولاد جننے والے سلامو مستری کی اپنی اولاد کے تیئں سنجیدگی اور اپنے ایک بیٹے کو تحصیل علم کے لئے شہر بھیجنا۔پھر پڑھائی مکمل کرنے کے بعد اس بیٹے کا شہر سے واپس آنا اور پٹواری کی نوکری ملنے کے بعد اپنے والدین کی زمین کو فروغ کرنا

،ایک سبق آموز کہانی ہے جو بے غیرتی اور احسان فراموشی کا پردہ فاش کرتی ہے۔اس افسانچے سے معلوم ہوتا ہے کہ افسانچہ نگار شہر سے لے کر دیہات میں بسنے والے غریب کسانوں اور مزدور طبقہ کی سماجی اور خانگی زندگی کے بارے میں کافی معلومات رکھتے ہیں۔

مصباحی شبیر کے اکثر افسانچوں کے کرداروں کے نام بالخصوص مرکزی کرداروں کے نام نسیم ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔درس وتدریس سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ان کے افسانچوں میں تعلیم سے جڑے مسائل بھی ابھر کر سامنے آئے ہیں۔افسانچہ ''ماسٹر جی''میں مروجہ تعلیمی نظام اور اساتذہ کا اپنے فرائض کے تئیں غیر سنجیدگی برتنا اور وی۔ای۔سی ممبران کا اساتذہ کرام کو باور کرانے کے بعد اساتذہ کا آگ بگولہ ہونا دور حاضر کے نظام تعلیم کی بہترین عکاسی ہے۔اردو زبان کے تئیں ہمارے ہاں کافی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ہمارا ہر طبقہ طلباء سے لے کر اعلیٰ عہدوں پر فائز خواتین وحضرات اردو زبان کو بالکل آسان اور فضول سمجھتے ہیں۔جبکہ حقیقت میں ہم اردو زبان کی اہمیت کو جان نہیں پائے ہیں۔اس افسانے میں انہی باتوں کی طرف افسانہ نگار نے بہترین طریقے سے اشارہ کیا ہے۔

اردو زبان کی افادیت اور اہمیت کو مصباحی نے ایک اور افسانچہ ''اردو''میں بھی اجاگر کیا ہے۔اس افسانچے کے ذریعے مصباحی شبیر نے اُس طبقہ کو نشانہ بنایا ہے جو اردو سے نئی نسل کو دُور دیکھ کر کافی خوش نظر آتا ہے۔صفحہ نمبر 108 کے بعد ادراک میں مصنف نے یک رنگی افسانچے شامل کئے ہیں۔ان افسانچوں کے ذریعے شبیر مصباحی نے قارئین کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہر سماج کے دو رُخ یا دو طبقات ہوتے ہیں۔ایک طبقہ وہ ہے جو گاڑیوں میں بھر بھر کر بیٹی کی شادی کے لئے جہیز کا سامان بھیجتا ہے۔جبکہ دوسرے طبقہ کی ایل۔جی ٹی۔وی اور ڈبل بیڈ کی رقم موقع پر ادا نہ کرنے پر منگنی توڑ دی جاتی ہے۔یک رنگی افسانچوں میں سے ایک افسانچہ ''حسرت''میں ایک جگہ امیری اور غریبی کی حقیقت پر شبیر مصباحی نے اپنے قلم سے یوں وار کیا ہے۔

''سالانہ روٹین ٹیسٹ کے لئے آج وہ اپنی بیگم کے ساتھ شہر کے مشہور انسٹی ٹیوٹ سے ٹیسٹ کا رزلٹ ٹھیک نکلنے پر بہت خوش تھا اور اپنی بیگم سے وعدہ کر رہا تھا کہ آج ایوننگ شو میں ضرور جائینگے اور آج ہی اس کے مزدور بھائی کے پاس ایم آر۔آئی کے پیسے نہ ہونے کی وجہ سے شہر کی مسجد کے امام نے لوگوں سے دل کھول کر تعاون کی گزارش کی تھی۔''(11)

نیز شبیر مصباحی کے تمام تخلیق پارے قارئین کو دلچسپی کا سامان فراہم کراسکتے ہیں۔ 'ادراک' میں آسان اور سادہ زبان کا استعمال کیا گیا ہے جو ایک عام قاری بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے

۔کتاب کا ناشر ادارہ علم نما دراس ہے اور چھپائی رضوی پریس ایجنسی ،دہلی سے کی گئی ہے کتاب کی ضخامت 112 صفحات پر مشتمل ہے۔

حواشی:

1۔شبیر مصباحی، ادراک: رضوی پریس ایجنسی، دہلی، فروری 2020،ص:۱۳ 2۔ایضاً۔ص: ۱۷
3۔ایضاً۔ص: 27 ۔4 ایضاً۔ص: ۳۱ 5۔ایضاً۔ص39 6۔ایضاً۔ص 61 7۔ایضاً۔ص: ۳۷ 7 ۔ایضاً۔ص: ۶۱ 8۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص: ۸۱
9۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص: ۸۶
10۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص: ۹۰
11۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص: ۱۰۹

☆☆☆

Dina nath Naadim ki shairi par ek taerana nazar by Dr.kaiser Ahmad Malik(Asst.Prof. dept.of Higher education J&K)cell-9797947174

ڈاکٹر قیصر احمد ملک (اسسٹنٹ پروفیسر محکمہ اعلیٰ تعلیم جموں وکشمیر)

دینا ناتھ نادم کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر

کشمیری زبان میں جدید شاعری کی ابتداء بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے ہوتی ہیں، مہجور اور آزاد اس کے بنیاد گزار مانے جاتے ہیں۔ چوں کہ یہی وہ زمانہ تھا جب سیاست کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی کافی تبدیلیاں نمو پذیر ہوئیں اور ترقی پسند تحریک نے جنم لیا۔ ترقی پسند تحریک کے تحت مہجور اور آزاد کے علاوہ جو شعراء سامنے آتے ہیں ان میں نادمؔ، کاملؔ اور راہیؔ قابل ذکر ہیں۔ نادم کی اوائل شاعری میں مذکورہ شاعروں کا واضح اثر ہے لیکن ان کا کلام پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ فطرتاً بھی شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ اس حوالے سے بات کرتے ہوئے محمد یوسف ٹینگ نے نادم سے متعلق ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

''چمن لال چمن چھُ علی محمد لوُنٔ حوالہ دِتھ ونان زِ ۱۹۴۷ء عیسوی پتہ پرژھ اکِہ دہ لون صابن مہجوٗر صابس زِ توہہ کیاہ چھُ باسان پانس پتہ کُس یِیہِ کاشرِس شارس منز بارسس۔ مہجوٗرنؔ ووُنُس نادمس کُن اشار کران، ہُہ کیاہ ہُہ اَچکن لاگتھ شخص''۔ ا؎

میرے خیال میں اس بات کی مزید تصدیق ان اشعار اور اس بیان سے ہوتی ہے:

''ژھُکھ کشیرِ ہُند جوان — تُلُن ژے چھے آلُک نشان
ژگنڈ کمرِ تہ تُل کمند — ستارسون کر بُلند

بہ اوُسُس یِہ نظم ہتھ مجاہدِ منزل تمن دہن اس لکٹ جوان تتہِ سٹیج رٹتھ۔ مے زچہِ متس کُس پرژھ ہے۔ اتھس کتھ اس نظمہِ مورن مورن لگنہ ست میٹ گمژ۔ اتہِ پچھوٗنُس نہ بہ کانسہِ اچھوتہ کھرو چھُسکھ ہاوان زِ بہ ہسا چھُس سُے۔۔۔۔۔ بہ اوُسُس بچور ہیُو۔ اخر پیِیہِ بخشی صابس مے پھٹ نظر۔ دوپنس اَہن سازمنٹھ دیوٗس۔ شیخ صاب آوامی وقتہ۔ مے وون بخشی صابن ولہ پر۔ یِنہ لیلا ویلا پر کھ۔ مے پوریہے باتھ۔ سارنے گودم، عقلہِ بقل گیگھ، زے منٹھ لگ باتھ پرنس۔ پگاہ چھُس بہ نیندرِ وتھان زِ سوم ناتھ زِتشی پوو واتتھ۔ دوپُن اَز چھُ جلسہ حبہ کدلہ۔ توہ یِیو تور مگر باتھ ہتھ۔ مے دوپُس یِہ باتھ چھُنہ تتہِ پتہ

پرُن۔تَتہِ پر بہ بدل باتھ ؎

بہ بایہِ پننہِ کیاوَے ژے گراوکرنہِ واریاہ
ژے گلہ تہِ چھی کرن سٹھاہ مگرمے بوڈچھُ تاجبا'' ۲؎

اس طرح نادم نے اردو، انگریزی اوران کے بعد کشمیری زبان میں بھی شاعری کی طرف توجہ مبذول کی تھی جو کشمیری شاعری کے لیے ایک اعزاز ثابت ہوا۔نادم کی شاعری کو ہم دوادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ایک دوراس کی اوائل شاعری کا ہے اور دوسرا وہ دور جب انھوں نے زمانے کی تبدیلی کومحسوس کیا اور روایت سے ہٹ کر جدید شاعری کی طرف اپنی توجہ صرف کی اور نثر نگاروں کی طرح کشمیری شاعری کو بھی ایک نیا موڑ اور نئ وسعتوں سے ہمکنار کیا۔اوائل دور کی شاعری پر مارکسی اور ترقی پسندی کے اثرات واضح طور پر نمایاں ہے۔''ماج کشیر''،''مُژراوی برتے دارِ ویسی''،''نعرہ شباب''،''نعرہ انقلاب''،''گراو''،''کشیرِ ہُند دعویٰ''،''سوِز''،''یراد''،''پرژُھن چُھم''،''سونتھ تہ ہرد''،''مے چھم آش پگہچ''،''بہ گونہ از'' تہ''مے چھم کام باقی'' وغیرہ نظمیں دلیل کے لیے پیش کی جاسکتی ہیں۔ان نظموں میں جوش اور جذبہ وافر مقدار میں ملتا ہے جواس وقت کی شاعری اور نثر دونوں میں نظر آتا ہے۔کیوں کہ اس وقت سارا ادب حالات وواقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے تخلیق کیا جاتا تھا جس کی وجہ سے اکثر ادب کے تقاضوں کو نظر انداز کیا جاتا تھا اور تحریک کے مقاصد کو پہلا درجہ دیا جاتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ جب ہم ان نظموں کے موضوعات پر غور کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ شاعری سے زیادہ نعرہ بازی کے قریب ہیں۔چُھم ،لفظ''نعر،انقلاب،وتھنگ،محاز،قوم،سپاہ،وطن،لڑُن،آسمان،زمین،بنٔیل،کاروان،پاسبان،خوٗن،شہید،مرگ،لاچاری، تقدیر،گراو،کشیر،یراد،سونتھ،ہرد،آش،بُلبُل،چمن،گوٗن،شبنم،وزُل تہ کام وغیرہ''مے چھم آش پگہچ'' ان کی اوائل دور کی نظم ہے۔اس نظم سے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ نادم کی ایک اہم اور بڑی نظم ہے۔نظم کا ہر حصّہ ایک امید سے شروع تو ہوتا ہے مگر اختتام وسوسے پر ہوتا ہے۔یعنی نظم کا ہر حصّہ کلائیمکس پر شروع ہوتا ہے اور اینٹی کلائیمکس پر اختتام کو پہنچتی ہے۔اس نظم سے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں سامراجی طاقتوں کے ذریعے جنگی خوف وہراس پیدا کرنے کی کوشش کا اظہار کیا گیا ہے۔اس کو مانا جائے کہ سامراجی خوف اس نظم کے وجود میں آنے کا سبب بنا مگر جب وہ خوف نظم کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے تو وہ تخلیقی صورت اختیار کر لیتی ہے۔اس دینا میں کوئی سامراجی طاقت ہے نہ نوآبادیاتی نظام۔یہ نظم نہ نعرہ بازی ہے اور نہ ہی پروپگنڈا۔یہ ایک حقیقت ہے کہ اس نظم میں جوتین

کردار ابھر آتے ہیں وہ ایک ہی نسوانی کردار کے تین رخ ہو سکتے ہیں۔نظم میں استعمال شدہ لفظ پگاہ (کل) بھی نہ صرف کل کے معنی میں استعمال ہوا ہے بلکہ یہ پگاہ (کل) آنے والا وقت بھی ہوسکتا ہے۔مثلاً ؎

سٹھاہ ہنگنہِ رٹ تن بہ تھاو کاربن گُن ‏ ‏ تہ ییلہِ دل رٹم تیلہِ وُچھس اداچھن گُن
رٹم نالہ اداوش درُن ماچھ ممکن ‏ ‏ پگاہ واد چھُم تَس (مے چھم آش پگہچ)
ژ ماچھکھ گُنہٕ اَز ‏ ‏ کمیل چھکھ ژچھک ہول بیہِ گرؤس چھکھ
ژچھکھ وار یاہ وار یاہ اَز (مے چھم کام باقی)

یہ حقیقیت ہے کہ اس دور کے بعد انھوں نے اپنی شاعری میں شعوری طور تبدیلی لانے کی کوشش کی۔اس حوالے سے بات کرتے ہوئے این پشپ یوں رقمطراز ہیں:

''شیے مس دہلس منز درایہِ نادمن نوتجرُ بہ رنگہ رنگہ نن۔'ورہچ' تہ'دُ نل'ہشن ژھچن نظمن منز تہ،کاٹھ درواز پٹھ گرتام،ہشن زیچھن نظمن منز تہٕ''۔۳؎

ترقی پسند تحریک کے اختتام پر جو تبدیلی نادم نے اپنے شعری لہجے میں لائی اس سے متعلق پروفیسر مجروح رشید اپنی تصنیف عصری کاشر شاعری میں یوں لکھتے ہیں:

''نادمن ہیوت ترقی پسندی ہُند نظریاتی تبلیغ اوکطرف تراوِتھ زندگی ہندِس ووہارس سٕنُن۔تم ہیوت زندگی منز گُپتھ اسرارن نم دِتھ تِہُند حُسن بدکڈُ ن۔تم ژیؤن زِ زندگی چھے بدل ونن انہارن ہُند روپ تہ یمنے بدل ونن انہار لوگ سُہ پننہِ شاعری منز تخلیقی طور پیش کرنہِ''۔۴؎

جب ہم نادم کی شاعری کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں کئی طرح کی تبدیلیاں کیں۔سب سے پہلے انھوں نے جدید موضوعات کو اپنے کلام میں جگہ دی۔اس حوالے سے''نابد تہ ٹھ ون''نظم سرفہرست ہے۔یہ کشمیری ادب میں اس نوعیت کی پہلی نظم ہے۔اس وقت تک کشمیری ادب میں صرف مہجور کی نظم''گریس کوٗ ر'' قابل ذکر تھی جس میں مہجور نے ایک گاؤں کی لڑکی کے حسن کی تعریف کی تھی لیکن اس کے برعکس نادم نے''نابد تہ ٹھ ون''نظم میں ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جو اس وقت تک شاید کسی اور شاعر نے بیان نہیں کیا تھا۔ساتھ ہی اس نظم میں لفظوں کا صحیح استعمال،تراکیب کا حسن اور تواریخی کردار یک جان دو قالب ہوئے تھے۔جس کی بدولت یہ کشمیری ادب کا اہم کارنامہ تصوّر کیا جاتا ہے۔نمونہ ملاحظہ ہو:

نیلس پردَس وژھ تھتھر اَرے ‏ ‏ گُلپترا ماشرانس درامژ

بُنگرن گو چھن چھن انہ اندر — مے چُھ باسان راژ ہنز باہ آسن

نابدٹھ ون ٹھ ونہ نابد — پچ شُگُنتلا بیہ مالیُن کُن

اس نظم کے بارے میں ارجن دیو مجبور لکھتے ہیں:

''نابدتہ ٹھ ون'' چھِ س معرا نظم یسہ شاعر سندِ س ارتقا ہس منزا کھ نو تجرُ بہ چُھ۔ پرتھ رنگہ چُھ اتھ منزا کھ نو ر نظرِ گژھان زنتہ نادم چُھ انقلابی موضوٗعن ژھن دِتھ آفاقی مسلن اَٹھ دنہ باپتھ کمر گنڈان۔ یتھ نظمِہ منز چُھ شاعر جنسی تجرُ بہ کن اعلیٰ منزلن ہنز نشاندہی کینژ و دیو مالایی پز روتہ عام زندگی ہنز وتصویر وست کران۔ ۵ ؎

دوسری تبدیلی یہ ہوئی کہ انھوں نے نعرہ بازی کے بجائے عام بول چال کے الفاظ استعمال کیے۔ اس حوالے سے پروفیسر شفیع شوق بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نادمنہِ طرحدار شاعری منز کسہ خصوٗصیت چھے اندوند موٗجوٗ د؟ مے چُھ باسان صرف چھے اَکھ لسانی خصوٗصیت اتھ واٹھ دوان تہ اتھ منز چُھ نادمُن مُنفرد مزاز۔ اَمیک بیون تہ بدوٗن اسلوٗب چُھ اتھ منز موجوٗ د۔ دپنا ناتھ نادم پرز ناونہ ستا اس تم سنز شاعری پرز ناوتھ ہکو۔ نتہ باسن تم سنزِ شاعری ہند بیون بیون رنگ بیون بیون شخصن ہند رنگ''، ٦ ؎

ایک اور اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ نادم نے طویل نظموں کے بجائے اپنے خیالات کو مختصر نظموں میں پرویا۔ غلام رسول سنتوش اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''مجوٗرتہ آزادس پتہ دیُت نادم صابن سانہِ کاشر شاعری اکھ نو لب ولہجہ۔ نو اِمیجری تہ نو پیکر۔ پہَل کرتھ انن فارم انگریزی ادبہ پٹھ یَہہ تہ پانہ ناوِن۔ چاہیے سُہ بلینک ورس اوس یا فری ورس، سانٹ یا حال حالے لیچھِ مژ Hyko سٹایلس منز نچہ نظمہ''۔ ۷ ؎

چوتھی اور آخری تبدیلی یہ ہوئی کہ انھوں نے پیکر تراشی سے بخوبی کام لیا اور بہت ناقدین اس بات کے حق میں ہیں کہ ان سے پہلے کوئی دوسرا شاعر یہ کارنامہ انجام دینے سے قاصر ہے۔ اختر محی الدّین اس حوالے سے لکھتے ہیں: ''نادم صاب چھِ کاشرِ ادبہ کس پتھ کالس منز تھدن تھدن شاعرن ست شُمار سپدان۔ یہنز نظمن ہنز بڈ ہش خوبی چھے تصویر بندی۔ یتھ انگریز پاٹھ امیجری ونان چھِ۔ ہُند خیال چُھ زِ نادم صابنس امیجری ہند کمالس ووت نہ ازتام بیہِ کانہہ کاشُر شاعر''۔ ۸ ؎

نادم کی شاعری سے متعلق یہ بات واضح ہے کہ پیکر تراشی میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ اس ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔ جیسے اگر ہم ان کے اوائل دور کی نظم

''سونتھ تہ ہَر دٕ'' کو دیکھتے ہیں تو یہاں بھی یہ خوبی نمایاں ہے:

وٕتھی باغچ گگ لی کوٗ کوٗ کر کر جَل تہٕ قُمر منہ ناونے
وُچھی سونتہ کہ واوُک ہوٗ ہوٗ آمُت باغہ بُر ر وُ زناونے
مژ ژوانگن چھِ تہ وانگن چھِ بیون بیون
مَس مَلر ہیووانگن چھِ بیون بیون (ڈل ہانزنہِ ہُندگوٗن)

اس کے علاوہ ان کی کئی اور نظمیں بھی پیکر تراشی کے حوالے سے خاصی اہمیت کے حامل ہیں جن میں 'آوازن ہُند معنے، ژھٹھ، جنگل' مچھِ، صبح گاہی، آلو، وُنل، صُبحدم تہ نابدتہ ٹھ ون'' وغیرہ شامل ہیں۔ نادم صاحب کی سانٹ اور حارثات جیسی مختصر نظموں میں بھی پیکر تراشی کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہر کوئی ادیب اور فنکار اس بات پر متفق ہے کہ پیکر تراشی میں نادم کا صاحب کا کوئی ہمسر نہیں۔ نادم کے دوسرے دور کی شاعری میں ان کی اہم اور مختصر نظم ''گاسہ ٹُل'' شامل ہے۔ اس نظم میں شاعر نے زندگی کی صورتحال کو ''گاسہ ٹُل'' کے ذریعے پیش کیا ہے۔ شاعر نے گھاس کے تنکے کو زندگی کی علامت بنا کر استعمال کیا ہے۔ ایک گھاس کے تنکے کو زندگی کی علامت کے طور پیش کرنا ان کے فن کی عکاسی کرتا ہے۔ کیوں کہ شاعر نے زندگی کا خاکہ اس چیز کے ذریعے پیش کیا ہے جو دن رات میں بیشتر اوقات انسان کے ارد گرد رہتا ہے۔ یہی شاعر کی بڑی ہنرمندی ہے۔ اس نظم میں یہ تصور بھی پیش کیا گیا ہے کہ زندگی صرف ایک وہم ہے:

پھکہ ست پُھٹہِ دکہ ست چوٗ رگژھس ریہہ ہاویوس وُچھ تو سوٗ رگژھس

اسی طرح نادم نے ایک اور نظم زندگی کے عنوان سے تخلیق کی ہے۔ اس نظم پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی پہلی اور دوسرے دور کی شاعری میں کس قدر فرق ہے۔ اس نظم میں نادم نے زندگی کی حقیقت کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کی بے بسی کو بھی سامنے لایا ہے جب کہ ان کی پہلے دور کی شاعری میں صرف نعرہ بازی اور جذباتیت کا عمل دخل زیادہ ہے۔ اس کے برعکس دوسرے دور کی شاعری میں زندگی کی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

زان زِبتھ پھر زندگی ژنڈ لایی پُژلوٗنٹھ پنن نو ہاوی زانہہ

''ٹاواہ۔ ٹاواہ'' نظم کو نادم نے تمثیلی انداز میں تخلیق کیا ہے۔ ہر انسان دنیا میں آ کر اسے اپنے انداز اور طریقے سے سجانے سنوارنے میں لگ جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا کسی کے لیے بھی وفادار ثابت نہیں ہوئی۔ اس حقیقت کے اظہار کے لیے شاعر نے کاو (کوّا) بحیثیت کردار پیش

کیے ہیں جو درختوں سے وابستہ ہو کر بھی الگ الگ پیش کیے گئے ہیں۔ حالانکہ کاو (کوّا) دراصل ایک ہی کردار ہے لیکن نظم کا فلسفہ سمجھنے کی خاطر ان کو الگ الگ پیش کیا ہے تا کہ قاری کو نظم سمجھنے میں زیادہ دقت نہ ہو۔ نظم کا آخری شعر بہت ہی معنی خیز ہے۔ ملاحظہ ہو:

اَسہِ ووت صُبحہ پتھ بوزان خالص ٹاواہ ٹاواہ ٹاواہ ٹاواہ

نادم نے ہیئت کے لحاظ سے بھی کئی تجربے کیے ہیں۔ اس حوالے سے ان کی تخلیق کردہ نظم ''ژور'' اہم ہے۔ اس نظم میں شاعر نے دنیا کی بے ثباتی کو پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر نے خود اور اپنی زندگی پر بھی غور کیا ہے اور اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ کچھ کھو چکا ہے۔ نظم کا عنوان ''ژوٗر'' ہے، یہ وقت کی علامت کے طور پیش کیا گیا ہے کیوں کہ وقت ہی وہ واحد طاقت ہے جو سب کچھ ختم کرتا ہے۔ اس نظم میں شاعر نے اپنی پوری زندگی کی تفصیل کو بیان کیا ہے۔ اس کے لیے شاعر نے مختلف لفظوں اور تراکیب کا استعمال کیا ہے۔ جیسے ٹیک تا پک، چھٹہِ پوپُر، رنگہ ژھایہ، کانگر، ٹُجاہ، ہردک رنگ، رتہ کالچہ ژھانٹہ، شینہ شرط، اَسہ وُن شوق تہ وسہ ون مائے وغیرہ جیسے الفاظ روزمرہ زندگی میں مستعمل ہے لیکن نادم نے انھیں اپنے ایک الگ انداز میں برتا ہے۔ مثلاً:

تہ ون کیاہ چُھم باقے اکھ پھٹمُڑ کانگر

تتھ منز شینہ ٹُجاہ

اسی وجہ سے پروفیسر حامدی کشمیری نادم کی نظموں سے متعلق بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہِ کتھ چھے وَنس لایق زِ نادمنہِ کینہہ تاز مختصر نظمہ چھے تم سندِ ذیہنی تہ فنی سفر کہِ اکہِ نو منزلک پے دوان''۔ ۹؎

''ہے ژوٗ رہوٗ'' نادم صاحب کی ایک خوبصورت نظم ہے۔ اس میں شاعری کی ہر خصوصیت پائی جاتی ہے، اس لیے اسے اہم نظم مانا جاتا ہے۔ نادم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک حساس انسان تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں کشمیری سماج کے تمام موضوعات پر بات کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نادم کی رگ رگ میں کشمیریت رچی بسی تھی۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ کشمیریت سے متعلق ہر موضوع ان کی شاعری کا حصہ بنے۔ اس نظم میں بھی بنیادی طور پر انھوں نے کشمیریوں کے خلاف ہونے والی سیاسی سازشوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ناشپاتی کو بنیادی طور پر کشمیر کی علامت کے بموجب پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً:

گُل تھرس پتھ چھوٗ نہِ اکھ ٹنگ یینہ ترایوٗن والیوٗن گل لایتھ

ISSN-2322-0341

رؤ دشینہ چُھ درامُت تاون زد   ڈوٗٹھس دِتھ سینہ تہ ژھٹھ ژالتھ
یہِ چُھ ہوٗن اڈِج   پر ماتھوونس شینن روٗ دن
یہِ چُھ توتہِ تیتھے

’’کاکدوال سنز ہکھ‘‘ نادم کی ایک اور نظم ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ نادم کی نظم نگاری میں ہر خوبی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ نظم دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں اپنے سماج پر طنز کیا گیا ہے اور دوسرے حصّے میں اپنے قوم کو نصیحت کی گئی ہے کہ ایک قوم کس طرح سے ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔ جیسے:

زٹ پٹ چھوزچہِ انبار کنو   پھول ہیول چُھو کھارن کھار کنو
دَھن دیار وٹو گر بار کنو   ردی کاغذ اخبار کنو
ہُم کتہِ اون، اتھ کتھِ سنہِ بےقل   ییم کُن چھون، یژھ کتھ ونہِ بےقل
کھنہ وٹہ کھوڈ کیا کھنہِ بےقل

نادم صاحب نے اپنے دوسرے دور کی شاعری میں حقیقی طور ایک کشمیری کی زندگی سے وابستہ مسائل کو اجاگر کیا ہے جس کی وجہ سے ایک کشمیری کی پوری زندگی اپنے دکھوں اور سکھوں سمیت ان کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے ان نظموں کے علاوہ پابند نظم، آزاد نظم اور سانیٹ کے علاوہ اوپیرا بھی تخلیق کیے ہیں۔ اس سے متعلق نادم صاحب خود رقمطراز ہے:

’’بومبُر یمبرزلہ‘‘ پتہ لیکھ مے ’’نیکی تہ بدی، شہل کُل، مدُن تہ زُول مال تہ ’’وتستا‘‘ ژور اوپرا اَمہِ ہُریمانہ لیوگھم نوٗ رمحمد روشنس ست باج وٹھ کرِتھ ’’ہی مال ناگ رائے‘‘ یُس ساونڈ اینڈ لایٹ‘‘ ورتاوتھ ہارِ پر بتہ ہاونہ اوس یوان‘‘۱۰؎

الغرض اپنی شاعری کی طرح ان میں بھی نادم نے کشمیری سماج کے چھوٹے بڑے مسائل کی عکاسی کی ہے جس کی وجہ سے کشمیری قوم پورے آب و تاب کے ساتھ سامنے آتا ہے جو نادم صاحب کا بنیادی مقصد تھا۔ بہر حال باقی شاعروں کے بنسبت نادم کی شاعری پر گفتگو کرنا مشکل ہے کیوں کہ ان کی شاعری میں ہر لفظ اپنے اندر بھرپور معنی رکھتا ہے۔ پہلے بھی مذکور ہوا کہ انھوں نے اپنی شاعری میں ہر چھوٹے بڑے مسئلے کو موضوع بنایا ہے۔ ہاں یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے جو بھی مسئلہ موضوع کے لیے منتخب کیا اسے بڑی خوبصورتی سے پیش کرنے میں کامیاب ہوئے جو ہر ایک کے لیے شاید ممکن نہیں۔ مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا اپنا انداز اور منفرد اسلوب ہے جو اسے کشمیری

ادب میں ہمیشہ کے لیے زندہ وجاوید رکھنے کے لیے کافی ہے۔

حوالہ جات:

۱: محمد یوٗسف ٹیگ، سرنامہ ''شہل کُل'' (فوٹو لیتھوورکس دہلی ۱۹۸۵ء عیسوی) ص:۷

۲: دینا ناتھ نادم، آگرنیب ''شہل کُل'' (فوٹو لیتھوورکس دہلی ۱۹۸۵ء عیسوی) ص:۳۵۔۳۶

۳: پی۔ان۔پُشپ۔شیراز (نادم نمبر) کلچرل اکادمی سرینگر۔ص:۲۸

۴: پروفیسر مجروح رشید ''عصری کاشُر شاعری'' (بک میڈیا، سرینگر ڈلگیٹ، ۱۹۹۵) ص: ۶۵

۵: ارجن دو مجبوٗر۔شیراز (نادم نمبر) کلچرل اکادمی سرینگر۔ص:۱۷۰

۶: شفیع شوق۔شیراز (نادم نمبر) کلچرل اکادمی سرینگر۔ص:۸۰

۷ غلام رسول سنتوش۔۔شیراز (نادم نمبر) کلچرل اکادمی سرینگر۔ص:۱۲۱

۸: اختر محی الدین۔شیراز (نادم نمبر) کلچرل اکادمی سرینگر (کاشُر ادب۔جلد:۲۔شُمار۲۔ص:۲۸)

۹: پروفیسر حامدی کشمیری ''جدید کاشُر شاعری'' (کاشُر ڈپارٹمنٹ، ۱۹۸۲) ص:۱۰۴

۱۰: موتی لال ساقی۔شیراز (نادم نمبر) کلچرل اکادمی سرینگر۔ص:۶۶

☆☆☆

Mulk ki badi aqalliyat ki taleem aur rozgar ke farogh mein dini idaron ki khidmaat by Dr.Mohammad Serajuddin(Asst. Prof. Islamic studies MANUU,Hyderabad)cell-9899189028,7416841998

ڈاکٹر محمد سراج الدین (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مانو، حیدرآباد)

ملک کی بڑی اقلیت کی تعلیم اور روزگار کے فروغ میں دینی اداروں کی خدمات

''اقلیت'' عربی زبان کا لفظ ہے، جس کا معنی لغت میں ہے: نسبتاً کسی سے کم ہونا، لیکن اصطلاحی مفہوم کے لحاظ سے اقلیت کس کو کہتے ہیں، یہ ایک اہم سوال ہے، کیونکہ اقلیت کی کوئی متفقہ تعریف ابھی تک نہیں کی جاسکی ہے، مختلف لوگوں نے اقلیت کے مفہوم کو واضح کرنے کی کوششیں کی ہیں، ایک رائے یہ ہے کہ اکثریت کے بالمقابل تعداد کے اعتبار سے جو کم ہو، اس کو اقلیت کہا جائیگا، دوسری رائے یہ ہے: غلبہ یا مغلوبیت کا اعتبار کیا جائے گا، اور مغلوب جماعت اقلیت کہلائے گی، تیسری رائے یہ ہے کہ مذکورہ دونوں پہلوؤں کا اعتبار کیا جائے گا۔جسٹس سید شاہ محمد قادری (سابق جج سپریم کورٹ آف انڈیا) اقلیت کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں: اقلیت سے مراد وہ چھوٹا طبقہ ہے، جو مذہبی، لسانی، ثقافتی اور نظریاتی طور سے ملک کی بقیہ آبادی سے مختلف ہو، (اقلیتوں کے حقوق اور اسلاموفوبیا ناشر ایفا پبلیکیشنز، دہلی، ص38)۔

ڈاکٹر فیضان مصطفی (وائس چانسلر نلسار یونیورسٹی آف لا) انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''مائنر'' لاطینی زبان کا لفظ ہے اور ''ٹی'' لاحقہ ہے، جس کا مطلب وہ جماعت ہے، جو ایک مشترک خاندانی رشتہ سے منسلک ہو، ان کی زبان، مذہب، یا عقیدہ مشترک ہو اور وہ کسی مخصوص ملک کی اکثریت سے فکر و خیال کے معاملے میں مختلف ہوں۔(ایضا، ص:360)

۔ ڈاکٹر صلاح الدین سلطان سابق شریعہ ایڈوائزر حکومت بحرین لکھتے ہیں: اقلیت کسی مذہبی یا لسانی خصوصیت کی حامل وہ جماعت ہے، جو اپنی خصوصیت کے تحفظ کی خواہاں ہو اور جس ملک سے اس کا تعلق ہو، وہاں اس کی تعداد کم ہو یا زیادہ مگر وہ محکوم ہو۔(فقہ الاقلیت از ڈاکٹر صلاح الدین عبدالحلیم سلطان، ص:23، ناشر ایفا پبلی کیشنز، دہلی)۔

ان تعریفوں کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو دوسری متعدد مذہبی جماعتوں کے ساتھ مسلمان

بھی ہندستان میں اقلیت میں ہیں، ان کی تعداد کم بھی ہے اور مغلوب بھی، اس لحاظ سے ہندوستان ایک ایسا جمہوری ملک ہے، جہاں مختلف اقلیتیں آباد ہیں اور اسے بجاطور پر اقلیتوں کا وفاق کہا جاسکتا ہے، اس نے اپنے دستور میں اقلیتوں کو یکساں حقوق فراہم کیا ہے، آزادی، مساوات، اور انصاف کی ضمانت دی ہے اور تعلیم کے مواقع تمام شہریوں کے لئے یکساں طور پر فراہم کرنے کا عہد کیا ہے۔لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہندستان شرح خواندگی میں کافی پیچھے ہے، سنہ 2015 کے اعداد و شمار کے مطابق مجموعی طور پر ہندستان کی شرح خواندگی بہتر اعشاریہ 1 فیصد ہے، جبکہ مردوں میں شرح خواندگی بیاسی فیصد اور عورتوں میں پینسٹھ فیصد ہے۔اور ہندوستان کے صوبہ بہار میں شرح خواندگی ترسٹھ فیصد ہے۔یہ تو ہندستان کی مجموعی شرح خواندگی تھی۔ہندستان کی سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں کے یہاں شرح خواندگی قابل افسوس حد تک کم ہے۔ستمبر 2016 کے اعداد و شمار کے مطابق مسلمانوں میں شرح خواندگی بیالیس اعشاریہ سات فیصد ہے۔اور سچر کمیٹی رپورٹ کے مطابق چار فی صد سے بھی کم مسلمان گریجویٹ ہیں۔او6 سال سے 14 سال کے درمیانی عمر والے 25 فیصد مسلم بچے یا تو کبھی اسکول جاتے ہی نہیں اور اگر جاتے ہیں تو درمیان میں تعلیمی سلسلہ بند کردیتے ہیں۔25 انڈر گریجویٹ طلبہ میں سے صرف ایک اور 50 پوسٹ گریجویٹ طلبہ میں سے صرف ایک تعلیمی سلسلہ جاری رکھ پاتے ہیں، شہری علاقوں کے مردوں میں گریجوشن مکمل کرنے کا امکان ایس سی اور ایس ٹی سے بھی کم ہے۔

حالانکہ اسلامی روایات کے مطابق اس کائنات میں خالق کائنات نے سب سے پہلے حتی کہ انسان کی تخم ریزی سے بھی قبل آلہ تعلیم ''قلم'' کو پیدا فرمایا اور رہتی دنیا تک کے حالات قلمبند کردئے گئے، آخری نبی محمد رسول اللہ ﷺ کو سب سے پہلے جو اللہ کی طرف سے حکم دیا گیا تھا، وہ پڑھنے اور حصول علم سے ہی متعلق تھا، قرآن میں ۸۰۰ مرتبہ علم اور اس سے مشتق الفاظ ذکر کیے گئے ہیں، اور انسان کو دوسری تمام مخلوقات سے افضل علم ہی کی بنیاد پر بنایا گیا ہے، حضرت آدم کو فرشتوں سے افضل علم ہی کی بنیاد پر قرار دیا گیا، چنانچہ انہیں مسجود ملائکہ بنایا گیا۔حضرت محمد ﷺ کی بعثت جس شہر میں ہوئی وہ علم اور تعلیم و تعلم سے ایک حد تک نا آشنا تھا، چنانچہ حضرت محمد ﷺ نے سب سے پہلے اپنے ساتھیوں اور پیروکاروں کے لئے حصول علم کا نظم کیا۔ہجرت سے قبل مکہ جہاں آپ کے لئے زندگی گزارنا بھی مشکل تھا اور ہر وقت آپ خطرے سے دوچار تھے، ان پر خطر حالات میں بھی شہر سے دور ایک گھر ''دار ارقم'' کو تعلیم کیلئے منتخب فرمایا، اور جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو

ISSN-2322-0341

مدینہ میں اپنی مسجد ہی کے ایک حصہ کو درسگاہ کے لئے منتخب کیا۔ جو''صفہ'' کے نام سے تاریخ کی کتابوں میں آج بھی موجود ہے۔

دارارقم اور مسجد صفہ سے پڑھکر جو طلبا نکلے، انھوں نے عرب کے جاہل اور بدو معاشرہ کو بدل کر رکھ دیا، اور آج کی تاریخ میں بھی وہ معاشرہ اپنی تہذیب وثقافت اور علم و درک میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے، نیز حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر مسلمان مرد و عورت کے لئے تعلیم کے حصول کو لازمی اور ضروری قرار دیا اور ماں کی گود سے قبر کی منزل تک حصول علم کے سفر کو جاری رکھنے کا حکم دیا، چنانچہ مسلمانوں نے اپنے نبی کی ان ہدایات کو عملی جامہ پہنایا اور انہوں نے نہ صرف مذہبی علوم بلکہ شعبہ حیات کے دیگر عقلی، سائنسی اور تجرباتی علوم کو بھی اپنی جولانگاہ بنایا اور علمی دنیا کے اوج کمال پر جا پہنچے، آج علمی ذوق رکھنے والا ہر شخص فارابی، ابن سینا، ابن خلدون، ابن الہیثم، جابر بن حیان، زہراوی، البیرونی، کے ناموں سے آشنا ہے۔ یہ تو چند نام ہیں جبکہ سیکڑوں افراد اس فہرست میں شامل ہیں۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان جب تک علم وہنر کے شیدائی رہے، دنیا کی امامت وسیادت ان کی ہاتھوں میں رہی، لیکن ہر عروج کے بعد زوال ہے، چنانچہ مسلمان بھی بتدریج تنزلی کے شکار ہوتے رہے اور نوبت یہاں تک جا پہنچی کے علم کے میدان میں قیادت کرنے والوں سے میدان علم ہی چھین لینے کی کوشش کی جانے لگی۔ اور وہ علمی سیادت کے ساتھ ساتھ دنیا کی حکمرانی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے، ان کے لئے تحصیل علم کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے بالخصوص ۱۸۵۷ کے بعد مسلمان جن سنگین مسائل سے دوچار ہوئے، ان میں دینی مدارس کے نظام کا خاتمہ بھی تھا، کیونکہ انگریزوں کی آمد کے قبل سے جو مدارس قائم تھے، نظام حکومت کی تبدیلی سے وہ مدارس روبہ زوال ہو گئے، مدارس کی جاگیریں اور اوقاف کو حکومت نے ضبط کر لیا، ذرائع آمدنی کے بند ہونے کی وجہ سے مدارس بند ہو گئے اور جو اساتذہ ان مدارس میں درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے، ان کو پابہ سلاسل کر کے قید کر دیا گیا، یا ان کو مختلف صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ چنانچہ مسلمان علم کی وادی سے نکل کر جہالتوں کی دلدل میں جا پہنچے۔ معاملہ یہانتک جا پہنچا کہ غربت وافلاس نے ان کو ہر چہار جانب سے آگھیرا، اور یہ خوف دامن گیر ہونے لگا کہ مسلمان اپنی تہذیبی شناخت کے ساتھ تشخص کو بھی نہ کھو بیٹھیں، اس لئے علماء کے سامنے ایک بڑا مسئلہ اسلام اور اسلامی تعلیم کی حفاظت اور دینی شناخت کی بقا کا تھا، چنانچہ اصحاب فکر علماء نے ایسے دینی ادارے اور مدارس کے قیام کی تحریک شروع کی جو حکومتوں کی سرپرستی سے آزاد ہو، اور ان کے اخراجات کے لئے براہ

راست عوام سے رشتہ جوڑا جائے ،تا کہ حکومتوں کو مدارس کے نظام میں دخل اندازی کا موقع نہ ملے اور عوام میں احساس ذمہ داری کے ساتھ ساتھ دین سے رشتہ جڑے اور عوام وعلما کے درمیان فاصلے کم ہوں ،اورعوام اپنے روزمرہ کی زندگی کے مسائل بآسانی علماء سے دریافت کرسکیں،چنانچہ انہیں مقاصد کے تحت حکومت سے آزاد قیام مدارس کی تحریک شروع ہوئی۔جہاں طلبہ کو نہ صرف یہ کہ تعلیم کی سہولت مفت فراہم کی جائے ، بلکہ ہاسٹل بھی مفت فراہم کئے جائیں،اور جو افراد کھانے کے اخراجات برداشت کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں،انکو کھانا بھی مفت فراہم کیا جائے اور ان کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کر کے سماج کا ایک کارآمد اور مفید فرد بنا دیا جائے۔

اسی تحریک کے زیر اثر ویلور میں حضرت شاہ عبدالوہاب قادری نے 1857 میں مدرسہ باقیات الصالحات کے نام سے ادارہ قائم کیا،حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے 1866 میں ضلع سہارنپور کے ایک قصبہ دیوبند میں دارالعلوم کے نام سے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی ،حیدرآباد دکن میں حضرت مولانا انوار اللہ فاروقی نے 1876 میں جامعہ نظامیہ کی بنیاد رکھی، بہار کے شہر دربھنگہ میں حضرت حاجی منور صاحب نے 1892 میں مدرسہ امدادیہ قائم کیا،1894 میں لکھنو میں دارالعلوم ندوۃ العلما قائم ہوا،، پھر بتدریج دیگر علماء نے اس تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ مدارس کے ذریعہ مسلمانوں میں نشاۃ ثانیہ پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی جس کا سلسلہ انیسویں صدی سے تاہنوز اکیسویں صدی تک جاری ہے۔اس طویل مدت میں مدرسے کے قیام کی تحریک نے دوررس اثرات مرتب کئے،اس کی وجہ سے برصغیر کے مسلمان مذہبی معلومات سے تہی دامن نہیں ہوئے اور اپنی تہذیب وثقافت کو باقی رکھا،اور اس تحریک کو دنیا کے ان ملکوں تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی جہاں کے مسلمان انہیں حالات سے دوچار ہونے لگے تھے جن سے یہاں کے مسلمان پہلے ہی نبردآزما ہو چکے تھے۔چنانچہ یہاں کے مدارس کے فضلاء نے دیگر ملکوں میں جا کر مدارس کی اس تحریک کی بنیاد ڈالی اور مدارس قائم کئے۔موجودہ ہندوستان میں اس وقت مسلمانوں کو مذہبی تعلیمات سے روشناس کرانے ،اسلامی تہذیب وثقافت کو برقرار رکھنے میں عموما انہی مدارس کے تربیت یافتہ علما کا کردار ہے۔

مدارس کی خدمات کو صرف مسلم سماج کی خدمات کے تناظر میں دیکھنا صحیح نہیں ہے،حقیقت یہ ہے کہ قومی شرح خواندگی کو بڑھانے اور ملک کو باکردار شہری فراہم کرنے کا کام بھی مدارس نے انجام دیا ہے،مدارس نے طلبہ کو کیریر سازی کے بجائے اخلاق وکردار سازی کی تعلیم دی ،اور

انفرادیت پسندی کے بجائے ان کے اندر اجتماعیت پسندی اور سماجی مفاد کے لئے قربانی دینے کا جذبہ پیدا کیا۔ مدارس نے ملک کی تعمیر وترقی میں جو اہم رول ادا کیا ہے، ان میں تعلیم کو عام کرنا، غریبوں اور دیہاتکے پسماندہ لوگوں کو فری ایجوکیشن فراہم کرنا اور ایسے لوگوں تک تعلیم کی روشنی پہنچانا ہے، جن کے لئے تعلیم کے تمام دروازے بند ہیں۔ تعلیم اور معاش کے درمیان اب چولی دامن کا رشتہ قائم ہوگیا ہے، مدارس کے رول پر اس پہلو سے بھی نگاہ ڈالی جائے کہ لوگوں کو روزگار سے جوڑنے میں مدارس کا کیا رول ہے، آج جبکہ بے روزگاری عام ہے، بے شمار تعلیم یافتہ افراد نان وشبینہ کے محتاج ہیں اور نوکری کی تلاش میں سرگرداں پھر رہے ہیں، ایسی صورت حال میں لوگوں کو روزگا سے جوڑنے میں بھی مدارس ومساجد کا اہم رول ہے۔ مدارس کے تربیت یافتہ افراد کی خدمات کا دائرہ اب صرف مسجد ومدرسہ تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ اب دینی مدارس کے تربیت یافتہ علما واسکالرس کی ایک تعداد یونیورسٹیز میں داخلہ لیتی ہے اور ضروری اسناد حاصل کرنے کے بعد وہ مذہبی امور کو انجام دینے کے علاوہ مختلف سطح پر صالح معاشرہ کی تشکیل اور ملک کی تعمیر وترقی کے لئے کام کر رہی ہے، مثلا یونیورسٹیز کے مختلف شعبوں میں اردو، فارسی، عربی، اسلامک اسڈیز، تھیالوجی میں معتد بہ اساتذہ مدارس کے فارغین ہیں، نیز ہندو بیرون ہند کے ان سفارت خانوں میں جہاں عربی اردو مترجمین کی ضرورتیں پڑتی ہیں، ان سفارتخانوں میں خدمات انجام دے رہی ہے، اور اس طرح ترجمانی کے ذریعہ مختلف ملکوں کے درمیان ربط کے قیام میں مدارس کے فارغین کا اہم رول ہوتا ہے، اسی طرح امور خارجہ کی انجام دہی، ریڈیو میں عربی نیوز کے نشر اور صحافت کے میدان میں بھی مدارس کے فارغین نظر آتے ہیں، نیز ملٹی نیشنل کمپنیوں میں، اور ہندوستان کے ان بڑے اسپتالوں میں جہاں علاج کے لئے عرب ملکوں سے مریض آتے ہیں، ڈاکٹرس اور مریضوں کے درمیان زبانی ربط پیدا کرنے کا کام عموما مدارس کے فارغین ترجمہ کے ذریعہ انجام دیتے ہیں۔ عربی اور اردو تحریر کو کمپوز کر کے قابل اشاعت بنانے میں بھی ان مدارس کے طلبہ کا اہم رول ہے۔ نیز عرب، امریکہ اور دیگر مما لک کے بینکوں میں اسلامی ونڈو کھل رہے ہیں، انہیں عموما مدارس کے طلبہ ہی خدمات انجام دیتے ہیں، اسی طرح بشمول عرب مما لک کے افریقہ، برطانیہ، امریکہ کے علاوہ دیگر مما لک میں بھی ہندستانی مدارس کے فضلا خدمات انجام دے رہے ہیں اور ان کے ذریعہ بیرونی کرنسیاں ہندستان آرہی ہیں اور وہ زرمبادلہ کا کام دے رہی ہیں۔

تعلیمی مضامین: مدارس میں زیر تعلیم طلبا کو کن مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے، آج یہ بھی

موضوع بحث ہے ،اس لئے اس پر روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ مدارس کے قیام کی تحریک کا پس منظر یہ تھا کہ مسلمانوں کی تہذیبی شناخت کو باقی رکھنے اور لوگوں کو اپنے مذہب سے جوڑے رکھنے میں مدارس واسطہ بنے ، چنانچہ ضروری تھا کہ بنیادی طور پر مدارس میں مذہبی تعلیم دی جائے۔لہذا مذہب اسلام جو صرف چند رسموں کے ادا کر لینے کا نام نہیں ہے، بلکہ ایک باظابطہ نظام حیات کا نام ہے،اور اسی نظام کے تحت اس نے ایک ہزار سال سے زیادہ دنیا کے اکثر حصوں میں حکمرانی کے فرائض انجام دیئے ہیں،اس لئے مکمل نظام حیات کی مدارس میں تعلیم دی جاتی ہے،جس کی تفصیل اس طرح ہے:اسلامی علوم،جس میں قرآن کریم،اس کا ترجمہ اور تفسیر،حدیث،فقہ اسلامی جس میں عبادت کے انجام دینے کے طریقہ سے لیکر سماجی اور معاشرتی مسائل،اخلاقیات،معاملات،سیاست اور حکمرانی کے طریقے،سفارتی تعلقات کی نوعیت غرضیکہ نظام حیات کے تمام ابواب پڑھائے جاتے ہیں،اس کے علاوہ میراث، محمد ﷺ کی سیرت اور تاریخ اسلام کے مضامین،منطق،فلسفہ،عربی زبان،تمام مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں،اور اب انگریزی اور کمپیوٹر آپریٹنگ کی تعلیم بھی مدارس کے نصاب میں شامل کئے جانے لگے ہیں۔ البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ مدارس میں جو مضامین ہیں ،ان میں سے بعض مضامین کو عصر حاضر کے تقاضوں سے جوڑا جائے،اور مذہبی اصطلاحات کے ساتھ ساتھ موجودہ اصطلاحات کو سمجھنے کی استعداد طلبا میں پیدا کی جائے،مثلا اسلامی معاشیات کے ضمن میں موجودہ معاشی نظام کی تعلیم دی جائے اور موجودہ معاشی اصطلاحات سے واقف کرایا جائے،اسی طرح اسلام کے سماجی اور اخلاقی نظام کے ضمن میں موجودہ شوشل نظام کی تعلیم بھی دی جائے،تا کہ مدارس کے طلبہ کے لئے خدمت خلق کے لئے مزید راہیں ہموار ہوں۔

☆☆☆

Munshi Prem chand ka afsana"kafan" ka Fanni aur tanqeedi jaeza

by Bilal Ahmad Wani(research Scholar,dept.of urdu Devi aheliya University,Indore)

بلال احمد وانی (ریسرچ اسکالر، دیوی اہلیہ وشو ودھیالیہ، اندور)

منشی پریم چند کا افسانہ ''کفن'' کا فنی اور تنقیدی جائزہ

منشی پریم چند اُردو کے مشہور ناول نگار ہیں ان کا اصلی نام دھنپت رائے ہے۔لیکن ادبی دنیا میں پریم چند کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ ۱۳ر جولائی ۱۸۸۰ء میں ضلع بنارس بھارت کے ایک قصبہ پانڈے پور کے نزدیک گاؤں میں لمہی میں پیدا ہوئے۔ان کے دادا گاؤں کے پٹواری اور والد ایک ڈاک خانے میں کلرک تھے۔ پریم چند ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے آپ نے تقریباً آٹھ برس فارسی پڑھنے کے بعد انگریزی تعلیم شروع کی۔ زمانے کے رواج کے مطابق بچپن میں فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کی۔ بنارس کالجیٹ اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پندرہ سال کی عمر میں یتیم ہو گئے اور فکر معاش کی خاطر ایک پرائمری سکول میں مدرسی اختیار کر لی۔مگر تعلیم کی لگن دل میں بدستور موجود تھی۔ پرائیویٹ طور پر بی اے کی ڈگری حاصل کی۔اور پھر ڈپٹی انسپکٹر آف سکولز ہو گئے اور کئی سال تک اس عہدے پر کام کرتے رہے۔

منشی پریم چند کو پڑھنے لکھنے کا شوق شروع سے تھا۔ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۰۱ء میں ہوا۔ جب انہوں نے رسالہ ''زمانہ'' کانپور میں لکھنے شرع کئے جب اس میدان میں نمایاں میں کامیابی ہوئی تو انہوں نے ملازمت چھوڑ کر افسانہ نگاری کو ہی مستقبل طور پر اپنا ذریعہ معاش بنالیا۔ اردو میں انہیں اوّلین افسانہ نگار کی حیثیت حاصل ہے ان کی تعلیم وتربیت خالص دیہاتی ماحول میں ہوئی تھی اور وہ دیہات والوں کے معاشی مسائل سے خوب واقف تھے۔اس کے ساتھ ہی انہوں نے کانگریس کی تحریک ''ترک سوالات'' کا گہرا مطالعہ کیا تھا چنانچہ ان کے افسانوں میں جہاں دیہاتی زندگی کی دلکش تصویریں ملتی ہیں، وہیں ملک کے سیاسی اور سماجی حالات کا عکس بھی ملتا ہے۔ پریم چند کے افسانوں کے گیارہ مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۰۷ء سے ہوا جو انہوں نے لکھیں لیکن اردو میں ان کی تعداد تقریباً ۲۰۰ ہے کیونکہ بہت سی ہندی کہانیاں اردو میں منتقل

نہیں ہوسکیں۔افسانوں کا ان کا پہلا مجموعہ ''سوز وطن'' نواب رائے کے نام سے چھپا تھا۔اس پر ان سے سرکاری باز پرس ہوئی اور کتاب کے سبھی نسخے جلا دیئے گئے۔اس کے دوسرے مجموعوں میں پریم پچیسی، پریم بتیسی، پریم چالیسی،فردوس خیال،خاک پردا،خواب وخیال،آخری تحفہ،زادراہ،دودھ کی قیمت اورواردات شامل ہیں۔

اردو کا افسانوی ادب جتنا پریم چند سے متاثر ہوا اتنا کسی دوسرے مصنف سے نہیں ہوا۔ ان کی متعدد تخلیقات کا دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ پریم چند کی ایک بڑی خوبی ان کی سادہ سلیس زبان اور شفاف و بےتکلف طرز تحریر ہے انھوں نے بول چال کی عام زبان کو تخلیقی زبان بنادیا اور افسانوی ادب کو ایسا جاندار اور شگفتہ اسلوب دیا جو تصنع اور تکلف سے پاک ہے۔انھوں نے ایسے وقت لکھنا شروع کیا تھا جب عشق ومحبت کی فرضی داستانوں اور رسمی قصہ کہانیوں کا دور دورہ تھا۔ پریم چند نے آکر اس طوفانی دریا کے دھارے کے کا رخ موڑ دیا اور کہانی کو ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کیا۔ پریم چند نے اپنے افسانوں میں قومی ناولوں میں قومی زندگی کے بنیادی حقائق کی ترجمانی کر کے اُردو ادب کے نئے نئے کردار، نئی فضاء، اور نئے ذائقے سے روشناس کرایا۔ وہ اپنے قارئین کو شہر کی روشن اور رنگین دنیا سے نکال کر گاؤں کی اندھیری اور بدحال دنیا میں لے گئے۔ یہ اردو کے افسانوی ادب میں ایک نئی دنیا کی دریافت تھی۔

اس دنیا کی وسعت اور گہرائی کو سمجھے بغیر پریم چند کے مطالعہ کا حق ادا نہیں ہوسکتا کیونکہ پریم چند کے فن کی جمالیات اور اس کی بنیادصداقتیں اسی وسیع تناظر میں پرورش پا کر اس قابل ہوئیں کہ اردو اور ہندی کے افسانوی ادب کی سب سے مستحکم روایت کا درجہ حاصل کر سکیں۔ پریم چند کو جدید اُردو فکشن کا بادشاہ بھی کہا جاتا ہے۔ پریم چند ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو بنارس (بھارت) میں انتقال کر گئے۔ پریم چند سے قبل اُردو افسانے کے نقوش انتہائی دھندے ہیں افسانہ بحیثیت صنف ادب پریم چند کی دین ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے اردو کے افسانوی ادب کا رشتہ زمین سے جوڑا اور اور ہندوستان کی دیہاتی زندگی کے مسائل کو افسانوں کا موضوع بنایا۔ وہ افسانوی ادب جو محض بادشاہوں ،شہزادوں، مافوق الفطرت عناصر اور جادوگروں وغیرہ کے بیان تک محدود تھا۔ اس میں پہلی بار گاؤں کے مسائل، عام انسانوں کے دکھ درد، غم اور خوشی کے منظر بھی دیکھنے کو ملے۔ ''پوس کی رات'' یا ''بوڑھی کا کی''، ''پنچایت'' ہو یا ''عید گاہ''، ''نمک کا داروغہ'' ہو یا ''بڑے گھر کی بیٹی'' پریم چند نے کسی نہ کسی سماجی مسئلے کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔اُنہوں نے اردو کے افسانوی ادب کو صحیح معنوں میں

نہ صرف عکس حیات بلکہ تنقید حیات کے دریچے پر پہنچادیا۔

''کفن'' پریم چند کی زندگی کی آخری تخلیقات میں سے ایک ہے جس میں زندگی بھر کا علم، تجربہ اور شعور جھلک آیا ہے پریم چند اپنی مختصر زندگی میں مختلف قسم کے حادثات وتجربات سے گزرے جس کی وجہ سے فکر ونظر کے حوالے سے بھی کئی موڑ اور پڑاؤ آئے۔ ''کفن'' میں بالواسطا یا بلا واسطہ یہ جذبہ اور فلسفہ باطنی پر جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ فنی سطح پر بھی جو پختگی ہمیں افسانے میں دکھائی دیتی ہے۔ وہ ان کے دیگر افسانوں میں کم نظر آت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کفن پر اردو کا ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے افسانوی ادب کے چند بڑے افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اردو کے بعض نقادتو اسے ان کے بڑے افسانوں میں شمار کرتے ہیں۔ ''کفن'' پریم چند کا ایک شاہکار افسانہ کہا جاتا ہے۔ مسلسل بھوک، استحصال اور سماجی چیز انسان سے کس طرح بنیادی انسانی اوصاف چھین لیتا ہے، اس کی عکاسی پریم چند کے افسانے میں کی گئی ہے۔ مادھو اور گھیسو صرف اس لیے دم توڑتی بدھیا کے پاس نہیں جاتے کہ اگر ایک گیا تو دوسرا ان آلوؤں کو کھا جائے گا جو وہ کھیت سے کھود لائے تھے۔ بدھیا کے مرنے کے بعد ہاتھ آئے کفن کے پیسوں کو بھی وہ شراب و کباب میں خرچ کر دیتے ہیں۔ اور پھر مختلف تاویلوں کے اپنے ضمیر کی آواز دبانے کی کوشش کرتے ہیں وہ اپنے مکارانہ طرز عمل سے خوش اور مطمئن ہے۔ کیونکہ وہ ان کسانوں سے تو بہتر ہیں جو جی توڑ محنت کرتے ہیں اور دوسرے اس کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور وہ بیچارے اپنی سادہ لوحی کے باعث ہمیشہ نقصان میں رہتے ہیں اس طرح پریم چند کا یہ افسانہ پلاٹ، کردار نگاری، فطری مکالموں اور دیگر فنی خوبیوں کی بنا پر اردو کے اہم افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس افسانے کا پہلا اور بڑا کمال یہ ہے کہ یہ ایک ایسے دو کرداروں کے ذریعہ شروع ہوتا ہے جن کی سماج میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ نا اہل ہیں کام چور ہیں اور بے حس بھی ہیں چوری چکاری کر کے کسی طرح پیٹ بھرتے ہیں ان دونوں کرداروں کا پریم چند یوں تعارف کراتے ہیں:

''چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام گیسو ایک دن کام کرتا تو دو دن آرام۔ مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹہ بھر چلم پیتا۔ اس لیے انہیں کوئی رکھتا ہی نہیں تھا گھر میں مٹھی بھر اناج ہوتو ان کے لئے کام کرنے کی قسم تھی۔۔ گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں تھا۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی ڈھانکے ہوئے دنیا کے مکروں سے آزاد قرض سے لدے ہوئے گالیاں بھی کھاتے تھے مگر کوئی غم نہیں۔ مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے آلو اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھاتے۔''

افسانے کی ابتدا ابھی آلو کھانے سے ہوتی ہے کہ دونوں باپ بیٹے جھونپڑے کے اندر گھیسو کی بہو اور مادھو کی بیوی بدھیا درِدزہ سے تڑپ رہی ہے اس کی چیخ سن کر گھیسو مادھو سے کہتا ہے۔

''جا تو دیکھ آ'' لیکن مادھو جھنجھلا کر کہتا ہے۔ ''مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کیا آؤں''

اور وہ اس لیے بھی اندر نہیں جاتا کہ اسے اندیشہ ہے کہ وہ اندر گیا تو اس کے حصّے کا آلو اس کا باپ کھا جائے گا۔ احساس کی یہ ستم ظریفی، بے حسی ان انسانی واخلاقی اقدار کی پامالی کی طرف اشارہ کرتی ہے جہاں غربت وافلاس اپنی انتہا پر پہنچ کر سارے اقتدار کو تہس نہس کر دیتی ہے۔ انہیں دوطرح کا احساس، اخلاق، شرافت، حمیت، قرب کا کوئی وجود نہیں رہ جاتا۔ یہ بات غور کرنے کی ہے کہ پریم چند نے بدھیا کے کردار کو زیادہ اہمیت دی ہے جو پورے افسانے پس پردہ رہنے والی ایک غیر فعال کردار ہے صرف اس کے وجود کا احساس ہوتا ہے لیکن افسانے کی پوری کہانی اسی کردار پر منحصر ہے۔ بدھیا کا کردار ایک ایسی عورت کا کردار ہے جو بیوی ہے اور مادھو کے بچے کی ماں بننے والی ہے ایک ایسے غریب گھر میں بیاہ کر آتی ہے جہاں غربت ہی غربت ہے لیکن اس کے باوجود اس نے ایک خستہ حالی اور بے حسی کی دنیا میں ہلکی سی جان ڈال دی ہے۔ وہ بے چاری دوسروں کے گھروں میں پسائی کر کے اور گھاس چھیل کر دونوں باپ بیٹے کا پیٹ بھرتی تھی۔ ذرا جملے دیکھئے:

''جب سے یہ عورت آئی تھی اس نے خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈال دی تھی۔ پسائی کر کے، گھاس چھیل کر وہ سیر بھر آٹے کا انتظام کر لیتی اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی۔''

اس اقتباس کے پہلے جملے کو غور سے دیکھئے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے ہمارے گھروں میں ہمارے سماج کی تمدن اور تہذیب کی بانی عورت ہوا کرتی ہے۔ عورت کے دم سے زندگی میں زینت ہے انتظام ہے عورت کا اتنا احترام اوروں کے افسانوں میں کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ ورنہ زیادہ تر عورت محبوب ومعشوق اور اس کے حسن کے ہی چرچے ہیں۔ آخر بدھیا صبح تک دردزہ میں تڑپ تڑپ کر پچھاڑیں کھاتی رہی لیکن بدھا کے چیخ کا دونوں باپ بیٹے پر کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا۔ وہ تو بس چرائے ہوئے آلوؤں کو بھون کر کھانے میں مصروف ہیں۔ صبح جب مادھو بدھیا کو دیکھنے کوٹھری میں جاتا ہے تو بدھیا مری پڑی ہوتی ہے۔ اس سطر کو پریم چند نے یوں بیان کیا ہے:

''صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جا کر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کے منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں۔ سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔''

اب دونوں باپ بیٹے کو اسکے کفن دفن کی فکر ہوتی ہے۔ چنانچہ انتہائی ڈرامائی انداز میں دونوں آہ وزاری کرنے لگتے ہیں کچھ اس طرح دکھاوا کرتے ہیں:

''گاؤں والے دونوں کو کام چور اور نااہل سمجھتے ہیں پھر بھی رسم قدیم کے مطابق ان کی تشفی کرتے ہیں اور مدد کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ناکافی مدد کو دیکھتے ہوئے دونوں باپ بیٹے گاؤں کے زمیندار کے پاس جاتے ہیں زمیندار بھی ان ناہلوں سے نفرت کرنے کے باوجود ان کی مدد کرتا ہے ایک گھنٹے میں ہی جب پانچ روپئے کی معقول رقم جمع ہو جاتی ہے تو یہ دونوں کفن خریدنے کی غرض سے بازار جاتے ہیں۔

''کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کپھن چاہیئے۔''

یہ الفاظ اپنے اندر بہت ساری تکلیفوں کا احساس لئے ہوئے ہیں جس کے ذریعے وہ سسکتے ہوئے لوگوں کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ سماج کے کٹھور پن کو دکھاتے ہیں اور ہمیں غیر شعوری طور احساس بھی دلاتے ہیں اور ہمیں غیر شعوری طور احساس بھی دلاتے ہیں کہ ہم رسم ورواج کے کتنے سخت بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ کہانی کے آخری حصے میں صورت حال کی ستم ظریفی انتہا پر یوں پہنچتی ہے کہ کفن کا کپڑا دیکھتے دیکھتے دونوں بجائے کفن خریدنے کے ایک شراب خانے کے سامنے آ پہنچتے ہیں اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر چلے جتے ہیں۔ گھر میں لاش رکھی ہے اور یہاں دونوں کفن کے پیسوں سے شراب پینے لگتے ہیں لیکن دونوں کے ذہنوں میں لاش کا تصور ہے۔ یہ طنز میں بجھے ہوئے نشتر ہیں جو انسان کی ریاکاری، خود غرضی اور خواہش نفسانی کا پردہ چاک کرتے ہیں، اور پوری صورت حال پر وار کرتے ہیں۔ نشے کی حالت میں مادھو پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور وہ رونے لگتا ہے۔ تو گھیسو سمجھاتا ہے:

''کیوں روتا ہے بیٹا۔ کھس ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہوگئی۔ جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھ توڑ دیئے۔''

پیتے پیتے دونوں گانے لگتے ہیں، اور بدحواس ہو کر وہیں گر پتے ہیں۔ یوں یہ کہانی ایسی صورت حال، کرداروں کے رویوں، عمل اور مکالموں سے ایک شیدی درد اور صدمے کی کیفیت سے دو چار کرتی ہے اور طنز کے کچوکے لگاتی ہے پوری کہانی کی فضا طنزیہ ہے۔ پریم چند نے ایک سنگین سچائی سے پردہ اٹھاتے ہیں، اور آخری وار ایسا بھرپور کرتے ہیں کہ پوری کہانی نام نہاد انسانیت اور شرافت کے منہ پر زبردست طمانچہ بن جاتی ہے۔ بقول **علی جواد زیدی:** ''پریم چند کے یہاں جو چیز سب سے

زیادہ نمایاں حیثیت رکھتی ہے وہ دیہاتی زندگی کی صحیح اور ہو بہو مرقع کشی ہے ان کے افسانوں کو پڑھتے وقت یہ چونکا دینے والا احساس ہوتا ہے کہ ہم اپنے ہی لوگوں کے حرکات وسکنات کا زندگی بھر مطالعہ کرتے رہتے جو ہمیں میں سے ہیں۔ ان کے آئے دن ہم سے سابقہ پڑا کرتا ہے مگر جس زندگی میں اب تک ہمارے لیے کشش یا دلکشی کا کوئی سامان نہیں تھا وہی پریم چند کے قلم کی ادنیٰ سی جنبش کی بدولت اتنی لطیف اور پرلطیف بن جاتی ہے کہ ہم ایک لذت محسوس کرنے لگتے ہیں۔''

بقول عبدالماجد دریابادی: ''شہر کی زندگی کی نقاشی تو بہتوں نے کی ہے پر کھیت کے میڑوں پر کوئی کم ہی چلا ہے۔ دیہات کی چوپالوں اور جھونپڑوں میں کم ہی کسی کے قدم گئے ہیں پریم چند کے قلم کا اصل جوہر یہی ہے کہ فن کے دوسرے لوازم میں تو ان کی نظیر مل جائے گی لیکن جہاں تک ہندوستانی عناصر اور دیہی زندگی کی مصوری کا تعلق ہے، پریم چند کے جوڑ پر کوئی نظر نہیں پڑتا۔ دیہات کے جس حسین منظر کا سماں دکھلاتے ہیں دور سے بتلاتے ہیں گویا اٹھا کر پہنچا دیتے ہیں۔''

بقول پرفیسر احتشام حسین: ''یہ پریم چند کا ہی کام تھا کہ انہوں نے محنت کش عوام کو اپنے افسانوں اور ناولوں کا ہیرو بنایا۔ اور دنیا کی تصویر کھینچی جو سب سے زیادہ جاندار سب سے زیادہ حقیقی اور سب سے زیادہ انسان دوستی کی مظہر تھی۔ پریم چند پہلے ادیب ہیں جنہوں نے شعوری طور پر ادب کے ذریعے بطور خاص ہندوستانی عوام کے مسائل کو سمجھنے میں انسان دوستی کی طرف اپنا قدم بڑھایا۔''

بقول وقار عظیم: ''کردار نگاری میں شعور کی رو کا استعمال پریم چند نے اس چابکدستی سے اپنے کسی اور افسانے میں نہیں کیا۔ اشاروں ہی اشاروں میں انہوں نے ماضی اور حال کے واقعات کے درمیان ایک ایسا ربط پیدا کیا ہے کہ پڑھنے والا ذرا سی دیر کو بھی اپنے ذہن کو افسانے بنیادی خیال کے اثر سے الگ نہیں کر سکتا۔''

حوالہ جات: (۱) ڈاکٹر قمر رئیس، پریم چند کے نمائندہ افسانے، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۸۶ء
(۲) پریم چاند کے بہترین افسانے، خوجاہ محمد زکریا ۱۹۷۵ء صفحہ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔
(۳) بحوالہ: پریم چند ہنس راج رہبر، صفحہ۔ ۱۳۔ (۴) نیا افسانہ، صفحہ ۶۵۔
(۵) ڈاکٹر قمر رئیس، پریم چند کے نمائندہ افسانے، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۸۶ صفحہ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔
(۶) پریم چند کے بہترین افسانے؛ خواجہ محمد زکریا، ۱۹۷۵ء صفحہ ۲۲۸۔

☆☆☆

Samaji Uloom ki tadrees mein adab-e-atfaal ka istemaal by
MD.Saadat Hussain(Research Scholar & Dr. Sadaqut Ali Khan
Assot.prof.college of Teacher Education MANUU,Darbhanga&Bidar
محمد سعادت حسین (ریسرچ اسکالر، کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، مانو، دربھنگہ)
ڈاکٹر صداقت علی خان (اسوسیئٹ پروفیسر، کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، مانو، بیدر)

سماجی علوم کی تدریس میں ادبِ اطفال کا استعمال

تلخیص: سماجی علوم کی تدریس کا اہم مقصد ایسے تعلیم یافتہ افراد کو تیار کرنا ہے جو سماج میں ایک ذمہ دار شہری بن سکیں۔ اساتذہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ طلباء کو بچوں کے ادب کی وسیع اقسام سے متعارف کرائیں۔ طلباء کو سماجی علوم کی تعلیم مہیا کرانے سے ان کے اندر سماج کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے۔ وہ سماج میں ہونے والے ردعمل کو بہتر طور پر جانتے ہیں اور اس بات کا امکان بڑھ جاتا ہے کہ وہ زندگی میں اخلاقی قدر کی پابندی کریں گے۔ سماجی علوم کا بنیادی مقصد طلباء کو ایک دوسرے پر منحصر دنیا میں ثقافتی طور پر مختلف، جمہوری معاشرے کے شہری ہونے کے ناطے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے باخبر اور معقول فیصلے کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے میں مدد کرنا ہے۔ سماجی علوم کی تدریس کے مختلف طریقہ کار ہیں جن کی اپنی اپنی خصوصیات اور خامیاں ہیں۔ سماجی علوم کے لیے ادب پر مبنی نقطہ نظر طلباء کو ایک حقیقت پسندانہ میدان پیش کرتا ہے جس کے اندر وہ طویل عرصے تک سماجی علوم کی تصورات کو سیکھ سکتے ہیں اور ان کی تحقیق کر سکتے ہیں۔ یہ زیادہ وسعت کے سیکھنے کا ایک طریقہ کار ہے۔ ادبِ اطفال اکثر سماجی علوم کے نصاب میں ایک غیر دریافت شدہ خیال رہا ہے۔ تحقیق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ادبِ اطفال سماجی علوم موضوع سے ذاتی تعلق قائم کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ سماجی علوم کے اکتساب کو ادبِ اطفال کی مدد سے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ اس مقالہ میں سماجی علوم کی اہمیت، اس کی تدریس میں ادب اطفال کے انضمام اور متعلقہ مشوروں پر گفتگو ہے۔

کلیدی اصطلاح: ادبِ اطفال، سماجی علوم کی تدریس۔

تعارف: تدریس کو طلباء کے لیے دلچسپ بنانا استاد کا اپنے طالب علم کے لیے ایک بہترین تحفہ ہے۔ تعلیمی حصولیابی میں دلچسپ تدریسی عمل کا ہونا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اساتذہ اپنے تدریسی

مہارت کا استعمال کر کے نصابی مواد کو اس قابل بنانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے طلباء سے متوقع نتائج حاصل ہوں۔ تعلیم کے مختلف سطح پر مناسب ترکیب کا انتخاب کرنا اساتذہ کو مزید موثر بناتا ہے۔ دورِ حاضر میں جہاں طفل مرکوز اپروچ عمل میں ہے، اساتذہ کو اپنے تدریسی عمل میں نہایت ہی حساس ہونے کی ضرورت ہے۔ طلباء کی نفسیاتی ضروریات کو سمجھے بغیر موثر تدریسی عمل ناممکن ہے۔ تحقیق سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ تدریسی عمل میں جب اساتذہ ادب کا استعمال کرتے ہیں تو طلباء کے آموزش میں مثبت نتیجہ ظاہر ہوتا ہے اور موثر تدریس میں ادب کا استعمال اہم کردار ادا کرتا ہے۔ متعلقہ مواد کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تدریسی عمل میں ادب کے استعمال سے طلباء کی حوصلہ افزائی، دلچسپی، شرکت اور مواد کے تئیں ان کی فہم میں اضافہ ہوتا ہے۔ ویسے طلباء جن کی کسی خاص مضمون یا مواد میں دلچسپی کم ہوتی ہے، ایسی حالت میں ان کے دلچسپی میں اضافہ کرنے کے لیے تدریس میں ادب کو متعارف کرا کار متوقع تدریسی نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے(Kothlow, 1993)۔ اسکولی سطح پر تدریس میں ادبِ اطفال کی مدد سے مواد کو طلباء کے لیے دلکش بنایا جا سکتا ہے۔

ادبِ اطفال ایک نظر میں: بچوں کی نفسیاتی اور جسمانی صلاحیتوں کا خیال رکھ کر تیار کیا گیا ادب، ادبِ اطفال کہلاتا ہے۔ ایسے ادب میں بچوں پر مرکوز مواد کو شامل کر کے بچوں کی نشونما کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسے مواد کی زبان آسان اور واضح ہوتی ہے جس سے کہ بچے اسے آسانی سے اپنے ذہن میں محفوظ کر سکیں۔ ان میں کہانیاں، کتابیں، رسالے اور نظمیں شامل ہیں جو بچوں کے لیے تخلیق کی جاتی ہیں۔ بچوں کے ادب کے لیے عمر کا دائرہ بچپن سے لے کر ابتدائی جوانی کے مرحلے تک ہے، جو تقریباً بارہ سے چودہ سال کی تاریخی عمر کے ساتھ موافق ہے(Childs, ND)۔ ادب کی دنیا میں بچوں کے ادب کی شروعات اٹھارھویں صدی کے اخیر میں مغرب میں معلوم ہوتا ہے، پھر اس کے بعد ادبِ اطفال کا یہ سلسلہ مضبوط اور مستحکم ہوتا چلا گیا(Iqbal, 2018)۔ صدی کے آخر تک، ادب اطفال برطانیہ میں اشاعتی صنعت کا ایک پھلتا پھولتا، علیحدہ اور محفوظ حصہ بن چکا تھا (Grenby, 2014)۔

سماجی علوم اور اس کی اہمیت: سماجی علوم کی اہمیت کو سمجھنے سے پہلے یہ مناسب ہوگا کہ ہم سماجی علوم کو سرسر ی طور پر سمجھنے کی کوشش کریں۔ سماجی علوم مطالعہ کی وہ شاخ ہے جو انسانوں کے رویے، ترقی اور نشونما، باہمی رشتے، قدرتی وغیر قدرتی وسائل جس کا استعمال انسان کرتے ہیں اور مختلف ادارے سے تعلق قائم کر کے اپنی زندگی کو آسان بناتے ہیں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ قومی درسیاتی خاکہ (2005) نے سماجی علوم کی کو کچھ اس طرح سے واضح کیا ہے 'سماجی علوم سماج کے مختلف سروکاروں کا

احاطہ کرتی ہے۔ سماجی علوم کی تعلیم اور اس کا تناظر ایک منصفانہ اور امن پسند سماج کی تعمیر کی بنیاد فراہم کرنے کے لیے ناگزیر ہوتی ہے۔ اس کے نصاب کا مقصد مانوس سماجی حقیقتوں کی تجزیاتی جانچ اور اس پر سوال قائم کرنے کے لیے طلباء میں بیداری پیدا کرنا ہے'۔ مثال کے طور پر۔ خاندان، اسکول، کام کی جگہ، حکومت، عدلیہ، تفریحی کلب وغیرہ۔ زندگی کے یہ تمام پہلو ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ لہٰذا چاہے کوئی ڈاکٹر یا انجینئر یا چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ، آرٹسٹ یا استاد بننا چاہتا ہے، ہم سب کو ایک معاشرے میں رہنا ہے، مختلف ثقافتی اور سماجی و اقتصادی پس منظر سے تعلق رکھنے والے افراد سے بات چیت کرنی ہے، مختلف حالات و واقعات کے مطابق ڈھالنا ہے، اور ایک پرامن اور پیداواری زندگی گزارنے کے لیے کچھ معاشرتی اصولوں پر بھی عمل پیرا ہوں (Dhandhania, ND)۔ پرائمری سے سیکنڈری کلاس تک نصاب میں سماجی علوم کی شمولیت اس مضمون کی اہمیت اور طالب علم کی زندگی میں اس کے کردار کی نشاندہی کرتی ہے۔ نیشنل فوکس گروپ کا پوزیشن پیپر برائے سماجی علوم کی تدریس نے سماجی علوم کے مطالعہ کی اہمیت کو بتاتے ہوئے بچوں میں مندرجہ ذیل صلاحیتوں کے پیدا ہونے کی بات کی ہے:

• طلباء جس سماج میں رہتے ہیں ان کی انھیں بہتر سمجھ ہوتا کہ وہ سیکھیں کہ سماج کیسے کام کرتا ہے، اس کا نظم وضبط کون کنٹرول کرتا ہے اور معاشرے کے اندر تبدیلی لانے کے لیے کون لوگ کوشاں رہتے ہیں۔

• قومی اقدار مثلاً انصاف، آزادی، مساوات، اخوت، قوم کا اتحاد اور اس کی سالمیت اور سوشلسٹ سیکولر سماج کی تعمیر کی بہتر فہم اور ان اقدار کی ستائش کرنے کی جن کی ضمانت ہندوستانی آئین میں دی گئی ہے۔ • سماج کے فعال، ذمہ دار اور پر فکر افراد کے طور پر پلنے بڑھنے کی۔ • خیالات، طرز زندگی اور تہذیبی روایات کا احترام کرنا سیکھنے کی۔ • انھیں دلچسپ مطالعاتی مواد فراہم کر کے مطالعے سے لطف اٹھانے کی۔ • ایسی سرگرمیوں میں مصروف ہونے کی جو سماجی اور زندگی کی ہنرمندیوں کے فروغ اور یہ سمجھنے میں ان کی مدد کرے کہ یہ صلاحیتیں سماجی تعامل کے لیے اہم ہیں۔

اسکولوں میں سماجی علوم کے نصاب کے تحت تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، معاشیات، سماجیات اور بشیرت جیسے مختلف نوع کے مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔ (NCF, 2005)

سماجی علوم کی تدریس میں ادب اطفال کیا نضمام کا ایک جائزہ: سماجی علوم کی تعلیم میں مدد کے لیے بچوں کے ادب کا استعمال مواد کی ایک طویل تاریخ ہے۔ سماجی علوم کی طریقہ تدریس کے ماہرین نے نصابی کتاب کی تکمیل کے لیے ایسی کتابوں کے استعمال کی وکالت کی ہے۔ (,Sandmann & Ahern

2008)۔حالیہ برسوں میں، کچھ اساتذہ اور اسکول بچوں کے ادب کو بنیادی طور پر سماجی علوم کے مواد کی تدریس میں استعمال کرنے کی طرف بڑھ گئے ہیں۔ اساتذہ کے لیے یہ پیش رفت سماجی علوم سیکھانے کے لیے بچوں کے ادب میں اعتماد کا مظاہرہ ہو سکتا ہے۔(& Helms, Shiveley 2008)۔چونکہ طلباء اور اساتذہ کہانیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں، لہٰذا ادب کا استعمال ایک بہت ہی حوصلہ افزا تدریسی تکنیک ہے۔سماجی علوم کی مخصوص تعلیم کے لیے ادب اطفال کے استعمال کرنے کے ممکنہ فوائد کے بارے میں Krey (1998) نے Children's Literature in Social Studies: Teaching to the Standards میں کئی باتوں کا ذکر کیا ہے۔انھوں نے ادبِ اطفال کا استعمال کر کے درج ذیل کو پورا کرنے والے اسباق بنانے کے فوائد بتاتے ہیں:

- نقل وعمل کے ذریعے انسانی واقعات کے بارے میں سیکھنے والے کے علم میں اضافہ کرتا ہے۔ چونکہ سماجی علوم میں انسانوں کے ارد گرد موجود واقعات کے رشتہ کا مطالعہ کیا جاتا ہےاس لیے جب ان باتوں کو روایتی طریقہ کے علاوہ جب ادبِ اطفال کے معرفت سے طلباء کو تدریس دی جاتی ہے تو وہ خود کو اس میں شامل پاتے ہیں، ان کے دلچسپی میں نمایا اضافہ ہوتا ہے جو ان کے اکتساب میں اضافہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔
- انسانی واقعہ کے جذبات کو اندرونی نقطہ نظر فراہم کرتا ہے،
- سماجی واقعات کا زیادہ مجموعی تصویر پیش کرتا ہے جب کہ کتابیں عام طور پر سروے والا طریقہ کار کا استعمال کرتے ہیں۔
- کسی خاص واقعہ کی حقائق اور ملوث لوگوں کی انسانی خصوصیات کے درمیان بہتر توازن فراہم کرتا ہے۔
- سیکھنے والوں کو واقعات اور کرداروں کو ان کے اپنے ذاتی تجربات سے جوڑنے کا موقعہ فراہم کرتا ہے۔

نیشنل فوکس گروپ کا پوزیشن پیپر برائے سماجی علوم کی تدریس نے مانا ہے کہ "طالب علم کو تعاملی ماحول میں علم و ہنر کے حصول کے قابل بنانے کے لیے سماجی علوم کی تدریس میں دوبارہ جان ڈالنے کی ضرورت ہے۔سماجی علوم کی تدریس کو لازماً ایسے طریقے اختیار کرنے چاہیے جو تخلیقیت، جمالیاتی حس اور تنقیدی تناظر کو فروغ دے اور بچے کو سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھنے کے لیے ماضی اور حال میں رشتہ قائم کرنے کے قابل بنائے۔افراد اور معاشروں کے حقیقی تجربات کے ذریعے

طلباء کے سامنے تصورات کی وضاحت کرنی چاہیے'۔دوسرے تحقیق کاروں نے بھی سماجی علوم میں ادبِ اطفال پر نمایاں کام کیے ہیں۔موجودہ وقت میں طلباء میں تنقیدی صلاحیت پیدا کرنا تعلیم کا اہم مقصد ہے۔طلباء میں تنقیدی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے اساتذہ مختلف طریقہ کار کا استعمال کرتے ہیں۔((Findlay 2002اور (1993) Smith نے اپنے مطالعہ میں پایا ہے کہ ادبِ اطفال سماجی علوم کے تنقیدی تصورات کی بہتر سمجھ میں واضح کردار ادا کرتا ہے۔محقق Davis & Palmer (1992)اور (2001) Donghue نے اپنے مطالعہ میں یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سماجی علوم کے تدریسی عمل میں جب اساتذہ بچوں کے ادب کا استعمال کرتے ہیں تو طلباء کے تنقیدی سوچ اور مسلہ کو حل کرنے کے ہنر میں نمایاں اضافہ ہوتا ہے۔چونکہ سماجی علوم کے اندر تاریخ کی تدریس کا مطلب صرف ماضی کے واقعات کا ذکر کرنا نہیں ہے بلکہ ان واقعات سے سبق لیکر موجودہ اور مستقبل کو کیسے بہتر بنایا جا سکتا ہے اس پر غور کرنا ہے۔ (1991) Fuhlerاور VanFossen (2003) جیسے محققوں نے پایا ہے کہ سماجی علوم کی تدریس میں ادبِ اطفال آموزگار کو ماضی اور حال کے واقعات کے ساتھ رشتہ قائم کرنے میں اور ان کو تاریخ کو وسیع طور پر سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ادبِ اطفال طلباء کو جغرافیائی علم اور علمِ معاشیات کو دلچسپ بنا کر اس کو بہتر سمجھنے میں مددگار ہوتا ہے۔بچوں کا ادب سماجی علوم کے طلباء کو ایک بہتر شہری بننے کے لیے اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔سماجی سروکاروں سے متعلق کہانیوں کا استعمال کر کے طلباء کے اندر ملک اور سماج میں ہونے والے واقعات کی بہتر فہم پیدا کی جا سکتی ہے جس سے کہ وہ ایک بہتر شہری کے کردار کو ادا کر سکیں۔مختلف قصے جو کہ سماج میں ہونے والے اقتصادی عمل کو بہتر سمجھا سکتے ہیں ان کے تدریسی عمل میں استعمال کرنے کی ضرورت ہے جس سے کے وہ عام زندگی میں ہونے والے معاملات سے واقف ہوں سکیں۔سماجی علوم کا ایک اور لازمی جز وسماجی اور ثقافتی اختلافات کی تعریف ہے۔یہاں ایک بار پھر، ادبِ اطفال طلباء کو کثیر الثقافتی تصورات کو سمجھنے میں مدد کرنے کا ایک طاقتور ذریعہ ہوسکتا ہے Pugh, Gracia, & Boada۔Margalef (1994)۔کثیر الثقافتی تجارتی کتابیں پڑھنے والے بچوں نے سماجی حساسیت اور مسائل کو متعدد زاویوں سے دیکھنے کی بہتر کوشش کی ہے۔

سماجی علوم کی تدریس میں ادبِ اطفال کے لیے متعلقہ مشورے:

جیسا کہ نیشنل فوکس گروپ کا پوزیشن پیپر برائے سماجی علوم کی تدریس نے اس بات پر غور کیا ہے کہ طالب علم کو تعاملی ماحول میں علم و ہنر کے حصول کے قابل بنانے کے لیے سماجی علوم کی تدریس میں

دوبارہ جان ڈالنے کی ضرورت ہے۔سماجی علوم میں ادبِ اطفال سے متعلق مندرجہ ذیل مشورے مفید ثابت ہوسکتی ہیں۔مختلف سطح پر متعلقہ ادبِ اطفال کو سماجی علوم کی تدریس میں شامل کیا جائے۔

اساتذہ کو مناسب وقفہ پر تربیتی پروگرام جیسے ورکشاپ وغیرہ میں شامل کرکے سماجی علوم میں بہتر طریقہ سے ادبِ اطفال کے استعمال کی تربیت دی جائے۔

سماجی علوم کی تدریس میں ادب اطفال کو شامل کرتے وقت بچوں کی نفسیاتی اور دلچسپیوں کا خاص خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔انفارمیشن اور کمیونیکشن ٹیکنالوجی کا استعمال کرکے ادب اطفال کا بہتر شمولیت سماجی علوم کی تدریس میں کیا جانا چاہیے۔

خلاصہ: اساتذہ کے پاس یہ موقع ہے کہ وہ اپنے طلباء کو بچوں کے ادب کی وسیع اقسام سے متعارف کرائیں،خاص کر ایسے وقت میں جبکہ عام تصور ہے کہ سماجی علوم غیر افادی ہے اور سماج میں ایسے خیال رائج ہیں کہ جو طلبا سائنس کا انتخاب کرتے ہیں وہ زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔اس لیے اساتذہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ طلبا کے اندر سماجی علوم کے تئیں مثبت خیال کو فروغ دیں اور ان کی دلچسپیوں میں اضافہ کرنے کی ترکیب پر غور کریں۔مزکورہ گفتگو کا نچوڑ یہی ہے کہ سماجی علوم کی تدریس میں ادب اطفال کا استعمال طلبا کے اندر سماجی علوم کے تئیں ان کی دلچسپیوں میں اضافہ کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

حوالہ جات:

Childs, J. L. (ND).

https://education.stateuniversity.com/pages/1829/Children-s-Literature.html

Davis, J. & Palmer, J. (1992). A strategy for using children’s literature to extend the social studies curriculum. The Social Studies, 83(3), 125-128.

Dhandhania, T. (ND). The importance of social studies in the school curriculum. Retrieved on 25th March 2022 from http//:www.progressiveteacher.in/

Donoghue, M. (2001). Using literature activities to teach content areas to emergent readers. Boston: Allyn & Bacon.

Findlay, D. (2002). Pages of the past: Exploring U.S. history through children’s literature. Fort Atkinson, Wisconsin: Upstart Books.

Fuhler, C. (1991). Add spark and sizzle to middle school social studies. The Social Studies, 82, 234-237.

Grenby, M. O. (2014). The origins of children's literature. Retrieved on 25th March 2022 from https//:www.bl.uk/

Iqbal, S. (2018) ادب اطفال،روایت اور مسائل (Urdu Research Journal, 16th Issue. http//:www.urdulinks.com/urj/?p=2552

Kothlow, K. D. (1993)"The integration of literature with kindergarten social studies".ThesesDigitizationProject.830. https//:scholarworks.lib.csusb.edu/etd-project/830

Krey D.M. (1998). Children's literature in social studies: Teaching to the standards. NCSS Bulletin 95, Washington, D.C.:National Council for the Social Studies.

Position Paper, National Focus Group on Teaching of Social Sciences (2006). National Council of Educational Research and Training. New Delhi

Pugh, S., Gracia, J. & Margalef-Boada, S. (1994) Multicultural tradebooks in the social studies classroom. The Social Studies, 5, 62-65

Sandmann, A. &Ahern, J. (2002). Linking literature with life. NCSS Bulletin 99, Washington, D.C.:National Council for the Social Studies.

Shiveley, J., & Helms, R. G. (2008). Using Children's Literature to Teach the Social Studies Ohio Academic Content Standards. Columbus, OH: The Ohio Council for Social Studies.

Smith, J. (1993). Content learning: A third reason for using literature in teaching reading. Reading Research and Instruction, 32(3), 64-71.

VanFossen, P. (2003). Best practice economic education for young children? It's elementary! Social Education, 67(2), 90-94.

☆☆☆

Azadi ke baad Urdu Novel mein Mauzuaat ka tanwwo by Raoof Ahmad Mir(research scholar,Dept.of urdu KMCLUniversity,Lucknow)
رؤف احمد میر (ریسرچ اسکالر شعبہ اردو، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ)

آزادی کے بعد اردو ناول میں موضوعات کا تنوع

برصغیر کی تاریخ میں ۱۹۴۷ء کا سال ایک ایسا المیہ ہے جہاں ایک طرف ہندوستان آزاد ہوا تو وہیں دوسری طرف دو حصوں میں منقسم ہوا۔ یہ تقسیم صرف ملکی سطح پر عمل میں نہیں آیا بلکہ تہذیب ،خاندان ،گھر بار یہاں تک کہ انسان کا وجود بھی تقسیم ہو گیا۔ ملک کی تقسیم نے ہندوستان کو بعض بھیانک حالات سے بھی دو چار کیا۔خون اور آگ کی ہولی کھیلی گئی۔ انسان انسان کے خون کا پیاسا ہو گیا۔تقسیم کا المیہ ہندو پاک کے سارے ادب خصوصاً اردو ادب میں زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے اس درد و کرب پر تمام ادیبوں نے لکھنا شروع کیا اور اس پورے المیے کا بھر پور اظہار اردو ادب میں واضح نظر آنے لگا۔اردو ادب کی تمام اصناف میں ناول ایک ایسی صنف ہے جس میں انفرادی اور داخلی کیفیت کے ساتھ ساتھ اجتماعی اور خارجی زندگی کے حقائق کی بھی مکمل تصویر پیش کی جاسکتی ہے۔تقسیم ہند کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں سیاسی ،سماجی ،معاشی اور تہذیبی سطح پر کچھ ایسی تبدیلیاں پیدا ہوئی جن کا براہ راست اثر ادب پر بالخصوص اردو ناول پر پڑا۔اس لیے دونوں ملکوں کے ناول نگاروں نے ایسے ناول لکھے جو معاشرے کی سیاسی ،سماجی ، مذہبی اخلاقی ،تہذیبی اور معاشرتی وغیرہ کی غرض سے پوری زندگی کے پہلوؤں کی نمائندگی کرے۔

آزادی کے بعد اردو ادب میں ناول نگاروں نے بٹوارہ ،فسادات ،ہجرت ،سیاست اور احتجاج ،جاگیردارانہ زوال ،نفسیات اور جنس ،خواتین و نسلی مسائل ،علاقائی اور عالمی جنگ ،انسانوں کا قتل ،ملک کی تباہی و بربادی اور خوف زدگی وغیرہ جیسے موضوعات پر ناول لکھے۔آزادی کے بعد جن ناول نگاروں نے ناول تخلیق کئے ہیں ان میں عزیز احمد ،کرشن چندر،عصمت چغتائی ،رامانند ساگر ،احسن فاروقی ،قرۃ العین حیدر ،شوکت صدیقی ،جمیلہ ہاشمی ،خدیجہ مستور ،عبداللہ حسین ،قاضی عبدالستار وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ترقی پسند تحریک کے بعد ایک بڑے ناول نگار کی حیثیت سے سب سے پہلا اور معتبر نام قرۃ العین حیدر کا آتا ہے۔ان کے یہاں ناول کی فنی روایات کا حسین اور باشعور

احترام ملتا ہے۔انہوں نے ناول نگاری کی فنی روایت کو نہ صرف مستحکم کیا بلکہ بہت آگے بڑھایا ہے۔ ان کی تخلیقات نئی تکنیک،تازہ کاری اوراپنے تہذیبی پس منظر کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔انہوں نے افسانے،ناول،رپورتاژ،مضامین،انگریزی نظمیں لکھیں اور ترجمے بھی کیے۔انہوں اردو ناول نگاری کو براہ راست فکشن کے جدید ہیتی تجربوں سے روشناس کرایا۔

قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں میرے بھی صنم خانے،سفینہ غم دل،آگ کا دریا،آخر شب کے ہمسفر،کار جہاں دراز ہے،گردش رنگ چمن اور چاندنی بیگم شامل ہیں۔''آگ کا دریا''ان کا شاہکار ناول ہے جو قابل ذکر ناول ہے۔''آگ کا دریا''قرۃ العین حیدر کا شاہکار اور ضخیم ناول''آگ کا دریا''۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔اس ناول میں ڈھائی ہزار سالہ تہذیب کے پس منظر میں برصغیر کے تہذیب وتمدن،تاریخ وفلسفہ اور رسم و رواج کی تصویر کشی کی گئی ہے۔آگ کا دریا کی کہانی بدھ مت کے عروج اور برہمن واد کے زوال سے شروع ہوتی ہے۔''آگ کا دریا''کے موضوع پر ناقدین کی الگ الگ رائے ہیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا موضوع ہندوستان کی آبادی کے ایک طبقے کی داستان ہے اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا موضوع انسانی وجود یا وقت ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس ناول کا اصل موضوع ہندوستان کی تہذیب تاریخ ہے۔جو عہد بہ عہد تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

عزیز احمد اردو فکشن کا ایک معتبر نام ہے ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں انھوں نے اردو میں کئی اہم ناول اور افسانے لکھا ہے اردو ناول نگاری کی تاریخ میں وہ ایک ترقی پسند ناول نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں انہوں نے کئی ناول تخلیق کیے ہیں جن میں''مرمر اور خون''،''آگ''،''گریز''،''ایسی بلندی ایسی پستی''اور''شبنم''وغیرہ ناول تخلیق کیے ہیں۔عزیز احمد کا ناول''ایسی بلندی ایسی پستی''اردو ادب کا اہم ناول ہے۔اس ناول میں انہوں نے حیدرآباد کی اعلی سوسائٹی اور جاگیردارانہ طبقے اور امراء کی معاشرت کا خاکہ پیش کیا ہے۔بعض مصنفین اسے تاریخی ناول تسلیم کرتے ہیں جن میں یوسف سرمست کا نام اہم ہیں ان کا خیال ہے:

''تمدنی اور وتہذیبی پس منظر اور حقیقی سماجی حالت کو پیش کر کے عزیز احمد نے اپنے ناول کو تاریخ بنا دیا ہے۔'' (بیسویں صدی میں اردو ناول: ڈاکٹر یوسف سرمست،ص ۴۷۳)

ترقی پسند ناول نگار کی حیثیت سے کرشن چندر کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے ان کے ناولوں میں ان کے عہد کے مختلف سماجی،سیاسی اور اقتصادی مسائل کا عکس اور اس کا تصور دیکھنے کو ملتا ہے۔کرشن چندر عوام دوست اور مظلوموں کے مسیحا اور ظلم و ناانصافی اور استحصال کے کٹر دشمن تھے۔کرشن چندر نے کہی

ناول تخلیق کیے ہیں جن میں شکست ، جب کھیت جاگے، ایک گدھے کی سرگزشت ،سڑک واپس جاتی ہے، میری یادوں کے چنار، طوفان کی کلیاں ،گدھے کی واپسی، ایک عورت ہزار دیوانے ،فٹ پاتھ کے فرشتے خاص اہم مانے جاتے ہیں۔

''ایک گدھے کی سرگزشت'' کرشن چندر کا ایک طنزیہ شاہکار ناول ہے۔ناول میں اپنے عہد کے سماجی ،سیاسی ،معاشرتی اور ثقافتی پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ایک گدھے کی سرگزشت میں ملکی سیاست، انتظامیہ، دفتری نظام، طبقہ اعلی، تعلیم یافتہ افراد سیٹھوں، اخبار نویسوں اور ادیبوں کی صورتحال کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ڈاکٹر محمد حسن اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں:

''طنز کے سارے آداب ولوازم کو ملحوظ رکھنے کے بعد بھی عصری زندگی کی پیچیدگی اور رنگارنگی کو کرشن چندر نے اس ناول میں بڑی خوبی سے سمویا ہے۔"

(جدید اردو ادب: ڈاکٹر محمد حسن، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۷۵ء، ص ۵۷)

اس ناول کا مرکزی کردار ایک گدھا ہے جسے کرشن چندر نے ایک پسماندہ اور محنت کش مزدور کے استفادہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ جو ساری تہذیب کا بوجھ اٹھاتا ہے۔لیکن اس کی ذات تہذیب اور شعور سے بیگانہ اور عاری سمجھی جاتی ہے۔جدید اردو فکشن جس کی بنیاد ترقی پسند تحریک کے زیر اثر پڑی۔اس کے تحت لکھنے والوں میں عصمت چغتائی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔عصمت چغتائی نے اپنے ناولوں میں مسلم متوسط گھرانے کی لڑکیوں کی نفسیاتی الجھنوں ، بے جوڑ شادی کے نتائج، شادی شدہ زندگی کے مسائل، جنسی تعلقات، اعلیٰ سوسائٹی کے مردوں کی بدکرداری، عورتوں کی آزاد خیالی ،عورتوں کی نابرابری اور بے انصافی وغیرہ جیسے موضوعات کو پیش کیا ہے۔جنس ان کا پسندیدہ موضوع ہے اور اس پر انہوں نے بے خوفی سے لکھا ہے ۔عصمت چغتائی نے کئی ناول لکھے جن کے نام ہیں۔ضدی، ٹیڑھی لکیر، معصومہ، سودائی، دل کی دنیا، عجیب آدمی، جنگلی کبوتر، تین اناڑی اور ایک قطرۂ خون وغیرہ شامل ہیں۔عصمت چغتائی کا ناول ''معصومہ'' 1961ء میں منظر عام پر آیا یہ 128 صفحات پر مشتمل ہے۔ ''معصومہ'' میں معصومہ کے کردار کے ذریعے سارے سماج کی عورتوں کی نفسیاتی زندگی کو پیش کیا ہے۔اس میں عصمت نے ایک معصوم لڑکی کی تباہی کی داستان کو دکھایا ہے۔

اس طرح آزادی کے بعد بہت سارے ناول لکھے گئے ہیں۔ان تمام ناول نگاروں کو شامل نہیں کر سکا۔اس کا ہرگز یہ نہیں کہ وہ ناول نگار کم اہمیت کے حامل ہیں۔

☆☆☆

Ekkisween Sadi mein Urdu Afsana: Deepak Budki ke Hawale se by

Dr.Mohammad Amin Najar(Annantnag,J&K) cell-7006028384

ڈاکٹر محمد امین نجار (اننت ناگ، جموں و کشمیر)

اکیسویں صدی میں اُردو افسانہ: دیپک بدکی کے حوالے سے

عام طور پر اکیسویں صدی کو ناقدینِ ادب نے فکشن کی صدی قرار دیا ہے۔ کیوں کہ اس صدی میں فردِ واحد کی اہمیت، افادیت وانفرادیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے بعد اُردو افسانہ نئے تجربوں کے ساتھ قاری سے روبرو ہوا۔ اس دور کے افسانہ نگاروں نے عام روش سے ہٹ کر انسان کی زندگی میں دخل اندازی کر کے اُسے صفحۂ قرطاس کی زینت بنا کر افسانے کی شکل عطا کی۔ قاری کا تجسس اور دلچسپی ان افسانوں میں بڑھنے لگی۔ اُردو افسانہ بھی پریم چند سے لے کر نئے لکھنے والوں تک تقریباً ایک صدی کا سفر مکمل کر لیتا ہے۔

اکیسویں صدی میں جن لکھنے والوں نے اپنے نام، کام اور مقام سے اُردو افسانے کو نئی سمت وجہت عطا کی ان میں صغیر رحمانی، یوسف عارفی، خورشید جبین، پروفیسر ابن کنول، طارق چھتاری، شموئل احمد، سلام بن رزاق، احمد رشید، کہکشاں انجم، عابد ضمیر، مشرف عالم ذوقی، انیس رفیع، عبدالصمد، اختر آزاد، حنیف سید، شاہین سلطانہ، ترنم ریاض، اسرار گاندھی، ساجد رشید، مبین مرزا، اقبال حسن آزاد، نعیم کوثر، عابد سہیل، غضنفر، رشید امجد، صغیر ابراہیم، کیول دھیر، خالد جاوید، طاہر نقوی، مشتاق احمد وانی، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، جیلانی بانو، شوکت حیات، فرقان سنبھلی اور دیپک بدکی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ اس افسانوی کہکشاں میں زیادہ تر افسانہ نگار گذشتہ صدی سے لے کر رواں صدی میں بھی اپنے قلم کے سحر سے قاری کو باندھے ہوئے ہیں۔ لیکن میں جس افسانہ نگار کا یہاں میں پر ذکر کروں گا وہ ہیں دیپک بدکی۔

مابعد جدید افسانہ نگاروں میں دیپک بدکی کا نام کافی اہمیت کا حامل ہے۔ ۱۵/ فروری ۱۹۵۰ء کو سری نگر میں پیدا ہوئے۔ کشمیر یونیورسٹی سے بی۔ ایڈ اور ایم۔ ایس سی (بوٹنی) حاصل کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملازمت کے سلسلے میں کئی شہروں کی سیاحت کی اور فکشن رائٹنگ کے لئے مواد اکٹھا کرتے رہے۔ ستر (۷۰) کی دہائی میں افسانہ نویسی شروع کی مگر کچھ سال بعد ہی تخلیقی تعطل کا

شکار ہوئے۔ پھر ۱۹۹۶ء سے دوبارہ لکھنا شروع کیا۔ان کے افسانوں کے چھ مجموعے اور افسانچوں کا ایک مجموعہ اور تنقید کی چار کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔دیپک بدکی اُردو معاصر افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ہے۔سرزمین کشمیر سے تعلق رکھنے والے دیپک بدکی کا شمار کشمیر کے سرفہرست افسانہ نگار اور ملک کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔دیپک صاحب کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اُردو افسانوں سے علامت، ابہام اور تجریدیت کے غلبے کو کم کر کے پھر سے اس میں کہانی پن پیدا کیا اور اس کو قاری سے نزدیک کیا۔ان کے افسانوں پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان کے افسانوں میں ایک جہاں آباد ہے، بالکل ایسے ہی جیسے کہ ہم اس عالم آب وگل میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ان کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے ہمیں بالکل اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ان کے کردا ہماری اسی دنیا سے ماخوذ ہیں جس سے ہمارا دن رات کا واسطہ ہے۔ان کے افسانوں میں بدلتے ہوئے حالات کو دیکھا جاسکتا ہے، چاہے وہ بدلتے ہوئے حالات، تہذیب وثقافت اور ذہنی وفکری تبدیلیوں کے لحاظ سے ہوں یا افسانوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے۔

دیپک بدکی کے مجموعوں میں شامل کہانیاں اکثر وبیشتر کشمیر کی کہانیاں ہیں کیوں کہ ان کے بچپن، لڑکپن اور جوانی کا بیشتر حصہ اسی وادی میں گزرا ہے۔اس لئے اس علاقے کی ملی جلی تہذیب ،اس کے رنگارنگ قدرتی مناظر، شعروادب کی اعلیٰ روایات اور پرسکون ماحول سے ان کا جذباتی رشتہ ہمیشہ قائم رہا جس کا بیان ان کے افسانوں 'اچانک، آؤ کچھ اور لکھیں، پہاڑوں کا رومانس، اداس لمحوں کا کرب، جزیرے پیار کے، ویوگ، ٹرنڈ اور طلسمی عینک میں ملتا ہے۔البتہ آج معاملہ بالکل برعکس ہے۔کل تک جس جنت کی فضائیں روحانی مہک سے معطر تھیں، دیکھتے ہی دیکھتے اس جنت میں گولیوں اور دھماکوں کی گن گرج سنائی دینے لگی۔ہر طرف چیخ وپکار، افراتفری، تباہی، بربادی کا سلسلہ پھیلتا گیا۔انسانی خون پانی کی طرح بہنے لگا۔پوری وادی عملی طور پر جنگ کے میدان میں یک دم تبدیل ہوگئی۔چھاپے، گرفتاریاں، کریک ڈاون، کراس فائیرنگ، گرنیڈ حملے اور بم دھماکے کشمیر کا مقدر بن گئے۔ان کے افسانوں میں وہ کشمیر بھی نظر آتا ہے جو تہذیب وتمدن کا گہوارہ تھا۔امن وسکون اور سکھ چین کے لئے دنیا بھر میں مشہور تھا۔وہاں کے لوگوں میں ایک دوسرے کے لئے ہمدردی، پیار محبت اور میل ملاپ ہوا کرتا تھا۔دوسری طرف دیپک بدکی کے افسانوں میں وہ کشمیر بھی نظر آتا ہے جس کی مٹی سے سوندھی سوندھی خوشبو کی بجائے بارود کی بو آتی ہے۔انہوں نے جس ہنر مندی سے ان چیزوں کو محسوس کیا ہے وہ قابل فخر ہے۔بقول پریم ناتھ پردیسی:

''کشمیر کا ہر بدنصیب باشندہ بذات خود ایک افسانہ ہے جس کی طرف آج تک کسی نے توجہ نہیں دی۔''
(دیپک بدکی،عصری شعور،ص۔۱۴)

ان کے افسانوں میں صبح کی بادِ نسیم، دوپہر کی تپتی ہوئی دھوپ اور شام کی دھندلی سیاہی کا بیان ان کے افسانوں میں ملتا ہے۔دیپک بدکی نے کشمیر کے برف پوش پہاڑوں، گھنے جنگلوں، سرسبز میدانوں اور چشموں کی بہتریرین تصویر کشی کی ہے۔افسانہ'پہاڑوں کا رومانس'' میں کشمیر کی منظر کشی اس طرح کی ہے:

''کشمیر کی وادی پہاڑوں کی شہزادی ہے۔آسمان سے باتیں کرتے ہوئی نیلے برفانی پہاڑ، چیڑ اور صنوبر سے ڈھکے ہوئے لامحدود جنگل،لہروں کے مضراب سے ساز بجاتی ہوئی ندیاں اور اندردھنش کے رنگوں سے سجی ہوئے پھولوں کے تختے عروس لالہ زار کے گہنے لگتے ہیں۔''
(دیپک بدکی۔افسانہ'پہاڑوں کا رومانس،ص۔۲۳)

کشمیری لوگوں کی برس ہا برس سے چلی آرہی رواداری اور رحم دلی پر مشہور افسانہ نگار وریندر پٹواری رقم طراز ہیں:

''کشمیری عوام عام طور کسی کو بھی جان سے نہیں مار سکتے۔اس لئے سوچ سمجھ و عمل پر صوفی سنتوں کا اثر ہے۔اس لئے عام (طور) پر عام چوہے کو پھندے سے آزاد کر کے دریا میں ڈالا جاتا ہے۔چوہا کبھی ادھر کبھی ادھر تر تار ہتا ہے۔''(دیپک بدکی،عصری شعور،ص۔۲۰)

دیپک بدکی کے افسانوں میں کشمیر کی مظلوم عوام پر ہونے والے ظلم وستم کا ذکر ملتا ہے۔اس کی زندہ مثال ان کے افسانے''مخبر''،''معصوم علی''،''ریزہ ریزہ حیات''ایک نہتے مکان کا ریپ، چنار کے پنجے، سفید کراس، وفادار کتا، گھونسلا، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی، حرص گناہ، کاگ پورنیما اور اب میں وہاں نہیں رہتا وغیرہ ہیں۔افسانہ'مخبر'میں دو ہتھیار بند نوجوان عمر رسیدہ، معذور اور بے قصور میاں بیوی کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں جبکہ دوسرے روز ایک سوچی سمجھی حکمت عملی کے تحت اس خبر کو توڑ مروڑ کر مقامی اخباروں میں نمایاں طور پر یوں چھپوایا جاتا ہے۔

''حبہ کدل میں مجاہدوں نے نیل کنٹھ اور ارن دتی نامی دو مخبروں کو ہلاک کر دیا۔ان پر شبہ تھا کہ وہ فوج کے سراغ رساں ایجنسی کے لئے سرگرم عمل تھے۔''(دیپک بدکی، چنار کے پنجے،ص۔۸۱)

ریاست میں شر پسند عناصر نے جو بارود بچھایا ہے اور جو لوگ اس آگ کی چپیٹ میں زخمی ہوئے ہیں ان کے درد سے بھی بدکی بے خبر نہیں ہے۔اس درد کو افسانہ نگار نے بڑی شدت سے محسوس

کیا ہے۔'حرص گناہ' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''چاروں جانب دہشت پھیلی ہوئی ہے، آدمی ہتھیلی پر جان لیے پھرتا ہے، سڑکوں پر موت کے سائے منڈلاتے ہیں۔ راہزنوں کے ہاتھ میں بندوقیں ہیں اور راہبروں کے ہاتھوں میں بھی، دونوں میں فرق کرنا مشکل ہو رہا ہے، دن چھوٹے اور راتیں لمبی ہو چکی ہیں، خوش رنگ خوابوں کی جگہ ڈراونی خوابوں نے لے رکھی ہے۔'' (دیپک بدکی۔ افسانہ'حرص گناہ'، ص۔ ۱۲۵)

دیپک بدکی کے افسانے'طلسمی عینک'، 'کاگ پورنیا'، 'یونین لیڈر'، 'ڈاک ہاوس' خالص کشمیر رنگ کہانیاں ہیں۔ انہوں نے ان تمام حالات کا جائزہ لیا تھا جو کشمیر میں کشمیری پنڈتوں کا مقدر بن گیا تھا۔ انہوں نے بعض کہانیوں میں اُس روایتی بھائی چارے اور امن وآشتی کو بھی یاد کیا جو صدیوں سے کشمیر میں چلا آ رہا تھا لیکن جس کا عکس اب دور دور تک نظر نہیں آتا ہے۔ شدید جذبات کا تاثر دیپک بدکی کے اس چھوٹے مگر معنی خیز اقتباس میں نظر آتا ہے۔ اپنے افسانوں کے مجموعے ''روح کا کرب'' میں لکھتے ہیں:

''میں سن ۲۰۱۰ء میں نوکری سے سبکدوش ہوا۔ ایسا لگتا ہے جیسے زندگی کی گاڑی خطرناک ٹریفک جام میں پھنس چکی ہے۔ نہ آگے بڑھتی ہے اور نہ پیچھے ہٹ پاتی ہے۔ ممکن ہے اگر میں کشمیر میں اقامت پذیر ہوتا اور جبری ہجرت کا شکار نہ ہوا ہوتا شاید ایسے حالات سے دوچار نہ ہونا پڑتا۔

(روح کا کرب۔ ص۱۱)

دیپک بُدکی نے سماج، سیاست اور اقتصادی حالات پر کئی افسانے لکھے ہیں۔ نفسیات کے حوالے سے بھی کئی افسانے ملتے ہیں۔ وہ آگے کی سوچتے ہیں اور قدامت پرستی و روایتی رویے کے خلاف ہیں۔ ثبوت کے لیے ان کے افسانے جاگو، ادھورے چہرے، اماں، احتجاج، سپنوں کا شہر ادھوری کہانی، معصوم علی، کئی گاندھی اور، سرحدیں، شیر اور بکرا، موت کے سوداگر، بُدھ کی مسکراہٹ، ٹکڑوں میں بٹی زندگی، ڈاگ ہاؤس، طفیلی بیل، بےنسب ورثے کا وجود، یوم حساب اور ایک انقلابی کا اعتراف پیش کیے جاتے ہیں۔

عشقیہ کہانیاں بھی دیپک بُدکی نے تحریر کی ہیں جن میں سے چند ایک کے نام یہاں درج کر رہا ہوں؛ کالا گلاب، بکھرے لمحوں کا سراب، ریزے، راکھ کا ڈھیر، پہاڑوں کا رومانس، یادوں کی مہک، وفا کی خوشبو اور افلاس کا کوڑھ) دیپک بدکی افسانہ نگار نے دیگر موضوعات کے ساتھ جنس کے موضوع پر بھی کئی کہانیاں لکھی ہیں جن میں 'ڈرفٹ وڈ'، 'ادھ کھلی'، 'بٹی ہوئی عورت'، مانگے کا

اجالا، چڑی کی بیگم، مغرور لڑکی، ٹھنڈی آگ، آغوش ہوس اور نہ جانے کتنے افسانے ہیں جن میں یہ صورت نمایاں ہے۔'ڈرفٹ وڑ' ایک الگ ذائقے کی کہانی ہے جو انسانی نفسیات کی داخلی کیفیت پر مبنی ہے۔جنس کا موضوع ہمارے ذہنوں پر آتے ہی مرد عورت کے ناجائز تعلقات کا خاکہ تیار ہوتا ہے اور ذہن میں کوئی خاص جستجو پیدا نہیں ہوتی لیکن جنس کا عمل کسی ایسے پاک رشتے میں مضبوط ہوجائے جن کی جانب ذہن مائل نہ ہوتا طبیعت میں بھونچال آجاتا ہے۔اس کہانی میں کرنل کول اپنی بیٹی سے رشتے استوار کرتا ہے جس کا اسے احساس ہی نہیں ہوتا بلکہ غیر شعوری طور پر یہ عمل انجام تک پہنچتا ہے۔افسانے کا اقتباس درجہ ذیل ہے:

''سمن کا ردعمل کچھ عجیب سا تھا۔ایسی صورت میں عام طور پر لڑکیاں اپنے آپ سے حقارت کرتی ہیں اور پستی کی گہرائیوں میں گر جاتی ہیں مگر وہ اپنے مغموم دل کو قہقہوں کے پھاہے لگاتی رہی۔جسمانی قربتوں سے اپنے مضروب روح کو جھوٹی تسلیاں دیتی رہی اور مردوں کو آلہ کار بنا کر اپنی زندگی ہموار کرتی چلی گئی۔'' (دیپک بدکی، افسانہ ڈرافٹ وڑ،ص)

ماڈل بننے کی خواہش نے اسے کئی لوگوں کے بستر گرم کرنے پر مجبور کیا لیکن نتیجہ لا حاصل رہا۔اس افسانے میں دیپک بدکی نے ایک باپ کی جنسی ناآسودگی کی جانب اشارہ کیا ہے اور بیٹی کی بے راہ روی کی جانب بھی، جس کا سہرا باپ کے ہی سر جاتا ہے۔دیپک بدکی کے افسانوں میں نہ صرف عورتوں کے استحصال کی گھناونی (نفرت) مرقع کشی ملتی ہے بلکہ انہوں نے جنس کو انسان کی جبلّت کے لازمی عنصر کی صورت میں پیش کیا ہے۔افسانہ 'گھر کا بیدی'، 'چڑی کی بیگم'، 'مغرور لڑکی'، 'پہاڑوں کا رومانس' اور آغوش ہوس وغیرہ جیسے افسانوں میں دیپک بدکی نے انسان کی جنسی خصلت کو اس کی فطری حالت میں پیش کیا ہے۔'آغوش ہوس' کی مایا دو ہزار روپے کے لئے اپنا جسم بیچنے آتی ہے۔اسی طرح ''گھر کا بیدی' جس میں ایک عورت اپنے شوہر کے سگے بھائی سے تعلق پیدا کر کے دوستی اور اعتمادی کے ٹکڑے ٹکڑے کرتی ہے۔

دیپک بدکی کے اکثر افسانوں میں عورت بطور مرکزی کردار ابھر آتی ہے۔چنانچہ افسانہ نگار نوکری کی وجہ سے ملک کے مختلف مقامات پر تعینات رہے اس لیے ان کے نسوانی کرداروں میں تہذیبی، ثقافتی اور شعوری گونا گونیت ملتی ہے۔وہ خواتین کے کرداروں کو ان کے حقیقی روپ میں پیش کرتے ہیں۔ساتھ ہی وہ ایک حقیقت پسند آرٹسٹ کی طرح ان کا پس منظر بھی اپنے کینواس پر اتارتے ہیں۔جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ دیپک بدکی کے نسوانی کرداروں میں جغرافیائی اور ثقافتی

لحاظ سے کافی رنگارنگی ملتی ہے۔کہیں وہ روائتی معاشرے میں پل رہی طلاق شدہ حمیدہ کی بے بسی کی پُر درد تصویر کھینچتے ہیں (اداس لمحوں کا کرب) ۔کہیں وہ خواتین کی قربانی اور ایثار کو بیان کرتے ہیں (خودکشی) اور کہیں نسوانی بے راہ روی کی منظر نگاری کرتے ہیں (دشت وحشت) کہیں دم توڑتی ہوئی رجنی اپنے ڈاکٹر محبوب کو ڈاکٹری کے فرائض یاد دلاتی ہے (ایک ہی خط) اور کہیں ڈاکٹر کملا دیوی اپنے فرائض کو ترجیح دے کر مالی منعفت کو ہیچ کہتی ہے۔ڈاکٹر آنٹی آج کے حالات، آج کی فیشن پرستی اور آزادیٔ نسواں کی کہانی ہے۔آج ہر ڈاکٹر اپنی تجوری کو بھرنے کے لئے قانون، انسانیت اور قدرت کو طاق میں رکھ کر روپئے بٹورنے میں لگا ہوا ہے لیکن ڈاکٹر آنٹی ایک سخت اصول پسند اور ایماندار ڈاکٹر ہے۔غرض یہ کہ دیپک بدکی کے افسانے ایک کہکشاں کی مانند اپنے اندر بہت سارے نسوانی کردار سموئے ہوئے ہیں۔افسانہ 'ڈاکٹر آنٹی' کا یہ ایک جملہ ان کے کردار کو بیان کرنے کے لیے کافی ہے:۔

''سی دس گرل۔۔۔۔!ابھی اسکول چھوڑ بھی نہیں ہے کہ پیٹ میں بچہ لیے گھوم رہی ہے اور پھر روپئے کا لالچ دے رہی ہے۔جیسے روپیوں سے سب کچھ خرید اجاسکتا ہے۔''

(دیپک بدکی، افسانہ اکٹر آنٹی، ص)

افسانہ نگار کا اندازِ تحریر بے حد دلچسپ ہے۔ان کے افسانے ذاتی تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہے۔زبان پر انہیں قدرت حاصل ہے اور اسلوب میں کوئی پیچ وخم نہیں ا(ندرت اور انفرادیت نظر آتی ہے۔افسانہ دریا کی روانگی کی طرح اپنا سنگیت بکھرتا (بکھیرتا) آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔دیپک بدکی کے افسانوں میں ان کے مزاج اور فکر وسوچ اور مزاج کرنے کا کے انداز پر روشنی پڑتی ہے۔یہی سبب ہے کہ ان کے افسانے موجودہ رویوں اور معاشرے کی برہنہ سچائیوں کا احاطہ کرنے میں نڈر اور بے باک حقیقت کا مظہر ہیں۔

مجموعہ طور پر دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ دیپک بُدکی عہد حاضر کی ایک اہم اور دور اندیش آواز ہے جو انسانی معاشرے کے سماجی، سیاسی اور معاشی پہلوؤں اور نفسیات پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔

☆☆☆

Hindustan mein Farsi Zaban-o-Adab ka Mukhtasar Khaka by Dr.Ghulam Abbas(Dept.of Persian,Higher Education Govt.of Jammu&Kashmir)cell-9906262318

ڈاکٹر غلام عباس (شعبۂ فارسی، محکمہ اعلیٰ تعلیم، گورنمنٹ جموں وکشمیر)

ہندوستان میں فارسی زبان وادب کا مختصراً جائزہ

هند و ایران برادران همند — زبدۂ نسل آریا و جمند

آن یکی شیر و آن دگر خورشید — نز دم مردم بہ راستی علمند

پارس شیراست وهندخورشیداست — پشت بر پشت پاسدار همند (ازقصیدہ بہارؔ)

بہارؔ کے ان اشعار کا مطالعہ کرنے سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب وتمدن کے حامل ایشیاء کے دو عظیم ممالک ہندوستان اور ایران کے درمیان تعلقات بہت قدیم ہیں۔آثار قدیمہ کے ماہرین کی تحقیقات کے مطابق تو یہ روابط آریائی تمدن سے پہلے بھی قائم تھے۔دراصل ان دو ممالک کے تعلقات کی تاریخ تو اتنی قدیم ہے جتنے قدیم خود یہ ممالک ہیں۔

رگ وید میں ایران اور اوستا میں ہندوستان کے بارے میں اشارات ملتے ہیں۔سنسکرت اور ایران قدیم کی زبانوں میں ایک طرح کی مشابہت نظر آتی ہے۔قرون وسطیٰ میں جب فارسی زبان نے ہندوستان میں سرکاری زبان کی حیثیت حاصل کر لی اور دانشور طبقے نے اس کو اپنے افکار وخیالات کے اظہار کا وسیلہ بنایا تو تب ان ممالک کے دوستانہ تعلقات اور زیادہ قوی اور مستحکم ہوگئے۔اس کے علاوہ ان دو ممالک کے علمی روابط استوار ہونے کا ذریعہ متعدد ہندوستانی کتابوں بالخصوص سنسکرت زبان میں لکھی گئیں کتابوں کے فارسی تراجم بنے۔لیکن جہاں تک فارسی زبان کی ہندوستان میں آمد کا تعلق ہے تو وہ مسلمانوں کے ساتھ ہی یہاں آئی۔گویا اس شیریں زبان کو ہندوستان میں داخل کرنے اور پھیلانے کی سعادت غزنویوں کو نصیب ہوئی۔ہندوستان میں غزنویوں نے اپنا پہلا حملہ ۳۲۹ھ/۹۷۹ء میں کیا اور پشاور پر قبضہ کرلیا۔غزنویوں کی معرکہ آرائی کا یہ سلسلہ جاری رہا بالآخرانہوں نے سرحد اور پنجاب کا علاقہ اپنی سلطنت کا حصہ بنالیا۔لاہور غزنویوں کے ہندوستانی مقبوضات کا صدر مقام بنا اس طرح پنجاب کا یہ اہم تاریخی شہر فارسی زبان کا ابتدائی مرکز بن کر ابھرا۔

غزنی سے لاہور کے لیے سپہ سالار یا نائب مقرر ہو کر آتے رہے لیکن جب سلاجقہ اور

غوریوں نے غزنویوں کوغزنی چھوڑنے پر مجبور کیا تو ان کے آخری بادشاہ خسرو ملک کے مراسم تاجپوشی بھی لاہورہی میں انجام پائے۔ بالآخر شہاب الدین محمد غوری کے ہاتھوں غزنویوں کے اقتدار کا خاتمہ ہوگیا۔ ایک طرف اگرغزنویوں کے ہندوستان پر متعدد حملوں سے ہندوستان کو مالی اعتبار سے کافی نقصان کا سامنا کرنا پڑا لیکن فارسی جیسی شیریں زبان کا ہندوستانیوں کو ملنے کا سبب بھی تو غزنویوں کی یہی یلغاریں بنیں۔ یہ کہنے میں، میں حق بجانب ہوں گا کہ ہندوستانی فارسی ادب ہندوستان کی مشترکہ تہذیب وتمدن کا بنیادی سرچشمہ ہے۔ فارسی زبان میں تصوف کی پہلی مایہ ناز تصنیف ''کشف المحجوب'' سید علی ہجویری معروف بہ داتا گنج بخش نے اسی دور میں تالیف فرمائی۔ یہ کتاب صوفیاء کے اعلیٰ افکاراور تصوف کے جزئیات کی شرح وتوضیح میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب کو جہاں ہندوستان میں پہلی فارسی نثری کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے وہیں اس کتاب کو صوفیانہ ادب کی بنیادی کتاب ہونے کا بلند مقام بھی حاصل ہے۔ اس دور کے اہم شعراء میں عبداللہ النکتی، ابوالفرج رونیؔ، اور مسعود سعد سلمان کا نام لیا جاتا ہے۔

غوری سلاطین کا دورحکومت اس نقطہ نظر سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس دور میں ایران سے صوفی مشائخ نے ہندوستان کا رُخ کیا۔ ان صوفیاء نے اسی دور میں تبلیغ واصلاح کا وہ کام شروع کیا جس کے اثرات نہ صرف ہمارے سماج پر بلکہ فارسی ادب پر بھی نہایت گہرے پڑے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ۵۵۶ھ/۱۱۶۱ء میں ایران سے ہندوستان تشریف لائے اور اجمیر میں قیام کیا۔ اجمیر میں آپ کا مزار مبارک آج لاکھوں انسانوں کا مرجع ہے۔ اسی دور میں دہلی ہندوستان کا سیاسی، علمی اور ادبی مرکز بن گئی۔ اس دور کی اہم ترین تاریخ ''طبقات ناصری'' ہے جسے منہاج سراج نے تالیف کیا۔ فارسی زبان کا پہلا اہم تذکرہ ''لباب الالباب'' بھی ہندوستان میں ہی عوفی نے تالیف کیا۔ اس کے علاوہ ''جوامع الحکایات'' بھی لکھی گئی جو ادبی، سماجی، تاریخی اور سیاسی اعتبار سے ایک قابل توجہ کتاب ہے۔

عہد خلجی وتغلق میں امیر خسرو دہلوی بڑی آب وتاب کے ساتھ ہندوستانی فارسی شاعری کے اُفق پر نمودار ہوئے۔ حضرت امیر خسرؔو دہلوی ہندوستان کے ایک مشہور فارسی غزل گو شاعر تھے جنھیں ''طوطی ہند'' کا لقب حاصل تھا۔ اُن کے والد سیف الدین محمود ترکستان کے شہر کش کے ایک رئیس آدمی تھے۔ چنگیز خان کا جب فتنہ وفساد اٹھا تو سیف الدین ہجرت کرکے ہندوستان آگئے اور یہیں امیر خسرو ۶۵۱ھ/ ۱۲۵۳ء میں بمقام پٹیالی میں پیدا ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق جب

امیر خسروؒ پیدا ہوئے تو اُن کو ایک خرقہ میں لپیٹ کر ایک مجذوب کے پاس لے گئے۔ مجذوب نے بچہ کو دیکھتے ہی فرمایا:

''آودے کسی را کہ دہ قدم از خاقانی پیش خواہد بود۔''

امیر خسرو پر بچپن سے ہی شعروشاعری کی دُھن سوار تھی۔ اپنے دیوان ''تحفۃ الصغر'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ ایک دن میرے اُستاد نے خود عزیز الدین کے ذریعہ میرا امتحان لیا جو اپنے زمانے کے مشہور صوفی شاعر تھے۔ انھوں نے چار بے جوڑ چیزوں کا نام لیا (مو، بیضہ، تیر، خربزہ) اور کہا ان کو ملا کر شعر کہو۔ میں نے نہایت خوش الحانی کے ساتھ برجستہ کہا:

ہر موی کہ در دو زلف آں صنم است — صد بیضہ عنبرین برآں موئے صنم است

چوں تیر بداں راست دلش راز یرا کہ — چو خربزہ دندانش درون شکم است

حضرت نظام الدین نے خسرو کے بارے میں یہ مشہور فقرہ کہا تھا:

''الٰہی برسوز سینۂ این ترک مرا بہ بخش''

جان زتن بردی ودر مانی ہنوز — دردھا دادی ودر مانی ہنوز (خسروؔ)

سیّدوں اور لودھیوں کے دور میں ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں خود مختار حکومتیں قائم ہوگئی تھیں۔ اس لیے سلطنت دہلی کا شیرازہ بکھر گیا اور فارسی زبان وادب کو وہ پہلی جیسی رونق حاصل نہ رہی۔ ہندوستان میں مغلوں کے زمانے میں فارسی زبان وادب میں ایک بار پھر سے رونق پیدا ہوئی۔ آگرہ اور دہلی کو ادبی مراکز کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ شعراء ادبا اور دیگر ہنرمند لوگ کثیر تعداد میں ایران سے ہندوستان منتقل ہوئے۔ یہاں آکر انھوں نے اپنے مخصوص میدانوں میں جوہر دکھائے، کتابیں لکھیں دوسری زبانوں میں لکھی گئی کتابوں کے فارسی میں تراجم کیے۔ اس سب کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے جیسے کہ ہم جانتے بھی ہیں کہ ایران کے صفوی بادشاہ اور ہندوستان کے مغل بادشاہ تقریباً معاصر ہیں۔ صفویوں نے فارسی شعروادب کا دامن چھوڑ کر مذہبیات کی سرپرستی شروع کردی۔ اہل تشیع ہونے کی وجہ سے اُنھوں نے صرف شیعہ عقیدہ رکھنے والوں کی سرپرستی کی تو شاعروں اور ادیبوں نے مغل دربار میں پناہ لینی شروع کردی۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں فارسی شعروادب کا مرکز ایران سے ہندوستان منتقل ہوگیا۔ دہلی اور آگرہ نے شیراز اور اصفہان کی جگہ لے لی۔ اس کے علاوہ فارسی شاعری میں ہندوستانی روایات شامل ہوگئیں۔ بہت سے فارسی کلمات نے اپنی وضع بدلی، بہت سے نئے الفاظ وجود میں آگئے، نئی نئی اصطلاحات وضع کی گئیں اس اسلوب کو سبک ہندی کا نام دیا گیا۔ اس کے

اجزائے ترکیبی میں تشبیع ،استعارہ وکنایہ کی ندرت زبان وبیان کی نزاکت اور مضمون آفرینی شامل ہیں۔

مغل دور کے شعراء نے غزل اور قصیدہ میں اپنے جوہر دکھلائے۔مغل سلطنت کا بانی بابر خود صاحب ذوق اور شعروادب سے خوب دلچسپی رکھتا تھا۔بابر کی خودنوشت سوانح ''بابرنامہ'' ہمایوں کا دیوان ، جہانگیر کی ''تزک جہانگیری'' گل بدن بیگم کا ''ہمایوں نامہ'' اور اورنگ زیب کے خطوط مغل دور کی فارسی نثر کا بہترین نمونہ ہیں۔ مغل بادشاہوں نے اپنے درباروں میں ملک الشعراء مقرر کیے تھے اورانھیں اُن کی صلاحیت کی بناء پر اور اعلیٰ کمالات دکھانے کی بنا پر زر اور جواہر سے تولا تھا۔گو یا جتنی سر پرستی شعراء کی مغل دربار میں ہوئی اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔عہد اکبر فارسی زبان وادب کی ترقی کے لیے زرین وموزوں ثابت ہوا۔غزالی مشہدی جسے اکبر کا ملک الشعرا ہونے کے ساتھ ساتھ مغل دور میں سب سے پہلا ملک الشعراء ہونے کا افتخار بھی حاصل ہے۔ابوالفضل نے غزالی کو ایک صوفی شاعر کی حیثیت سے متعارف کروایا ہے۔غزالی نے قصاید اور غزلیات پر مشتمل اپنا ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے۔غزالی کے بعد فیضیؔ کو ملک الشعراء کا خطاب عطا کیا گیا فیضیؔ اور اُس کا بھائی ابوالفضل اکبری دور کی فارسی ادب کی دو اہم شخصیتیں ہیں۔ان کے علاوہ جمال الدین محمد عرفیؔ ،نظیریؔ نیشاپوری اور شیدا فتحپوری اس عہد کے ممتاز شعراء ہوئے ہیں۔تاریخ نویسی میں ابوالفضل کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایشیاء کے حکمران جس قدر اس کی قلم سے خوفزدہ تھے اتنے اکبر کی شمشیر سے خائف نہ تھے۔اس کی معرکتہ الآرا تصنیف ''اکبرنامہ'' ہے۔''عیاردانش'' بھی ابوالفضل کی تصنیف ہے۔منتخب التواریخ،تاریخ الفی،طبقات اکبری،تاریخ فرشتہ،تاریخ حقی، زبدۃ التواریخ،روضتہ السلاطین،،ہفت اقلیم اور تاریخ ہمایوں اس دور کی اہم تواریخ ہیں جو اکبر کے دور کی سیاسی،سماجی،علمی اور ادبی معلومات کا خزانہ ہیں۔

اکبر اپنی سلطنت کو مستحکم کرنے کے بعد اس جدوجہد میں مصروف ہوا کہ سنسکرت اور دیگر زبانوں میں لکھی گئی تمام کتابوں کو علمی اور ادبی روایتوں کو فارسی میں ترجمہ اور متعارف کروائے۔اپنی اس سعی کے تحت فیضی کو حکم دیا کہ وہ اس کام کو انجام دے۔لہذا فیضیؔ نے اکبر بادشاہ کے حکم کے تحت لیلاوتی (سنسکرت میں ہندسہ اور الجبرا پر ایک اہم کتاب ہے)اور ''نل ودمن'' کو فارسی میں ترجمہ کیا۔اکبر کے حکم سے ہی ہندوستان کی دو عظیم داستانیں ''مہابھارت'' اور ''رامائین'' کو فارسی میں منتقل کیا گیا۔فارسی زبان کو تقویت پہنچانے کا یہ سلسلہ جہانگیر بادشاہ کے عہد میں بھی جاری رہا۔جہانگیر نے ''تزک جہانگیری'' لکھ کر سوانح نگاری کے میدان میں ایک گراں بہا اضافہ کیا۔جہانگیری دور کے

شعراء نے بھی اپنے مخصوص میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کو منوایا۔ طالب آملی جو جہانگیر کا ملک الشعراء تھا اُس نے بیس ہزار اشعار پر مشتمل دیوان اپنی یادگار چھوڑا جس کا غالب حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ''پدماوت'' اور ''چنداین'' کے فارسی ترجمے بھی اسی دور میں وجود میں آئے۔

ابو طالب کلیمؔ کاشانی (شاہ جہان کے دربار کا ملک الشعراء) حاجی جان محمد قدسی شاہجہانی دور کے دو شعراء ہیں جنھیں شاہ جہاں نے اُن کی صلاحیتوں کی بنا پر سونے اور چاندی سے تولا تھا اور بار ہا اُن کا منہ جواہرات سے بھر دیا تھا۔ کشمیر کے دو اہم شعراء جن کا تعلق کشمیر سے تھا محسن فانیؔ اور غنی کشمیریؔ ہیں۔ محسن فانیؔ کو اُن کی مثنویات اور غنیؔ کو اُن کی غزلیات کی وجہ سے ہمیشہ یاد کیا جاتا ہے۔

شاہ جہان کے بعد اورنگزیب کے عہد میں اگرچہ شعر و ادب کو شاہی سرپرستی حاصل نہیں رہی لیکن اس روایت کے اندر اتنی پختگی پیدا ہو چکی تھی کہ فارسی شعر و ادب کے میدان میں بہت سے محققین طبع آزمائی کرتے رہے اور انھوں نے تراجم کا سلسلہ جاری رکھا۔ مرزا عبدل قادر بیدلؔ جس کی شاعری نے سبک ہندی کو عروج پر پہنچایا اس دور کا عظیم شاعر ہے۔ بیدلؔ کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ آٹھ ہزار سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ اُنیسویں صدی کے وسط سے ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کو نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ مغلوں کا وہ دربار جہاں فارسی زبان و ادب کی دل کھول کر سرپرستی کی جاتی تھی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اُسے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ انگریزوں نے بھی اپنی زبان کے مقابلے میں اس زبان کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ ہندوستان کا انیسویں صدی کا مشہور فارسی شاعر اسداللہ خان غالبؔ ہے۔ غالبؔ کو اگرچہ اردو کا ایک عظیم شاعر مانا جاتا ہے لیکن اُس کو اپنے فارسی کلام پر زیادہ فخر و افتخار ہے۔ ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کی روایت نے ادبی حلقوں پر اس قدر اپنی گرفت بنالی تھی کہ بیسویں صدی میں اقبالؔ جیسے مفکر اور جلیل القدر شاعر نے بھی اپنے افکار کا ذریعہ فارسی زبان کو ہی قرار دیا۔ اقبال کی فارسی شاعری کے مجموعے ''اسرار خودی''، ''رموز بے خودی''، ''پیام مشرق''، ''زبور عجم''، ''جاوید نامہ'' اور ''ارمغان حجاز'' پر مشتمل ہیں۔

ہندوستان میں آزادی کے بعد فارسی زبان و ادب کے میدانوں میں تحقیق و تلاش کی نئی راہیں کھلی ہیں اور کارہائے نمایاں انجام دیے جا رہے ہیں۔ قرون وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ ہماری مشترکہ تہذیب اور اردو زبان و ادب کے حقیقی خدوخال جاننے کے لیے فارسی منابع بنیادی ذرائع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کا مطالعہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ☆☆☆

Sinf-e-Afsana ke Manazil: abad ta azal ta abad by Lateef Ahmad Bhat(research scholar dept.of Urdu.KMC Language University LKO)

لطیف احمد بھٹ (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنو)

صنفِ افسانہ کے منازل: ازل تا ابد

بہ مطابق علم کائنات دھما کہ عظام یعنی Big Bang کے ساتھ کائنات کا چلن ہوا۔ مختلف کہکشاں اور تاروں کے جرمٹ نے بعد ازاں دریافت شد حیوانی صورت اور ہیت اختیار کی کثافت اور گاڑھے پن نے مادے، حرارت اور شعاعوں کو یکے بعد دیگرے تہہ بہ تہہ بٹھا کر کائنات کے اجزاء کی داغ بیل ڈالی شاید کھربوں کروڑوں سالوں کی تقدیر ایک شاہ کار یعنی Master Piece کی تخلیق پر تکمیل ہوئی جس کا نام آدم پڑا۔ مذکورہ بالا سطور کے ساتھ نہ چارلز ڈارون Charles Darwin کا نام لینا کوئی تعجب کی بات ہوگی اور نہ ہی اُن کے متعین کردہ اصول ارتقاء انسان Theory of Evolution of Man کی نفی کرنا۔ کیونکہ انسان بروئے مستند الہامی کُتب کائنات کی احسن تخلیق ہے جس کا خالق احسن الخالقین ہے نطق اور فہم و فراست کا مالک یہ انسان از خود دلیل ہے کہ یہ اپنے مستقبل کا سنوار ہے جس کا وہ وقت کے نشیب و فراز میں بھرپور مظاہرہ کر چکا ہے فرد بشر اور ازدواجی عمل سے کنبے کے وجود سے سماج کے جنم نے حیاتی بُلبلے کا کارندہ انسان، تہذیب، کا موجب بنا۔ تہذیب کی شاہ کلید'' جانکاری واقفیت یا شناسائی'' یعنی Knowlwdge سے پہلے جہالت اور ناواقفیت ہی انسان کے لئے وہ جذب ثابت ہوئی جس نے وقت کے فلسفہ دان Roussow اور Aristotle کو منظر عام پر لایا۔

.....Ignorance more frequently begets''
confidence than does
knowledge. It is those who know little and not those who know
much..... 1 (Internet)

چونکہ کائنات کے تخریبی آغاز کے بعد تعمیراتی عناصر نے گھٹہ جوڑ کر کے جس طرح الجھن Complexity کو جنم دیا عین اسی طرح انسان کی بقاء اور عمل تناسل کے نشوونما کے ساتھ

آ گے بڑھنے کے عمل نے بہت سی تہذیبوں کو روئے زمین پر نمودار کیا۔تہذیب یونانی ہو یا رومی یا پھر ہندوستانی برصغیر Subcontinent کی معروف تہذیب Indus Valley Civilizationانسان نے فلسفانہ رویہ تو ایجاد کیا لیکن اپنی انسانی خصلت سے ایک دوسرے پر عارضی حاکم ، بادشاہت کی شکل میں تسلط جمانا شروع کیا۔یہاں تک کہ تہذیب کے نام بادشاہوں کے نام سے لئے جانے لگے۔ بادشاہ منوس King Minosاور اگسٹ قیصر August caeser کے زمانے ہی سے بادشاہوں کی تعظیم اورنوکروں کی تذلیل Rule of Law تھا۔ دونوں گروہوں کے روحانی اور جسمانی ضرورتوں نے انسان کے ضمیر کو ٹٹولنا شروع کیا۔مجسمہ رگ و ریشوں اور روحانی تاروں کے سنگین تاؤ نے قدیم یونان کیا اور Homer کو بارہویں صدی بی سی ای 12th Century BCE میں کہانیاں سنانے پر مجبور کیا۔جن میں ٹروجان (Trojan) کی کہانیاں اور خرگوش کچھوے کی کہانیاں قابل ذکر ہیں۔دراصل رومی تہذیب میں شاعرانہ اظہار ہی نثری اظہار سے سبقت لے گیا۔

"Poetry was the first sort of literate to arouse peoples interest."

(Aristotl

چونکہ ضرورت ایجاد کی ماں تصور کی جاتی ہے اور اس Generalisation کے تحت جہاں انسان نے ہارڈ ویئر اور سافٹ ویئر کا مخلوط کمپیوٹر ایجاد کیا وہی مختلف علوم وفنون اپنے عروج پر نظر آ رہے ہیں۔اس سب کے چلتے انسان کی فطرت میں بھی نمایاں تبدیلی رونما ہوئی اور وہ مشینی طرز عمل کا قائل ہوا۔جس طرح مشینی کام تُرنت بغیر کسی تاخیر کے پایہ تکمیل کو پہنچتے ہیں عین اسی طرح موجودہ دور کا انسان اپنے کام آناً فاناً ختم کرنا چاہتا ہے۔بلکہ یوں کہو کہ گھڑی کی سوئیاں رفتار پکڑ چکی ہیں۔انسان ان کے تعاقب میں مختلف عبور مرور کو پار کرنے اور اپنی عیش کی زندگی کے لئے بے حد ضروریات کی دستیابی کے لئے سرتوڑ محنت کر کے شب روز بھاگ دوڑ میں لگا رہتا ہے۔نتیجتاً عدیم الفرصت ہونے کا نام اپنے سہرے پر سجا چکا ہے۔مندرجہ بالا سطور اس بات کو روز روشن کی طرح عیاں کر دیتی ہیں کہ جدید انسان اردو ادب کے میٹھے چشمے سے کہانیوں کا آب حیات اب ناولوں کے بجائے ان کی ترقی یافتہ شکل میں نوش کرنے کا حامی بن گیا۔جہاں زندگی ہو، زندگی کے تجربات ہوں، سماج ہو، سماج کی عکاسی ہو، اختصار ہو، جمالیات کی وضاحت ہو، رومانس ہو، تفریحی سامان بھی میسر ہو۔اس طرز کا ادبی صنف افسانہ یعنی Short Stories کی شکل میں نمودار ہوا اور دورہ جدید کے ادب پر اب راج

(Vol. 161 page 711) Encyclopedia Brikinnica کرتا ہوا نظر آرہا ہے۔
میں مختصر افسانے کی تعریفوں میں یہ الفاظ درج ہیں:

"The short story is a kind of prose fiction, usually more compart and intense than the novel..... "

ایڈگر ایلن پو افسانہ کی تعریف میں کم وبیش یوں لکھتے ہیں:

افسانہ ایک ایسی بیانیہ صنف نثر ہے جو اتنی مختصر ہو کہ ایک ہی نشت میں پڑھی جا سکتے، جسے قاری کو متاثر کرنے کے لئے رکھا گیا ہو اور جس سے وہ تمام غیر ضروری اجزاء نکال دئے گئے ہوں، جو تاثر کو قائم رکھنے میں معاون نہ ہو۔ اس میں وحدت تاثر اور کلیت "Totality" ہو۔

The Readers Cunpamon to world literate Page 415

افسانہ کی مختصر تاریخ کے لئے جہاں قلمی نوک کے تلے انگریزی ادب کے سیمول رچرڈسن 1689-1761 اور لیو لیپے نے اپنی شخصیت میں تصویر سازی کرتے نظر آتے ہیں وہی یہ سلسلہ ایک تاریخی چلینج کے بعد مشرقی ادب میں راشد الخیری، سجاد حیدر یلدرم، پریم چند وغیرہ نئے باب کے بسمہ الہی کہانی نگار ہیں۔ چونکہ انسان مغرب کا ہو یا مشرق کا، سیاست کے یلغار سے کبھی بچ نہیں سکا ہے اور شاید تا قیام قیامت ممکن بھی نہیں۔ لہذا تاریخی کروٹوں میں کہانی گو ازل ہی سے تھپڑ کھائے ہوئے ہیں مگر ساتھ ہی معاشرتی نظام کی ڈوروں کے تاؤ سے بھی برقی اثرات کا مزا بھی لے چکے ہیں۔ ایسے تاریخی ماحول میں افسانہ نگاری کی داغ بیل پڑتی نظر آئی ہے۔ اور ہندوستان میں اس طرح کے حالات بیسویں صدی کے آغاز میں اپنے بام مروج پر تھے اور ۱۸۵۷ء کے ناکام جنگ آزادی کے بعد یہاں کے باضمیر اور ذی حس طبقے نے باضابطہ طور زندگی کی ڈگر سے کج موڑ لئے معاشرے کو واپسی پٹری پر لانے کے لئے کہانیوں کا آغاز کیا۔ رقم شدہ سطور سے پہلے پہل کی افسانوی کہانیوں کے طرز و تکنیک کو بھانپنے کا سہارا مان کر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ سر سید احمد خان کی کہانی ''گزرا ہوا زمانہ'' داستانوی صنف ہی کی مافوق الفطری ماحول اور فضا کی تخیل کی ترجمان ہے مگر خطوط کی تکنیک میں کہانیوں کو لکھ کر افسانوی مزاج سے آراستہ کرنا راشید الخیری افسانے ''نصیر اور خدیجہ'' (دسمبر ۱۹۰۳ء) عصمت وحسن (مطبوعہ مخزن لاہور ۱۹۰۶ء) '' کثرت ازواج'' (مطبوعہ، مخزن، لاہور ۱۹۰۸ء) '' نند کا خط بھاوج کے نام (مطبوعہ عصمت، دہلی جون ۱۹۰۸ء) اور افسانوی مجموعہ ''مسلی ہوئی پتیاں'' (طبع اول ۱۹۳۷ء) قابل مذکور ہیں۔ اسی طرح علی محمود کے افسانہ '' نئی تال''

مطبوعہ (۱۹۱۰ء) سجاد یلدرم کے افسانہ ''درست کا خط'' (۱۹۰۶) بھی تاریخی اعتبار سے مذکورہ تکنیک کو مستعمل بنانے والے شروع کے افسانہ نگار تصور کئے جاتے ہیں۔

(اردو افسانے کی روایت، مرزا خلیل بیگ، ۲۰۱۴ء، ص۔ ۴۱۔ ۴۰)

مابعد پریم چند نے افسانوی مجموعہ ''سوز وطن'' مرتب کیا جو کہ مطبوعہ زمانے پریس کانپور طبع اول جون ۱۹۰۸ نواب رائے کے قلمی نام سے شائع ہوا۔ اس افسانوی مجموعے کی بلند آواز نے وقت کے حکمرانوں کے کانوں کے پردے ہلا دئے اور نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت برطانیہ نے بغاوتی عناصر کی اشتہار ٹھہرا کر یہ افسانوی مجموعہ ضبط کیا اور اس کی چند کاپیاں نظر آتش بھی کر دیا۔ یوں پریم چند نے انگریزوں کی بغاوت اور آزادی کی بنیاد اپنے قلم سے ڈال دی اور کہانیاں حقیقت سے نزدیک تر ہوگئی ۔''کتاب کی ضبطی کے موقع پر اتر پردیش کے جنوبی علاقے ہمیر پور کے ڈپٹی کلیکٹر نے پریم چند سے کہا تھا۔ تمہاری کہانیوں میں سڈیشن بھرا ہوا ہے۔ اپنی تقدیر پر خوش ہو کر انگریزی علمداری ہے، مغلوں کا راج ہوتا تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے جاتے۔ تمہاری کہانیاں یکطرفہ ہیں۔ تم نے انگریزی سرکار کی توہین کی ہے''

(ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ، علی گڈھ، پروفیسر آل احمد سرور، ص۔ ۱۰۸۔ ۱۰۹)

ایسے ہی سکے کے دوسرے پہلو کو دیکھیں تو سجاد حیدر یلدرم کی تصویر نمایاں اور صاف نظر آتی ہے۔ افسانہ ''احمد سے لے کر غربت و وطن، دوست کا خط، حکایتیں لیلا مجنون اکتوبر ۱۹۰۷ء تا مئی ۱۹۰۸ء'' تک تو سجاد حیدر یلدرم افسانوں کی رو میں آن بان سے متحرک نظر آتے ہیں۔ جہاں ایک طرف ''دنیا کا انمول رتن جون ۱۹۰۸ء' سے کفن ۱۹۳۵ء'' تک افسانوں میں پریم چند ایک دور اندیش اور اصلاحی نقطہ نظر کو عملی جامہ پہنانے کا پرچار کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ہندوستانی معاشرے کے خدوخال سے واقف نظر آتے ہیں۔ فرقہ واریت اور انتہا پسندی سے بے زار اپنے لوگوں کو ذات پات، مذہب و ملت، رنگ و قوم وغیرہ کی بالادستی سے پیدا ہونے والے خرافات سے دور دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں مسلمانوں کے اسلاف کے کرداروں کو اجاگر کرتے نظر آتے ہیں۔ سماجی جال کے بندھن کے خلاف اٹھی ہوئی انتشار پھیلانے والے ہر نظریے کی نفی کرتے نظر آتے ہیں۔ وہی دوسری طرف سجاد حیدر یلدرم نے برعکس پریم چند کے رومان پرور فضاؤں کو پیش کیا۔ انہوں نے اپنے افسانوں کی زینت حسن کی پری عورت کی اجمل پرچھائیوں کو اپنے قلم سے مل کر بنایا۔ دراصل سجاد حیدر یلدرم مغرب کی عورت کو نمونہ بنا کر ہندوستانی عورت کو یہاں کے بادِ تلخ میں کھل کر سانس

دلانے کا حامی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مرد اور عورت کا رشتہ فطری ہونے کے ناطے اس رشتے کو محبت اور حسن کے تقاضے پورے کرنے کے لیے آزاد چھوڑا جائے اور یہی آزادی مرد کے جرت مند بننے کا اعلی سبب بھی ہوسکتا ہے۔ یوں پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم نے ہندوستانی افسانوں کی اپنے اپنے رنگ میں خوب رنگا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ آنے والے افسانہ نگاروں کے سامنے افسانوں کے دو طرح کے راستوں کی ڈگر متعین کی۔ ڈاکٹر محمد صادق لکھتے ہیں:

''اردو افسانے میں حقیقت نگاری کی روایت پریم چند ہی کے ہاتھوں پروان چڑھی لیکن یہ واقع ہے کہ بیسویں صدی کی ابتدا میں رومانوی افسانہ نگاروں ہی کا دور دورہ تھا۔ حقیقت نگاری کے فروغ کا زمانہ صحیح معنوں میں ''انگارے'' کی اشاعت اور ''اردو انجمن ترقی پسند مصنفین'' کے قیام کے بعد شروع ہوتا ہے۔ (ترقی پسند ادب، عزیز احمد، ۱۹۹۳ء ص۔ ۵۵)

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو بیسویں صدی کے پہلے تیس سال افسانوں ادب کے لئے سنہرے سال ثابت ہوئے ہیں۔ جہاں پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم نے افسانوں کے بنیادی ڈھانچے پکے تیار کئے وہی برطانیہ میں زیر تعلیم ہندوستانی طلبا بڑے جوش وجذبے سے ادبی ڈھانچوں کے بنیادی خاکوں پر کام کرنے لگے۔ انہوں نے جاں فشانی سے اپنے وطن میں پنپنے والی آزادی کی لہر کی خدمت بذریعہ ادب کرنے کی سعی کی اور بین الاقوامی حالات سے پیدا شدہ صورت حال کی روکو اپنے ہم وطن ساتھیوں کی دَرد ستِ فرنگ اذیتوں کے اظہارِ یکجہتی کے لئے دھار کی شکل دی۔ ایسے ناموراد یبوں میں نوجوان سجاد ظہیر سرفہرست ہیں۔ انہوں نے رشید جہاں، احمد علی، محمد ظفر کے ساتھ مل کر ۱۹۳۲ء میں دس افسانوں پر مشتمل افسانوی مجموعہ ''انگارے'' کے نام سے شائع کیا۔ اشاعت کی دیر تھی کہ حکومتِ وقت کی طرف سے انگارے بھرسنے شروع ہوگئے۔ یوں برطانوی حکمرانوں نے نام زدہ افسانہ نگاروں پر قدغن لگائی 'انگارے'' کی اشاعت پر بغاوت کا سہرا باندھا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ برطانوی حکومت نے سختیوں کے پہاڑ کھڑا کئے مگر سجاد ظہیر بحیثیت روح رواں انقلابی انجمن کی داغ بیل ڈالنے میں زیادہ قوی ہوتے گئے۔ اس طور افسانوی مجموعہ ''انگارے'' نے سچ مچ اپنی گرماہٹ ہندوستان میں مقیم برطانوی حکومت کے برستے ڈنڈوں کے شکار عام شہری اور عصری مصنفین تک پہنچادی۔ عزیز احمد ''انگارے'' سے رقم طراز ہیں:

''اس کتاب میں ہزار نقائص سہی لیکن اس کی اہمیت سے انکار نہیں۔ اس کی اشاعت سے نئے ادب نے خودمختاری کا علم بلند کیا۔ یہ سماج پر پہلا وحشیانہ حملہ تھا اور اگر چہ اس حملے میں غیر ضروری خون ریزی

بھی بہت تھی۔(علامتی افسانہ کیو اور کیوں نہیں، حیدر علی ملک: آہنگ: گیا، دسمبر ۱۹۸۰ء)

ادب کی فکشن صنف نے زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کی عکاسی کی، ترقی پسند مزاج نکھرتا گیا، زندگی کی حقیقی پہلوؤں کو نمائندگی ملی۔ پریم چند کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ نے افسانہ کی بارش کردی۔ زندگی اور زندگی سے جڑے ہوئے ہر زاوئے کو افسانوی شکل میں پیش کیا۔ انقلابی ،جنسی، نفسیاتی، معاشی و معاشرتی وغیرہ موضوعات کی خوب تر وضاحت ہوئی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں سامنے آنے والے منشور کے مطابق افسانہ نگاروں نے ادب کو رجعت پسندی سے ماورا ادب کو''ادب برائے زندگی'' کے سانچے میں ڈالا۔ کرشن چندر نے رومانوی موضوعات کے اُوپر ترقی پسندانہ موضوعات کو ترجی دی۔ ان کے افسانے اندا تا، مہالکشمی کا پل، تین گونڈے وغیرہ جب کہ سعادت حسن منٹو کے افسانے نیا قانون، ہتک، کھول دو، ٹوبہ ٹیک سنگھ شہکار افسانے وجود میں آئے۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانے گرہن، گرم کوٹ وغیرہ اور عصمت چغتائی کے مسلم معاشرے کی عکاسی کرنے والے افسانے چوتھی کا جوڑا، لحاف، چھوئی موئی وغیرہ منظر عام پر آئے۔ اسی طرح احمد ندیم قاسمی، غلام عباس، حاجرہ مسرور وغیرہ جیسے افسانہ نگاروں نے بھی اپنے افسانوں کی قلم کشائی کی۔ اس طور ترقی پسند تحریک کے مصنفین اردو ادب کی خدمت کرتے رہے۔

حالانکہ ۱۹۴۷ء کے تقسیم ہند اور تقسیم ہند سے ابھرنے والے موضوعات و مسائل نے اس تحریک کو آب حیات بخشنے کی سبیل پیدا کی۔ قرۃ العین حیدر نے صوبہ اودھ کی لٹتی ہوئی اور مٹتی ہوئی جاگیر کا نوح اپنے افسانوں میں سنایا۔ پت جڑ کی آواز، روشنی رفتار، جگنوکی دنیا ان کے شہکار افسانوی مجموعے ہیں۔ انتظار حسین نے تقسیم سے ہجرت کا کرب میں مبتلا ہندوستانی انسان کی تصویر کشی کی اور شہر افسوس، آخری آدمی، گلی کوچے وغیرہ جیسے افسانوی مجموعے تخلیق کئے۔ ان کے علاوہ دوسرے بہت سے افسانہ نگاروں نے بھی ان واقعات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ آزادی کے بعد افسانہ نگاروں نے بہت ہی اہم اور کامیاب افسانے لکھے جیسے خدیجہ مستور(یہ ہم ہیں، لاشیں، چپکے چپکے) جیلانی بانو(موم کی مریم، روشنی کا مینار) اشفاق احمد(گڑیا، بتاشے، توبہ)، قاضی عبدالستار(میراث، دن ڈھلے، ستاروں کی چال)، بلونت سنگھ(رنگ) ممتاز مفتی(لیکن، آپا) وغیرہ نے اہم اور کامیاب افسانے لکھ کر اردو افسانے کے دامن کو وسیع کیا۔

جدیدیت کے اردو افسانوں میں نیا پن دیکھنے کو ملا۔ پلاٹ کردار اور ماحول کے سہارے کے

بغیر افسانون کی کتابت شروع ہوئی علامت اور تمثیل سے افسانوں کو تراشا گیا۔اس دور کے افسانوں میں ذات کی گمشدگی اور عصری دنیا میں تنہا ہونے کا احساس،عدم تحفظ، بے بسی اور بے یقینی جیسے موضوعات کو سمویا گیا۔سریندر پرکاش،بلراج مین را،انور سجاد وغیرہ جیسے افسانہ نگاروں استعارہ کا خوب استعمال کیا۔دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم،برف پر مقالمہ وغیرہ جیسے افسانوں مجموعے ادب کی زینت ثابت ہوئے غرض افسانوں کا رویہ بدلا،رویہ سے انداز بدلا اور جدیدیت کے لئے حالات سازگار اور راہ ہموار ہوئی۔بقول حیدر ملک:

’’علامتی دور سے پہلے کا افسانہ اس لحاظ سے یک روخ تھا کہ اس نے معاشرے کو فوکس کیا،علامتی افسانے نے سکہ کا دوسرا رخ پیش کیا جس سے فرد کی فردیے بحال ہوئی۔اس کے علاوہ جدید افسانے نے الفاظ کی حرمت اور کفایت شعاری پر زور دیا‘‘

(علامتی افسانہ کیوں اور کیوں نہیں،حیدر علی ملک،آہنگ،گیا،دسمبر ۱۹۸۰ء)

جہاں ابتدائی افسانوں میں جمالیاتی حس کی بیداری،تاریخ بینی اور فنی چابکدستی ہر لحاظ سے پختہ نظر آرہی ہے تو وہی حال کے افسانوں میں انسانی زندگی اور اس کی خوبیوں اور خامیوں کے شعوری طور پر برملا تقابل موجود ہے۔مابعد جدیدیت کہانی سے ڈرانا دھمکانا اور چونکانا مناسب نہیں سمجھا لہجے اور اسلوب سے کام بھی نہ لیا بلکہ اپنی نظر ہی سے زندگی کی سچائی کو کھل کر سامنے لایا۔موضوعات کی قلت نظر نہیں آئی۔انسانی سراسیمگی اور بے چینی کو،سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ،از شوکت حیات،بارودی سرنگ،از اقبال مجید،اپنی آگ اپنا گھر،از ابن کنول،لہو کا درد از جاوید،نہال ہاشمی وغیرہ جیسے افسانوں میں یہ بانگ دہل قارئین تک پہنچایا۔فرقہ وارانہ اور’جس کی لاٹھی اس کی بھینس‘ کے پیش نظر بابری مسجد کی شہادت اور دیگر وارداتیں مابعد جدیدت کے قلم سے اقلیت ملول ور اکثریت شرمندہ کرتے ہوئے اور آنندلہر نے افسانہ’’اور پتھر رو پڑا‘‘تخلیق کیا۔م۔م۔راجندر نے افسانہ ’’محور‘‘ لکھا اور مشتاق اعظمی نے افسانہ’’عرش تا فرش‘‘ قلمبند کیا مابعد جدیدیت نے طے شدہ نظریات اور تسلیم شدہ تصورات کی نفی کی۔تشدد،جنس،مشینی زندگی میں گم ہوتا ہوا انسان،دہشت گردی وغیرہ کے موضوعات افسانوں کی زینت بنے۔حقیقی زندگی کو موضوع بناتے ہوئے نثار راہی نے سنہرے پت جھڑ،رات کا سہر،’’روپیوں کا سمندر‘‘وغیرہ جیسے افسانے تخلیق کئے۔جتندر بلو نے افسانوی مجموعہ’’نئے دیس‘‘ میں مرتب کیا جس میں انہوں نے ایشیائی تہذیب وتمدن اور مغربی تہذیب وتمدن کو ان کی خوبیوں اور خامیوں کی بنیاد پر مقابلہ جات قائم کئے۔زمانے کی فکر وفریبی پر’’یاالولی الالباب‘‘افسانہ از غفنفر

قابل ذکر ہے۔ استاد شاگرد کے زوال پذیر رستہ طوص حسین الحق نے افسانہ ''مطلع'' لکھا اور قوم کے لیڈروں کے کردار گفتار پر افسانہ ''چارودا! آپ کہاں ہیں'' لکھا۔ عصری خامیوں کی نشاندہی سے گریز نہ کرتے ہوئے مابعد جدیدیت کے افسانہ نگاروں نے عورت کے ساتھ سسرال والوں کا ظلم، زمین جائیداد کے بٹوارے میں بھائی بھائی کے خون کا پیاس، کھیت میں دوشیزہ کے ساتھ زنا بالجبر، چھ بچوں کی ماں کا عاشق کے ساتھ رنگ رلیاں منانا، دلہن کی عصمت دری وغیرہ کو سرعام پیش کیا۔ الغرض مابعد جدیدیت تصورات نے افسانے کو ایک بار پھر زمینی حقیقتوں سے روشناس کرایا۔ اس میں کہانی پن کو بحال کیا اور تجریدیت کے بجائے انسانی زندگی کے مسائل کو حقیقت پسندی، ادبی نزاکتوں اور روحانی بصیرت کے ساتھ پیش کیا اور اگر کہیں علامتوں کا استعمال کیا گیا تو اس احساس کے ساتھ کہ افسانے کا سنجیدہ قاری معنوی تہوں کو کھول کر اصل معنی کا سراغ لگا سکے۔

مابعد جدیدیت کے اس دور میں جو افسانہ نگار اردو افسانے کے افق پر نمودار ہوئے ان میں مشرف عالم ذوقی، شموئل احمد، ساجد رشید، احمد صغیر، سید محمد اشرف، طارق چھتاری، پیغام آفاقی، بیگ احساس، دیپک بدکی، آنندلہر، امجد جاوید، سلام بن رزاق، نورشاہ، ترنم ریاض وغیرہ اور کئی دوسرے اہمیت کے حامل ہیں۔

☆☆☆

Farsi Adab ka Naamvar Adeeb Maulana Auji Kashmiri by Dr. Farooq Ahmad Wani(Dept.of Persian,University of Kashmir)cell-9906765260

ڈاکٹر فاروق احمد وانی (شعبہ فارسی، کشمیر یونیورسٹی، حضرت بل سرینگر)

فارسی ادب کا نامور ادیب مولانا اوجیؔ کشمیری

کشمیر میں فارسی زبان و ادب کو فروغ دینے میں جن ادیبوں، مصنفوں اور شاعروں کا تزکرہ ملتا ہے ان میں خاصکر مولانا اوجی کشمیری کا نام سرفہرست ہے چناچہ مولانا اوجی کشمیری، مولانا نامی کشمیری کے فرزند ارجمند تھے۔ ا۔ مولانا اوجی کشمیری کی تاریخ ولادت کا کوئی ذکر تذکروں میں نہیں ملتا ہے البتہ جس وقت اوجیؔ اور صاحب تذکرہ میخانہ کی ملاقات ہوئی۔ اس وقت شاعر کی عمر ۵۵ سال کی تھی۔ ۲۔

تذکرہ میخانہ کے مؤلف نے لکھا ہے کہ مولانا اوجی کشمیری کا باپ خود علم و دانش میں کمال رکھتے تھے' اپنے باپ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی ۳۔ اور صرف ونحو میں کافی دسترس حاصل تھی ۴۔ مولانا اوجیؔ کو بچپن سے ہی شعر وشاعری کا زبردست شوق تھا۔ جب وہ سنہ بلوغیت کو پہنچے تو ان کی شہرت کشمیر میں بجلی کی مانند پھیل گئی ۵۔ تو اس زمانے کے کشمیر کے گورنر مرزا جعفر آصف خان جو علم دوست تھا نے اوجیؔ کی سرپرستی کی اور اسے سرکاری ملازمت سے سرفراز کیا۔ اپنے درباری شعراء میں شامل کیا اور انہیں تربیت اور ترقی کے مواقع میسر ہوئے جسے انہیں بہت منافع ہوا۔ بقول خواجہ محمد اعظم دیدہ مری ''طالعش از حفیض میل اوج نمود'' مذکورہ گورنر کے بعد جو بھی حاکم مرکز کی طرف سے متعین ہوئے اور ہر ایک حاکم کی مہربانیوں اور بخششوں سے اوجیؔ کو سرفرازی حاصل ہوئی۔ ۶۔

مولانا اوجیؔ کشمیری نے اپنی زندگی نہایت دردمندی کے ساتھ گذاری۔ اس کی مزاج درویشانہ تھی تذکرہ میخانہ کا مصنف نے لکھا ہے: ''درویش دردمند وصوفی مشرب پاکیزہ اعتقاد۔ ۷۔

مولانا اوجیؔ کشمیری کی زندگی کے آخری ایام میں ان کا دماغی توازن برقرار نہیں رہا تھا حالانکہ اس حالت میں بھی وہ شعر کہتا تھا لیکن ان اشعار میں کوئی تاثیر نہیں تھی۔ اوجیؔ کشمیری کے ساتھ تذکرہ میخانہ کے مصنف اپنی ملاقات کا حال اس طرح بیان کرتا ہے۔ مسعود این اوراق پریشان را با مولانا اوجیؔ در دارالعیش کشمیر ملاقات واقع شد' در آنوقت سنش بہ پنجاہ و پنج رسیدہ بود و در آن

سن، افیونی گذرا گردیدہ و بمرتبہ بی از کار رفتہ، کہ از سر رشتہ نظم افتادہ بود و اگر احیاناً دو سہ بیتی از و سر میزد، چندانی ناخن بر دل نمی زد ۸ ۔

مولانا اوجی کشمیری وطن پرست شخصیت تھی۔ وہ بیرونی ریاست کی سیر و سیاحت کا سفر نہیں کرتے تھے البتہ کشمیر کے نواحی علاقوں کی سیر انہوں نے بار ہا کی تھی اس کا سب سے بڑا اور طولانی سفر وہ تھا جب وہ کشمیر سے نکل کر لاہور پہنچے ۹ ۔ اور جلد ہی واپس لوٹے۔

''تذکرہ میخانہ'' کے مصنف نے مولانا اوجی کشمیر کے کل اشعار کی تعداد تین ہزار لکھی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ملاقات کی وقت تک اوجی کشمیری نے اپنا دیوان مرتب نہیں کیا تھا ۱۰ ۔ لیکن خواجہ محمد اعظم دیدہ مری نے واقعات کشمیر میں تحریر کیا ہے کہ وہ صاحب دیوان شاعر ہے ۱۱ ۔ آج کل اوجی کشمیری کا دیوان دستیاب نہیں ہے اس کے علاوہ انہوں نے ایک ساقی نامہ بھی تحریر کیا ہے جو چوراسی (۸۴) اشعار پر مشتمل ہے جسے پیر غلام حسن کھویہامی نے تاریخ حسن میں نقل کیا ہے۔ تحفتاً چند اشعار ملاحظہ ہیں ؎

مرا بادہ بی اوغم انگیز شد	طرب بی رخش اندہ آمیز شد
چنان در غم ہجر خود کردہ شد	دل از یاس زان گونہ پروردہ شد
نہ جنبد ز پہلو پس از سال و ماہ	بگہوارہ چشم طفل نگاہ
از ان نور شمع دل افروختم	خسک راز ظلمات غم سوختم
ولی خدا شاہ مردان علی	لبالب ز مہرش خفی وجلی
مجو عافیت در جہاں خراب	مجو نیم شب پرتوی آفتاب
کنون ساقیا گل سحر خیز شد	نسیم چمن عنبر آمیز شد
مئ دہ کہ بیدار ساز دمرا	بدیوانگی یار ساز دمرا
از ان مئ کہ شائستہ عام نیست	بمنصورھم تاب نہ جام نیست
از ان مئ کہ چون خاطر آراء شود	ز کیفش پیر برنا شود
سر از جیب مینا چو بیرون کند	زمین وزمانرا دگر گون کند
گریزان شوائے غافل بے خبر	چنین تا بکی خفتہ باشی دگر
کریما رحیما گناھم بہ بخش	سراپا چو دل عذر خواھم بہ بخش

مولانا اوجی کشمیری کے ''ساقی نامہ'' کو کافی شہرت حاصل ہوئی ہے۔ ملا عبدالنبی نے ایک

اہم واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جس زمانے میں اجمیر میں مولانا محمد صوفی کی خدمت میں تھا۔ ۱۳؎ ایک شخص کشمیر سے تشریف لے آیا تھا اور انہوں نے گفتگو میں اوجی کشمیر کا ذکر چھیڑا اور اس کے ''ساقی نامہ'' میں سے یہ شعر پڑھا ؎

مرا دامن خویش زنجیر شد　　مرا دست در آستین پیر شد

مولانا محمد صوفی یہ شعر سن کر بہت ہی محظوظ ہوا اور فرمایا:

''اگر پیش از آنکہ ساقی نامہ بگویم این بیت بگوش من میرسید ارادۂ مثنوی گفتن نمیکردم'' ۱۴؎

اکثریت کا خیال وفکر یہ تھا کہ اوجی کشمیری شیعہ تھے ۱۵؎ اور کہا جاتا ہے کہ اوجی کشمیری کا سال وفات ۱۰۳۳ھ بتایا جاتا ہے ۱۶؎۔

مولانا اوجی کشمیری کے ''ساقی نامہ'' میں بڑی حد تک رنگینی دکھائی دیتی ہے ۱۷؎ اس کی عکاسی پیر غلام حسن شاہ کھویہامی نے اپنی تصنیف تاریخ حسن میں کرتا ہے:

''ساقی نامہ بکمال متانت ورنگینی گفتہ است ودرھا سفتہ است' دیوانی پر از معانی رنگین است'' ۱۸؎

علاوہ ازیں حضرت خواجہ محمد اعظم دیدہ مری اپنی تصنیف واقعات کشمیر میں لکھتا ہے:

''مہر اوج بلاغت وہنر پروری بود.... آنبوکش خمخانہ معانی ساقی نامہ رنگینی گفتہ ودرغرر مضامین بالماس اندیشہ فکرت پیشہ سفتہ'' ۱۹؎

مولانا اوجی کشمیری کا شمار چونکہ دسویں صدی ہجری کے اعلیٰ پایہ کے غزل سرایان میں ہوتا ہے اور تذکرۂ شعراء کشمیر میں لکھا گیا ہے:

''از غزل سرایان خوب قرن دھم بودہ'' ۲۰؎

مولانا اوجی کشمیری نے ''ساقی نامہ'' لکھ کر عشق ومحبت کی روح کو ابھارا۔ اس کے اشعار میں فلسفیانہ' اخلاقی اور عارفانہ روح نظر آتا ہے۔ اوجی کشمیری دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری سے متاثر اور غمگین ہو جاتا ہے اس کو تصور آخرت یاد آجاتا ہے اور حساب کتاب کا منظر پلے پڑتا ہے۔ ان حالات سے گھبرا کر وہ محبوب کے دامن میں پناہ لینا چاہتا ہے اور وہ اس شراب کا متلاشی ہے جس کا ایک گھونٹ پی کر دنیا و مافیہا سے کنارہ کش ہو جائے اور غم واندوہ سے نجات پائے۔ انہوں نے اپنی زندگی پریشانیوں اور رنج وآلام میں گذاری۔ زمانے کے ہاتھوں ظلم وستم سہتے اور اپنے دکھ درد کو اس طرح بیان کرتے رہے ؎

از ین فرقت آباد' تابودہ ام　　جز از زہر غم لب نیا بودہ ام

کنارم پر از شک چو اخگر ست زخون خوردن دل، دماغم تر ست

بجز گریہ نکشودہ ام دیدہ را کہ ذوق نظر نیست غمدیدہ را

لب از ھم بجز نالہ نکشادہ ام بماتم مگر تو امان زادہ ام

مرا زشک، دامن گلستان شدہ است مرادست، خصم گریبان شدہ است

اس کے معاصر شعراء اور تذکرہ نویس اوجی کشمیری کے اشعار سے بے حد متاثر ہو چکے تھے اور اکثر تذکرہ نگاروں نے اس کے زورِ کلام کو سراہا ہے صاحب ''عرفات العاشقین'' لکھتے ہیں:

''کوکب اوجی بی نظری اوجی کشمیری، از شعرای ہمین عصر ست بحر طبعش در نہایت فوج، کوکب ادراکش در غایت اوجست، فوج بیانش زور مند، واوج کلامش بلند واقعست'' ۲۲ ؎

مولانا اوجی کشمیری کا کلام بلاغت اور ہنر پروری میں بے مثال تھا کیونکہ آنے والے شعراء کے لیے اس کا کلام تقلید کا باعث بنا۔ صائب جیسے قادر الکلام شاعر نے اوجی کشمیری کی تقلید کی ہے۔ آجکل اگرچہ اوجی کشمیری کی غزلوں کے بہت کم نمونے میسر ہیں اور ان چند نمونوں کو مد نظر رکھ کر اس بات سے قطعی طور منہ نہیں موڑا جا سکتا ہے کہ اوجی کشمیری نے غزلوں میں اپنے معاصر شاعر مظہری کشمیری کی طرح مکتب وقوع کی ہی پیروی کی تھی اوجی کشمیری کے چند اشعار ملاحظہ ہیں ؎

ہر سر کہ بستہ خم فتراک او بود دانم یقین کہ روز جزا سرخ رو بود

از بس خیال زلف تو در سینہ جا گرفت آہیکہ سر زند ز دلم مشکبو بود

الغرض مولانا اوجی کشمیری اکبری اور جہانگیری دور کے برگزیدہ شاعر گزرے ہیں انہوں نے غزل گوئی اور مثنوی میں اپنا لوہا منوایا اور وہ اپنے زمانے کے شعراء کے مقابلے میں کم پایہ کے شاعر نہیں تھے۔

حوالہ جات:

۱۔ تذکرہ شعرائے کشمیر ج۔۳ ص ۲۳۔۲۸

۲۔ تذکرہ میخانہ مقدمہ از ملا عبدالنبی ص ۱۲

۳۔ صبح گلشن ص ۵۰۲

۴۔ واقعات کشمیر ص ۱۱۵

۵۔ تذکرہ شعرائے کشمیر ج۔۳ ص ۲۳۔۲۸

۶۔ تذکرہ راشدی ج۔۳ ص ۲۴،واقعات کشمیر ص ۱۳۷
۷۔ ایضاً
۸۔ تذکرہ میخانہ ص ۳۳۷
۹۔ ایضاً
۱۰۔ ایضاً
۱۱۔ واقعات کشمیر ص ۱۳۷
۱۲۔ تاریخ حسن ج۴۰ ص ۸
۱۳۔ ھفت اقلیم از امین احمد رازی ورق ۳۸۵ الف
۱۴۔ تذکرۂ میخانہ ص ۳۳۷
۱۵۔ اسلامک کلچر ان کشمیر ص ۱۹۹
۱۶۔ واقعات کشمیر ص ۱۳۷
۱۷۔ کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ ص ۱۱۲
۱۸۔ تاریخ حسن ج۔۴ ص ۷۔۸
۱۹۔ واقعات کشمیر ص ۱۳۷
۲۰۔ تذکرہ شعرائے کشمیر ج۔۳ ص ۲۸
۲۱۔ تذکرہ میخانہ ص ۳۳۷
۲۲۔ ایضاً
۲۳۔ تاریخ حسن ج۔۴ ص ۹

☆☆☆

Contribution of Mahakavi Moinkutty Vyadyar to Arabic Malyalam Literature:A Mappila Folk Literature in Kerala by Dr.Rafeed Ali

(Asst.Prof. MANUU college of Teacher Education,Bhopal)

ڈاکٹر رفید علی۔ ای (اسسٹنٹ پروفیسر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، بھوپال) Asst. cell-9961031072

عربی ملیالم ادب میں مہاکوی موئن کُٹی ویڈیار کی شراکتیں

(کیرالہ میں ایک میپیلا لوک ادب)

خلاصہ: موئن کُٹی ویدیار (1852–1892)، جسے اکثر مہاکوی (عظیم شاعر) کہا جاتا ہے، تاریخی طور پر ملیالم زبان کی میپیلا پٹو صنف کے سب سے مشہور شاعروں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے. ان کے والد آیورویدک ادویات کے مشہور پریکٹیشنر اور شاعر بھی تھے. موئن کُٹی ویدیار نے آیورویدک طبی مشق جاری رکھی اور ساتھ ساتھ سنسکرت اور عربی زبانیں سیکھیں۔ ان کا انتقال 1892 میں 40 سال کی عمر میں ہوا۔ سترہ سال کی بہت چھوٹی عمر میں، اس نے رومانوی مہاکاوی بدرالمنیر ۔ حسن الجمال (1872) مرتب کیا۔ اس میں اجمیر کے بادشاہ محزن کے بیٹے شہزادہ بدرالمنیر اور اس کے وزیر مزمیر کی بیٹی حسن الجمال کے درمیان ایک خیالی محبت کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ بیان کیے گئے زیادہ تر واقعات خالص فنتاسی ہیں، جن میں ہیرو کا پرندے اور پیچھے میں تبدیل ہونا اور جنوں کے ساتھ متواتر تعامل شامل ہیں۔ بعد میں شاعر کی تخلیقات نے بہت مختلف انداز اپنایا۔ یہ کام بنیادی طور پر جنگی گیت تھے۔ بدر پدپٹو اور ملاپورم پدپپٹ اس صنف کے سب سے مشہور گانے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے بہت سے گیت لکھے ہیں جو سکرین ایفیکٹ کے ساتھ بیان کے مخصوص انداز کے ہیں۔ موئن کُٹی ویدیار کے گیت ان کے تخیل کی گہرائی، استعارے کی خوبصورتی، اس میں شامل تخلیقی تقابل اور ان کے اشکال (دھنوں/موڈز) کے تنوع سے پہچانے جاتے ہیں۔ نظمیں عربی ملیالم، سنسکرت کی ہائبرڈ زبان اور بعض اوقات خالص عربی میں مکمل جملے کے لیے بھی قابل ذکر ہیں۔ قومی ثقافت میں ان کی شراکت پر

غور کرتے ہوئے کیرالہ کی حکومت نے 1991 میں ان کے نام سے ایک ثقافتی مرکز قائم کیا، جس کا نام مہا کیوی موئن کُٹی ویدیا رسمارکا ہے تا کہ ان کی شراکت میں تحقیق کو فروغ دیا جا سکے۔ اس مقالے میں ماپیلا لوک ادب کے ذریعے چمکنے اور بھرپور ہندوستانی ثقافتی ورثے کو محفوظ کرنے کے لیے معین کُٹی ویڈیار کے تعاون کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تعارف: موئن کٹی ویدیار (1892–1852)، جسے اکثر مہا کوی (عظیم شاعر) کہا جاتا ہے، تاریخی طور پر میپیلا پٹو کے سب سے مشہور شاعروں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے، جو کہ عربی ملیالم زبان میں لکھا گیا ایک لوک میپیلا آرٹ ہے، عربی ملیالم زبان میں لکھا گیا ایک لوک میپیلا آرٹ، ایک لوک زبان کیرالہ میں 16–17 صدی کے دوران ابھری. وہ 1852 میں کیرالہ کے ملاپورم ضلع میں اوٹو پارکوزی، کنڈوٹی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک شاعر اور اس وقت کے مشہور آیورویدک پریکٹیشنر تھے۔ موئن کٹی ویدیار بھی ایک آیورویدک پریکٹیشنر تھا، اس لیے انہیں وائیڈیر کہا جاتا ہے۔ کیرالہ کی ثقافت میں ویڈیر، کا مطلب روایتی آیورویدک پریکٹیشنر ہے۔ موئن کٹی ویدیار ایک پولی گلوٹ تھا۔ وہ ملیالم، سنسکرت، انگریزی، عربی، کنڑ، فارسی، تامل، تولو، تیلگ اور اردو زبانیں جانتا ہے۔ انہوں نے کئی نظمیں اربک ملیالم اسکرپٹ مرتب کیں جن میں مختلف زبانیں شامل تھیں۔ ان کا انتقال 40 سال کی عمر میں 1892 میں ہوا۔ ان کی قبل از وقت موت کے بعد ان کے والد نے 27 ویں عشال سے ہجرت کے نام سے اپنا نامکمل کام مکمل کیا۔

عربی ملیالم زبان: عربی ملیالم میپیلا مسلم کمیونٹی کی روایتی دراوڑی زبان ہے جسے میپیلا ملیالم اور موپلہ ملیالم بھی کہا جاتا ہے. یہ کئی ہزار لوگ بولتے ہیں جو جنوبی ہندوستان کی ریاست کیرالہ کے مالابار ساحلی علاقے میں رہتے ہیں۔ عربی ملیالم زبان ملیالم، عربی اور فارسی وغیرہ جیسی زبانوں سے بنی ہے۔ یہ زبان ایک صحت مند ہندعرب تعلقات اور ثقافت کی ایک اہم علامت ہے جو 16–17 صدی میں موجود تھا. اگرچہ رسم الخط کیرالہ میں شروع ہوا اور تیار ہوا، لیکن یہ زبان جنوب مشرقی ایشیاء خصوصاً ملائیشیا اور سنگاپور میں مختلف میپیلا/مسلم مہاجر کمیونٹیز کے درمیان استعمال ہوتی رہی ہے. مزید یہ کہ یہ زبان شمالی کیرالہ میں نچلی ذات کے غیر مسلموں اور دکشینہ کنڑ کے مسلمانوں میں بھی استعمال ہوتی ہے. عربی ملیالم رسم الخط ابجد ہے. رسم الخط کو خطا فنانی یا پونانی رسم الخط کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہ کئی

اقلیتی زبانیں لکھنے کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے جیسے کہ ایراندان اور جیسیری زبان. عربی ملیالم رسم الخط عربی رسم الخط کا استعمال کرتے ہوئے ملیالم لکھ کر بنایا گیا تھا۔اس زبان نے ہندوستانی شہریوں کا عربی تاجروں کے ساتھ رابطہ آسان بنا دیا۔ملیالم یونیورسٹی، کیرالہ نے کیرالہ کے ملاپورم ضلع کے ترور میں عربی ملیالم زبان کے مطالعہ کے لیے ایک مرکز قائم کیا ہے. اگرچہ عربی ملیالم زبان 16-17 ویں صدی کے دوران تیار کی گئی تھی پھر بھی اس رسم الخط کو کیرالہ اور لکش دیپ کی مسلم کمیونٹی اپنے مذہبی تعلیمی مقاصد اور ثقافت اور فنون کے تحفظ کے لیے بڑے پیمانے پر استعمال کرتی رہی ہے جو پہلے دور میں وضع کی گئی تھی.

حروف اور رسم الخط:

عربی ملیالم خطوط میں 14 حرف (Vowels) اور 37 حرف حرف (Consonants) ہیں۔کل 51 حروف عربی ملیالم زبان میں ہیں. عربی، ایک سامی زبان پر مشتمل حروف کا استعمال کرتے ہوئے ملیالم زبان کو لکھنے میں بہت سی پیچیدگیاں تھیں۔عربی آرتھوگرافی سے صرف 28 حروف دستیاب تھے تا کہ ملیالم کے 53 سے زیادہ فونیم پیش کیے جاسکیں۔اس مسئلے کو عربی ملیالم زبان میں فارسی کے لیے قائم کردہ اضافی حروف بنانے کے انداز پر عمل کرتے ہوئے حل کیا گیا. عربی حروف تہجی میں پ، گھ، ژ، (?, ?, ?, ?)

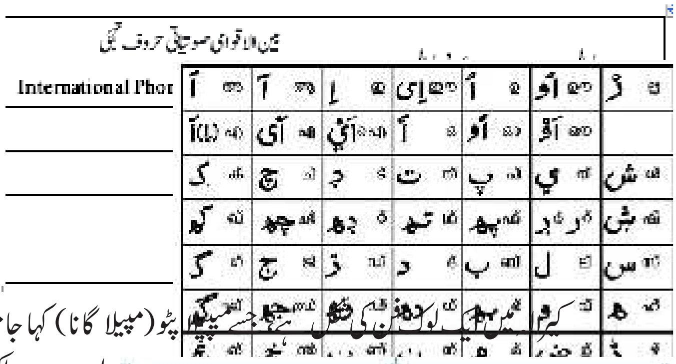

کیرالہ میں ایک لوک فن کی شکل ہے جسے مپیلا پٹو (مپیلا گانا) کہا جاتا ہے، زیادہ تر ... یالم زبان میں لکھی جانے والی

محی الدین مالہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلا عربی ملیالم اسکرپٹ والا ناول، چہار درویش، فارسی کام کا ملیالم ترجمہ، 1883 میں شائع ہوا

تھا۔موئن کُٹی ویدیار جیسے دانشوروں نے سنسکرت میں نمایاں تعداد میں کاموں کا ترجمہ کیا۔ جیسے اشٹنگ ہردیا، امراکوسا، پنچتنترا اور یہاں تک کہ ہندو بادشاہ وکرمادتیہ کے بارے میں افسانوں کا عربی ملیالم میں ترجمہ کیا۔سنسکرت طبی متون۔ جیسے اپکاراسارا، یوگرمبھا اورمہاسارا۔کا بھی ترجمہ کیا گیا، اور پھر عبدالرحمن مسلیار جیسے اسکالرز نے عربی ملیالم میں ترجمہ کیا۔عربی ملیالم رسم الخط کے رسالوں نے 20ویں صدی کے اوائل میں کیرل میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے قابل ذکر تعاون کیا۔

عربی ملیالم زبان میں معین کٹی وائیڈیرکا کی شراکتیں: معین کٹی وائیڈیر اپنی 40سال کی عمر میں میپیلا پٹو کی شکل میں بہت سی نظمیں لکھی ہیں، جو بہت مشہور ہوئیں اور تاریخی، ثقافتی اور ادبی لحاظ سے اہم ہیں. ان کے تمام کام مختلف زبانوں کا استعمال کرتے ہوئے مرتب کیے گئے ہیں، جیسے ملیالم،عربی، اردو، فارسی، تامل، اردووغیرہ. ان کی اہم شراکتیں ذیل میں پیش کی جارہی ہیں۔

بدرالمنیر ۔حسن الجمال (1872)سترہ سال کی بہت چھوٹی عمر میں، اس نے رومانوی مہاکاوی بدرالمنیر ۔حسن الجمال (1872) لکھا۔اس میں اجمیر کے بادشاہ محزن کے بیٹے شہزادہ بدرالمنیر اور اس کے وزیر مزمیر کی بیٹی حسن الجمال کے درمیان ایک خیالی محبت کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ بیان کیے گئے زیادہ تر واقعات خالص فنتاسی ہیں، جن میں ہیرو کا پرندے میں تبدیل ہونا اور دوبارہ واپس آنا، اور جنوں کے ساتھ متواتر تعامل شامل ہیں۔

پڈپاٹ: بدرالمنیر حسن جمال کی تحریر کی تکمیل کے بعد شاعر نے اپنی تحریر میں بالکل مختلف انداز اپنایا. انہوں نے جنگوں کی داستان کو گیتوں کی صورت میں پیش کیا۔ان کاموں کو پدپاٹ کہتے ہیں۔ بدر پدپٹو اور ملاپورم پدپپٹ سب سے زیادہ مقبول گیت ہیں جو مون کٹی ویدیار نے اس صنف کے لکھے ہیں۔

بدر پڈپاٹ : شبوات البدر الکبری، جسے بدر پدپٹو کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسے میپلپپاٹ کی بہترین تحریر میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔اس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اوران کے ساتھیوں کی جنگ بدر کی کہانی بیان کی گئی ہے۔

ملاپورم پڈپاٹ: ملاپورم پدپٹو(1883) کومدنیدھی مالا کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہ گانا18 ویں اور 19ویں صدی کے دوران ملاپورم میں نسلی بنیادوں پر پیش آنے والے نسلی واقعات اور کسانوں کی

دردناک زندگی اور مالا پورم میں جنمیوں کے خلاف کسانوں کی جدوجہد کو بیان کرتا ہے۔1763 میں پارانمبی نامی ایک مقامی زمیندار کا علی مرکر نام کے اپنے ایک افسر سے جھگڑا ہوا۔اس تنازعہ نے زمینداروں (ایک طرف) اور میپلوں، نچلی ذات کے ہندوؤں (دوسری طرف) کے درمیان ایک بڑی لڑائی شروع کر دی۔اس جنگ میں 44 مسلمان (مپیلا) اور ایک نچلی ذات کا ہندو (سنار) مارے گئے۔کچھ دیر بعد نمبی کو اپنے عمل پر پچھتاوا ہوا اور اس نے میپلس کے ساتھ قضاء کا فیصلہ کیا۔یہ ملاپورم پدپٹو کا موضوع تھا۔یہ کام 68 ایشال، چار وامبس اور ایک کتھیر اپچٹم پر مشتمل تھا۔اس میں بادشاہ چیرامن پیرومل کی کہانی کا بھی حوالہ دیا گیا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مکہ مکرمہ گیا اور اسلام قبول کیا۔

شاعر کے دیگر اہم کام:

عظیم شاعر معین کٹی ویدیر کی طرف سے مکمل کیے گئے دیگر اہم کام درج ذیل ہیں۔

- سلاسیل
- الی پڈا (چوہوں کی لڑائی، ایک پنچتنتر کی کہانی پر مبنی)
- اوٹکلتنٹیم مانینٹیوم کدھ (اونٹ اور ہرن کی کہانی)
- بیتھیلا پٹو (ایسے گانے جو پان کے استعمال کے فوائد اور اس سے وابستہ رسم و رواج اور لوک طریقوں کی تعریف کرتے ہیں
- حجرہ
- کلاتمالا
- مول پورانم
- احد پڈپاٹ (احد جنگ کی افسانوی کہانی بتاتا ہے)
- تھیوندی چنتھ
- سولیقت
- ملاپپو چولائیل
- کرامت مالا۔

نظم کی پیشکش کا انداز:

موئن کٹی ویدیار کی تحریریں ان کے تخیل کی گہرائی اور ان کی نظم میں استعمال ہونے والے استعاروں کی خوبصورتی، اس میں شامل تخلیقی تقابل اور ان کے اشعار (دھنوں/طریقوں) کی تنوع سے ممتاز تھیں۔ ان کی نظموں میں اس وقت کے مسلمانوں کے جذباتی مظہر کی عکاسی کی گئی تھی، جس میں رومانیت، عقیدت اور سماجی حقیقت پسندی جیسی ادبی شکلیں استعمال کی گئی تھیں۔ ویدیار کے بدر پڈپاتو کے میدان جنگ میں گھوڑوں کے چال کی عمدہ تصویر کشی شاعر کے طرزِ بیان کی خصوصی مثال ہے۔ گھوڑوں کا سرپٹ دوڑنا، ان کے ٹاپوں کا زمین پر پڑنا، ان کی بجلی کی تیز رفتار، ہوا میں دم کا لہرانا اور اڑنا، لگام کھینچنے والے سواروں کا جوش اور گھوڑوں کی پرورش۔ یہ سب مل کر قاری کو ایک خاص اثر فراہم کرتے ہیں۔ نظمیں اس لحاظ سے خاص ہیں کہ شاعر نے عربی ملیالم، سنسکرت کی زبان کا ہائبرڈ ورژن استعمال کیا ہے۔ بعض اشعار خالص عربی زبان میں بنتے ہیں۔

حکومت کی طرف سے خراج تحسین: تجربہ کار شاعر کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے کیرالہ کی حکومت نے 1999 میں کونڈوٹی میں شاعر کی جائے پیدائش پر مہاکوی موئن کُٹی ویدیار سمارکا کے نام سے ایک ثقافتی مرکز قائم کیا۔ مرکز کا بنیادی مقصد بدر پڈپاٹ پر تحقیق کو راغب کرنا، اور تنقیدی یا وضاحتی نوٹ یا تبصرہ کرنا یا پیش کرنا ہے۔ تحقیقی مرکز کا مقصد موئن کٹی ویدیار کے کاموں پر مزید مطالعہ کرنا اور ملیالم زبان میں بھی موثر تشریحات کرنا ہے. ہ مرکز میپیلا پاٹا اور میپیلا کلی میں سرٹیفکیٹ کورس چلاتا ہے. اس میں لوک داستانوں کے مطالعہ کا مرکز، حوالہ لائبریری اور اس سے منسلک ایک تاریخی میوزیم بھی ہے۔ ہر سال یہ ویدیار مہوتسوم کا انعقاد کرتا ہے، ایک دو یا تین روزہ تہوار جس میں میپیلا آرٹ کی تمام شکلوں سے متعلق ثقافتی اور ادبی پروگرام شامل ہوتے ہیں۔ ویدیار میموریل لیکچر بھی میلے کے دوران دیا جاتا ہے. مرکز نے 2005 میں ان کی تخلیقات کی دو جلدوں کی تالیف بھی مرتب کی ہے، اس کا نام مہاکوی موئن کُٹی ویدیار، سمپورنا کرتیکل رکھا گیا تھا۔

کتابیات

1. Malayalam literary survey: Volume 16, Issue 1 – Volume 17, Issue 4, K?ra?a S?hitya Akk?dami – 1994,

2. Mappilappattu - Padhavum Padhanavum (Mappila songs - Study and Lessons) - Balakrishnan Vallikkunnu and Dr. Umar Tharamel, D.C. Books, 2006

3. "Mappila songs cultural fountains of a bygone age, says MT". The Hindu. Chennai, India. 31 March 2007. Archived from the original on 8 November 2012. Retrieved 15 August 2009.

4. "Documenting Kozhikode's rich tradition". The Hindu. Chennai, India. 15 October 2007. Archived from the original on 15 October 2007

5. Kerala Muslims: a historical perspective, Asgharali Engineer, Ajanta Publications, 1995,

6. An Analysis on Hybridization in Arabi Malayalam. Prof Saidalavi Cheerangote. April 2012 International Review of Social Sciences & Humanities;2012, Vol. 3 Issue 1, p96,

7. Indian literature, Volume 47, Issues 1-3, Sahitya Akademi., 2003

8. mpcc.kerala.gov.in/vsb_mal/images/stories/downloads/cult_inst.pdf

9. Remembering Moyinkutty The Hindu Thursday, Jun 30, 2005

10. Panakkal, Abbas Islam in Malabar (1460-1600) : a socio-cultural study /. Kulliyyah Islamic Revealed Knowledge and Human Sciences, International Islamic University Malaysia.2016

11. Kallen, hussain Randathani. "Trade and Culture: Indian Ocean Interaction On The Coast Of Malabar In Medieval Period".

12. Miller, Roland. E., "Mappila" in "The Encyclopedia of Islam". Volume

VI. E. J. Brill, Leiden. 1987..

13. Sharafudeen, S. "Muslims of Kerala: a Modern Approach, "Kerala Historical Society, 2003.

14. "Documenting Kozhikode's rich tradition". The Hindu. Chennai, India. 15 October 2007. Archived from the original on 15 October 2007.

15. "Mappila songs cultural fountains of a bygone age, says MT". The Hindu. Chennai, India. 31 March 2007. Archived from the original on 8 November 2012. Retrieved 15 August 2009.

16. Ishal Paithrukam, Quarterly Magazine of the Mahakavi Moyinkutty Vaidyar Memorial Center for Studies and Research on Folk and Mappila Arts (SCARF)Vol 1, Pg 70-72,

17. An Analysis on Hybridization in Arabi Malayalam. Prof Saidalavi Cheerangote. April 2012 International Review of Social Sciences & Humanities;2012, Vol. 3 Issue 1, p96

☆☆☆

Asif Jahi Khandan ka Qayaam:Ek Tarikhi Tanazur by Khalid Husain

Khalid Mir(Research Scholar Dept.of Persian MANUU (Hyderabad)

خالد حسین میر(ریسرچ اسکالرشعبہ فارسی۔مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد)

آصف جاہی خاندان کا قیام:ایک تاریخی تناظر

1707ء میں اورنگ زیب کی موت کے بعد مغلیہ سلطنت بہت تباہ ہوگئی۔کمزور مختلف صوبوں کیصوبیداروں نے اپنی آزادیپر زور دینے کی کوشش کی، دکن کا صوبیدار میر قمرالدین خان چن قلیچخان تھا جو کہ مقبول تھا۔نظام الملک کے لقب سے جانا جاتا ہے۔نظام الملک آصف جاہ اول (1724-1748 تھا۔مضبوط ترین شخصیات میں سے ایک جو افراتفری کے دور میں ابھری۔ اورنگ زیب کیموت کے بعد مغل اقتدار کا زوال۔کےطور پر تعینات کیا گیا تھا1714ء میں دکن کا صوبیدار(وائسرائے)۔اپنے دوسال(1713-15)کے دوران وہ دکن کانظم ونسقجھال کرنے میں کامیاب رہا۔لیکن اسے 1715 میں دہلی واپس بلالیا گیا۔حیدرآباد میں ان کی جگہ سید حسین علی خان نے لی فرخشیار کے دور میں نظام الملک کو سید نے مالوہ کا صوبیدار بنا کر بھیجا تھا۔لیکن اپریل 1720 میں قمرالدین خان وہاں سے چلے گئے۔مالوا اور دہلی میں وزیر کا عہدہقبول کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔لیکن 1724 میں وہ دکن چلے گئے۔راستے میں اس نے پکڑلیا۔اسیر گڑھ اور برہان پور اور سید بھائیوں کی بھیجی ہوئی دونوں فوجوں کو شکست دی۔دلاورعلیخان اور عالم علی خان کی سربراہی میں۔ اسی دوران سید دکن کے صوبیدار حسین علی خان کو قتلکر دیا گیا۔نظام الملک کی پوزیشن کو مضبوط کیا۔اس نے ایک بننے کی پیشکش قبول کرلی شاہی عدالت کیوزیر. تین سال تک دہلی رہے۔لیکن 1724 میں اس نے دہلی چھوڑ دیا۔حیدرآباد کے لیے کیونکہ وہدارالحکومت کی سازشوں سے بیزار تھا۔اس نے 11 اکتوبر 1724 کو دکن کے صوبیدار مبارز خانکوشکر کھیڑا میں شکست دی۔یہ جنگ دکن میں نظاموں کی موروثی حکومت کے قیام کی نشاندہیکرتی ہے۔شہنشاہ، محمد شاہ نے اس قابلیت کو پہچان لیا۔اس نے نظام الملک کودکن کا صوبیدار مقرر کیا اور اسے آصف جاہ کا خطاب دیا۔

1737:نظام پر شہنشاہ کی طرف سے امپیریل کیپیٹل واپس جانے کے لیے دباؤ ڈالا گیا، جو اس نے کیا، اپنے بیٹے ناصر جنگ کو دکن کا انچارج چھوڑ دیا۔نادرشاہ کے دہلی پر تباہ کن حملے کے بعد تکوہ دہلی

میں ہی رہا۔جس سے سلطنت کبھی بحال نہ ہوسکی۔ جونظام کے بادشاہوں یا بعد میں ریاستحیدرآباد کا انداز اختیار کیا گیا، اصل میں مغل دکن کےصوبیدار تھے۔آصف جاہی خاندان کے بانینظام الملک آصف جاہ نے مغل دکن کی نائب شاہی حکومت کی۔

ثقافتی حالات: سابقہ حیدرآباد ریاست اپنی جامع یا کاسمو پولیٹن ثقافت کے لیے بہت مشہور ہے۔ فارسی، اردو، تیلگو، مراٹھی اور کنڑ زبانیں بولنے والے لوگ ایک برادری کے افراد کی طرح اکٹھے رہتے تھے۔ فارسی 1893 تک سرکاری زبان رہی اور اس سال سے لے کر 1948 میں حکومت کے اختتام تک اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل رہا۔ان کے علاوہ ہندی اور انگریزی بھی بولی جاتی ہیں، لیکن بنیادی زبانوں کے طور پر نہیں۔حیدرآباد شہر کی کائناتی نوعیت کی وجہ سے، ہندوستان کے تمام حصوں اور غیر ملکی سرزمین سے لوگ یہاں آتے تھے، اور مختلف مذاہب کے ماننے کے باوجود ہم آہنگیاور امن سے رہتے تھے۔تلگو ادب قطب شاہیوں کے دور حکومت میں افزودہ ہوا، جو آصفجاہیوں کینامور پیشرو تھے۔16ویں صدی کے اڈانکی گنگادھرا کاوی اور گولکنڈہ کے رہنے والے نے اپنا کام ابراہیم قطب شاہ کو وقف کیا۔

مذہبی اور سماجی ادارے: حیدرآباد کے مذہبی سماجی اور تعلیمی اداروں میں، عمر کے ذریعے، سے لوگوں کو اپنی طرفمتوجہ کرنے کے لئے طاقتور مقناطیس کے طور پر کام کیا ہندوستان کے متنوع حصے اور مختلفثقافتی پس منظر والے۔انہوں نے حیدرآباد سوسائٹی کے ان متنوع عناصر کو مربوط کرنے میں بھیکلیدی کردار ادا کیا ہے۔ یہ ادارے ہندوستان کے ثقافتی ورثے کی عکاسی کرتے ہیں۔ سابقہ حیدرآباد ریاست کی سوسائٹی بنیادی طور پر دیہی پر مبنی تھی۔جیسا کہ تقریباً 88 فیصد آبادی دیہات میں رہتیہے۔ناقص شرح خواندگی جو 1940 میں 70 خواندہ فی 1000 افراد پر تھا۔41 باقی سب سے کم نہصرف برطانوی ہندوستانی صوبوں کے مقابلے میں، بلکہ اس کے برابر بھی کچھ مقامی ریاستوں کیمقابلے، جیسے ٹراوانکور، کوچین، میسور وسطی صوبے اور برار اور نقل وحمل اور مواصلات کیغیر ترقی یافتہ ذرائع نے اندرونی اور بیرونی تبادلے اور اثرات کو متاثر کیا۔ معاشرے کی تنظیمبنیادی طور پر ان دستکاریوں یا پیشوں پر مبنی بنی جس کا تعاقب معاشرے کے مختلف طبقے کرتیتھے۔ذاتیں، جیسے کاپس، یا کاشتکار، کمار ی یا لوہار، بیچنے والے یا بننے والے، گولہ یا چرواہے، ماڑیگا یا موچی وغیرہ کے پاس ان کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے۔مہانکالی مندر، سکندرآباد مہانکالی کا مندر، جو تقریباً 150 سال پہلے بنایا گیا تھا، ۔سکندرآباد شہر کا بازار علاقہمیں واقع ہے۔

یہ دیوی کالی کے لیے وقف ہے۔ جو برائی پر اچھائی کی فتح کی نمائندگی کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہمندر ایک عقیدت مند شری سورتی اپایا نے تعمیر کیا تھا جس نے 19 ویں صدی کے اوائل میں برطانوی فوج میں خدمات انجام دی تھیں۔ اجین میں اپنے قیام کے دوران، وہ روزانہ کالی کے مندر میں جاتے تھے تاکہ اپنے کام کی کامیابی سے تکمیل اور اپنے گھر میں محفوظ واپسی کے لیے دعا کریں۔ اپنی روزانہ کی دعاؤں میں، شری سورتی اپایا کالی کا مندر بنانے اور ساری زندگی پوجا کرنیکا حلف لیتے تھے۔ اس نے کامیابی کے ساتھ اپنا کام مکمل کیا اور 1815 میں سکندرآباد واپس آیا اور فوری طور پر اس جگہ کالی کی لکڑی کی مورتی نصب کی جہاں موجودہ مندر کھڑا ہے اور باقاعدگی سے پوجا کرنے لگا۔ اس وقت مندر کو اجین مہانکالی کہا جاتا تھا۔ سنہ 1864 عیسوی میں، کالی کی سنگ مرمر کے پتھر کی مورتی کو اجین سے لایا گیا تھا اور صحیفوں کے مطابق اسیمندر میں نصب کیا گیا تھا۔

معاشی حالات: نظام حکمرانوں نے زراعت کے فروغ کے لیے آبپاشی کو اہمیت دی۔ حیدرآباد میں آبپاشی کے کاموں میں 5,362 اضافہ ہوا ہے۔ ٹینک، 14,494 کنٹاس اور 1,36,568۔ 1868 ـ84 کے دوران مکملہونے والے پروجیکٹ میں ابراہیم پٹنم پروجیکٹ، بالکاپور چینل شامل ہیں۔ 19 ویں صدی کے آخر میں بنور، محبوب نگر پروجیکٹس شروع کیے گئے۔ انہوں نے ٹنگھبدرا، نظام ساگر کو مکمل کیا اور ناگارجن ساگر کا ابتدائی کام اسی عرصے میں شروع کیا گیا۔ 1875 سے 1940 تک ٹینک کی آبپاشیمیں نوگنا اضافہ ہوا، جب کہ تلنگانہ میں کل آبپاشی میں سات گنا اضافہ ہوا۔ کئی درمیانے درجے کیآبپاشی کے منصوبے، ان میں قابل ذکر ہیں۔ 1920 میں بڑے دریاؤں کی معاون ندیوں کی تعمیر سینمٹا گیا۔ کئی درمیانے درجے کیآبپاشی کے منصوبے، ان میں قابل ذکر ہیں۔ گھن پور میں پوچارم، ڈنڈی، پالیر، وائرا، منیر اور اپنی کٹس تھے۔ گوداوری پر منجیرا اور خانپور کاشت میں توسیع کی وجہ سے، باقاعدگی سے جائزوں اور فائدہ مند آبپاشی کے منصوبوں کیوجہ سے زرعی پیداوار اور اس کی مارکیٹ میں اضافہ ہوا۔ ریاست درآمد شدہ اشیاء جیسے پھل، ریشم، کپاس کی چیزیں، افیون، خوشبوئیں اور منشیات، روح، چینی، معدنیات، ریشم اور نمک وغیرہ۔ چیف برآمدات میں اناج، تیل کے بیج، کپاس کے بیج، انڈگو، لکڑی، گڑ، کاغذ اور لائیو اسٹاک کبیر آمدات درآمدات کے مقابلے میں زیادہ تھیں۔ تجارتی سرگرمیوں میں منڈیوں نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ مختلف قسم کے بازاروں میں ریگولیٹڈ مارکیٹس، غیر ریگولیٹڈ مارکیٹس، منڈی، گانجہ، ہفتہ وار بازار، متواتر بازار، عرس، میلے، جاترا اور مویشی بازار شامل ہیں۔ نظام حکومت نے ریاست میں تجارت کی حوصلہ افزائی کی اور

تجارت کے لیے ریلوے اور بسوں جیسی نقل وحمل کی سہولیات فراہم کیں۔حکومت نے ریاست کے اندر اور ریاست سے باہر تاجروں کو تحفظ فراہم کیا نظام کی ریاستی ریلوے پر ریلوے کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ اور جیسے جیسے کام آگے بڑھتا گیا یہ تیزی سے واضح ہوتا گیا۔ 1871 ریاست بڑھتے ہوئے مالی بوجھ سے نمٹنے کے قابل نہیں تھی۔ جو اس پر رکھا گیا تھا۔حکومت ہند کی رضامندی سے آصف جاہ خاندان نے 27 دسمبر 1883 کو نظام کی گارنٹی شدہ اسٹیٹ ریلوے کمپنی کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کے ذریعے کمپنی نے واڑیسے سکندرآباد تک ریلوے لائن خریدی اور سکندرآباد سے نئی لائنیں تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ورنگل اور پھر بیزاواڑہ (وجئے واڑہ) اور چندا تک۔حیدرآباد ریاست ہندوستان میں تجارت اور تجارتمیں اچھی پوزیشن پر قابض تھی۔ ریاست نے ہندوستان کے مختلف حصوں اور بیرون ملک کےلیبڑی مقدار میں اشیاء فراہم کیں۔ درآمدات کے مقابلے حیدرآباد ریاست کو برآمدات زیادہ تھیں۔ ریاستتجارت میں نمایاں مقام رکھتی تھی۔حکومت نے ریاست میں مواصلاتی سہولیات کی حوصلہ افزائیکی۔حکومت نے ریاست میں مواصلاتی سہولیات کی حوصلہ افزائی کی۔ نظام 7 نے ریاست میں ریلوے کی ترقی میں دلچسپی لی۔ ریاست میں دو گیج بہت اہم تھے۔ ایک میٹر گیج اور دوسرا براڈ گیج۔ ریلوے تجارت کے لیے بہت اہم تھی اور مسافروں کو لے جایا جاتا تھا۔A.D.1935 میں، مدراسکراچی ایئر سروس کو حیدرآباد سے حکیم پیٹ کے ساتھ لینڈنگ گراؤنڈ کے طور پر جوڑا گیا۔ نظام کی اہم صنعتوں میں سنگرینی کولیریز شامل تھیں۔ پراگا ٹولز (1943)، سرسلک 1946، حیدرآباد ایسبیسٹوس (1947، نظام شوگر فیکٹری (1937)۔آل وین میٹل ورکس (1942 قلعہ کانہ زندہ تلسمیت (1906)، چارمینار سگریٹ (وزیر سلطان ٹوبیکو کمپنی (1930) اعظم جاہیملز ورنگل ان تمام صنعتوں نے ریاستی معیشت میں اہم کردار ادا کیا۔اور ریاست حیدرآباد میں لوگوں کو روزگار کے مواقع فراہم کئے۔ ٹیکسٹائل کے علاوہ ڈائی، شوگر، ڈائمنڈ، آئرن، جہاز سازی۔ صنعتیں بہت مشہور تھیں۔ زراعت کے بعد یہ صنعت تھی جس نے لوگوں کو روزگار فراہم کیا۔ 1724۔1870 تک صنعتی جمود تھا اور اس سے جدید صنعت کی 1870 سے 1948۔ معدنی وسائل کی کثرت اسکے لیے ایک عظیم اثاثہ تھی۔ کوئلہ، سونا، لوہا، گرینائٹ، گریفائٹ، ڈائمنڈ اور دیگر کانوں نے ریاستیمعیشت کو بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کانوں نے مواصلات اور بجلی وغیرہ کی پیداوار فراہمکی۔ 1883 میں رائچور دوآب کے گولڈ فیلڈز نے بھی گولڈ مائننگ کا کام شروع کیا۔ وڈالی اور ٹوپلاڈوڈی کی کانیں سونا پیدا کرتی ہیں۔ ہٹی گولڈ مائن نظام حیدرآباد ریاست کی ایک اہم

کان تھی جو ریاست حیدرآباد سے سونا بیرون ملک مختلف مقامات پر برآمد کرتی تھی۔

صحت عامہ: نظام نے طبی اور صحت عامہ کو بہت اہمیت دی۔ سروس انہوں نے ڈسپنسریاں، ہسپتال اور دیگر صحت قائم کی ریاست کے مختلف حصوں میں مراکز۔ ہر ضلعی ہیڈکوارٹر میں اچھی رہائش اور بستروں پر مشتمل ایک ڈسٹرکٹ ہسپتال قائم کیا گیا۔ ضلعی ہسپتالوں کا انتظام ایک سول سرجن، دو میڈیکل کر رہے تھے۔ افسران، ایک لیڈی میڈیکل آفیسر، ایک نرس، تین کمپاؤنڈر وغیرہ۔ ریاست کیہر تعلقہ میں چھوٹی ڈسپنسریاں قائم کی گئیں۔ میڈیکل ڈپارٹمنٹ کی مالی امداد دومختلف اداروں سکی گئی۔ ذرائع ۔دیوانی اور سرف خاص۔ پائیگاہیں، جاگیریں اور سمستھان ان کی اپنی ڈسپنسریاں تھیں۔ کھولا جانے والا پہلا طبی ادارہ ریزیڈنسی ڈسپنسری ہے (بعد میں سلطان بازار ہسپتال کے نام سےجانا جاتا ہے، اس کیبعد غریبوں کے لئے ہسپتال (اب گاندھی ہسپتال) تھا جو 1851 میں قائم کیا گیا تھا۔ افضل گنج ہسپتال (اب عثمانیہ جنرل ہسپتال AD 1866 میں کھولا گیا تھا جس نے طبی طلباءکو تربیت دی تھی۔ 1897 میں، رونالڈ راس نے دریافت کیا کہ ملیریا پھیلتا ہے حالانکہ مچھروں سے اسنے اپنی دریافت سکندرآباد کی ایک جدید لیبارٹری میں کی تھی۔

نتیجہ: تلنگانہ، نظام کے تحت، ہندوستان کی سب سے بڑی شاہی ریاست تھی۔ رقبہ کے لحاظ سے یہ اتنا بڑا تھا جتنا کہ انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ نے ایک ساتھ رکھا تھا۔ ریاست کی اپنی کرنسی، ٹکسال، ریلوے اور ڈاک کا نظام تھا۔ کوئی انکم ٹیکس نہیں تھا۔ آصف جاہی دور میں فارسی، اردو، تیلگو اور مراٹھی نیبیک وقت ترقی کی۔ نظام پر آمریت کا بھی الزام ہے۔ اگر یہ سچ تھا تو پھر وہ مختلف مقاصد کیلیےکمیٹیاں کیوں بناتا جیسے یونیورسٹی کمیٹی قائم کرنا۔ نظام پر وژن کی کمی کا بھی الزام ہے، اگر یہسچ تھا تو وہ مقننہ، ایگزیکٹو اور عدلیہ کو الگ نہیں کیا ہوتا نظام پر وژن کی کمی کا بھی الزام ہے، اگر یہ سچ تھا تو وہ مقننہ، ایگزیکٹو اور عدلیہ کو الگ نہیں کیا دراصل تلنگانہ کے لوگ نظام کیخلاف نہیں لڑرہے تھے بلکہ گاؤں کے زمینداروں، جاگیرداروں، جاگیرداروں کے خلاف تھے اور ان میں سے زیادہ تر ہندو تھے۔

REFERENCES

Prasad, Dharmendra, Social and Cultural Geography of1.
A Historical:Hyderabad City
Perspective, Inter-India Publications, New Delhi, 1926.

His History and Relations with the:The Nizam's‘Briggs, H.G.,2.
British Government'
Picadilly, London, Nizan CollegeBenardQuartich 15,A.D.,1861Vol.1.,
Library,
Hyderabad.
Glimpses of the Nizam's Dominions',‘Campbell. C.,3.
Historical PublishingA.D.,1898
State Central Library,Company, Philadelphia Press, U.S.A.,
Hyderabad.
;1939-07-& 031939-08-29,((Bi-weeklyGolkonda Patrika4.
1945.-10-11,Meezan
Y. Vaikuntham, State, Economy and Social Transformation in5.
–Hyderabad State, 1724
P. 24.Manohar Publications, Delhi 2002,,1948
Vol.1948,–History of Modern Deccan, 1724,((edProf. A.R. Kulkarni6.
Hyderabad,,II
P. 373.2009,

☆☆☆

Ahwal-o-Asaar Ghulam Ali Khan Naqvi by Mehtab Alam Khan
(Research Scholar Dept.of Persian MANUU,Lucknow Campus)
مہتاب خان (ریسرچ اسکالر شعبۂ فارسی مانو، لکھنؤ کیمپس)

احوال و آثار غلام علی خان نقوی

اودھ ہندوستان کا ایک تاریخی وتہذیبی علاقہ ہے جو موجودہ دور میں ہندوستان کی وسیع و عریض ترین ریاست اتر پردیس میں موجود ہے۔ اودھ کسی زمانے میں نوابیت کے لئے مشہور و معروف تھا اور ہر خاص و عام کے زبان پر طعنہ کشی کے لئے یہ کہا جاتا تھا کہ "لکھنؤ کے نواب ہو گیا" ؟ تاریخ گواہ ہے کہ سلطنت اودھ ادبی، تہذیبی و ثقافتی لحاظ سے ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں نواب محمد امین سعادت خان برہان الملک نے اودھ کی نیم خودمختار حکومت قائم کی اور اس کا اولین پایۂ تخت فیض آباد (ایودھیا) کو بنایا۔ شجاع الدولہ کی حکومت تک فیض آباد کو ادبی و ثقافتی مرکزیت حاصل تھی۔ نواب شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا نواب آصف الدولہ تخت نشین ہوا اور اس نے فیض آباد کے بجائے لکھنؤ کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ جیسے ہی لکھنؤ دارالسلطنت اودھ قرار پایا چشم زدن میں فیض آباد کی ہمہ گیر رونق لکھنؤ میں منتقل ہو گئی۔

سنہ ۱۷۲۲ء سے لیکر سنہ ۱۷۵۷ء تک اودھ کا دارالسلطنت فیض آباد ہی رہا جس میں نواب میر محمد امین موسوی سعادت علی خان برہان الملک (سنہ ۱۷۲۲ء۔ سنہ ۱۷۳۹ء) اور نواب ابو المنصور محمد مقیم خان صفدر جنگ (سنہ ۱۷۳۹ء۔ سنہ ۱۷۵۴ء) اودھ کی دارالسلطنت فیض آباد کو بنا کر فرائض منصبی بحسن و خوبی انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد جن نوابین نے دارالسلطنت لکھنؤ کے زیر اثر اپنی خدمات انجام دیں وہ درج ذیل ہیں:

☆ جلال الدین حیدر ابوالمنصور خان شجاع الدولہ (سنہ ۱۷۵۴ء۔ سنہ ۱۷۷۵ء)

☆ محمد یحییٰ مرزا زمانی آصف الدولہ (سنہ ۱۷۷۵ء۔ سنہ ۱۷۹۷ء)

☆ وزیر علی خان آصف جاہ مرزا (سنہ ۱۷۹۷ء۔ سنہ ۱۷۹۸ء)

☆ سعادت علی خان یامین الدولہ (۱۷۹۸ء۔ سنہ ۱۸۱۴ء)

☆ ابوالمنصور رفاعت الدولہ (سنہ ۱۸۱۴ء۔ سنہ ۱۸۲۷ء)

☆ابوالمنصور قطب الدین سلیمان جاہ ناصر الدین حیدر شاہ جہان (سنہ ۱۸۲۷ء۔ سنہ ۱۸۳۷ء)

☆ابوالفتح معین الدین محمد علی شاہ سنہ ۱۸۳۷ء۔ سنہ ۱۸۴۲ء)

☆نجم الدولہ ابوالمظفر مصباح الدین امجد علی شاہ (سنہ ۱۸۴۲ء۔ سنہ ۱۸۴۷ء)

☆ابوالمنصور مرزا واجد علی شاہ (سنہ ۱۸۴۷ء۔۶ سنہ ۱۸۵ء)

مندرجہ بالا نوابین اودھ بحیثیت فرمان روایان اودھ لکھنؤ کو اپنا دارالسلطنت بنا کر کار ہائے نمایاں بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔اس زمانے میں حکومت مغول صرف قلعۂ دہلی تک سمٹ کر رہ گئی تھی اور ہندوستان طوائف الملوکی سے دوچار تھا جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئےانگریزوں پورے ہندوستان پر اپنا شکنجہ مضبوط کرتے جارہے تھے، یہاں تک کہ سنہ ۱۸۵۶ء میں اودھ کے آخری فرمانروا نواب واجد علی شاہ کو معزول کر کے کلکتہ کے مٹیا برج میں قید کر دیا گیا جہاں انہوں نے سنہ ۱۸۸۷ء میں اس دار فانی کو خیر آباد کہا۔اس طرح انگریزوں نے اودھ کی سلطنت کو تاخت و تاراج کر دیا۔

غلام علی خان نقوی انیسویں صدی کے وہ مایۂ ناز ادیب ومؤلف گذرے ہیں جن کا شمار اودھ کے نامور مصنفین میں ہوتا ہے۔ان کی تصانیف کی تعداد زیادہ تو نہیں ہیں لیکن جتنی بھی ہیں مستند اور مآخذ کا درجہ رکھتی ہیں۔نقوی صاحب اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر ید طولیٰ رکھتے تھے۔لیکن ان کی تصانیف زیادہ تر فارسی زبان میں ہیں۔اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ فارسی زبان وادب اس وقت کی درباری وسرکاری زبان تھی اس لئے ان کی تصانیف زیادہ تر اسی زبان میں منصۂ شہود پر آئے۔ غلام علی خان نقوی کے احوال کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔صرف انوار حسین اکبر آبادی نے اپنی کتاب ''اودھ کے تاریخ نگار،، میں اس طرح ذکر کیا ہے:

''سید غلام علی کے والد سید محمد اکمل علی خان ساکن رائے بریلی اودھ بسلسلۂ ملازمت دہلی (شاہجہان آباد) میں مقیم تھے۔مصنف بھی دہلی جا کر مقیم ہوگیا اور جب غلام قادر خان روہیلہ نے شاہ عالم کی آنکھیں نکلوا کر بیگمات کو بے آبرو کیا، اس وقت مصنف کے والد حج بیت اللہ کو گئے ہوئے تھے اور مصنف تلاش معاش میں کانپور و گورکھپور گھومتا ہوا فیض آباد پہونچ کر کرنل جان بیلی کی وساطت سے ملازمت حاصل کر کے سات سال تک فیض آباد میں مقیم رہا اس کے بعد اپنے وطن رائے بریلی آیا''۔

(اودھ کے تاریخ نگار، از۔انور حسین اکبر پوری، مطبع نشاط آفسٹ پریس ٹانڈہ، فیض آباد اشاعت ۱۹۹۱ء، صفحہ نمبر ۱۳۶)

سید غلام علی خان نقوی قصبہ رائے بریلی اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔لیکن تلاش معاش کے سلسلے میں دہلی، کانپور اور گورکھپور ہوتے ہوئے فیض آباد پہونچے اور انگریز ریزیڈنٹ کرنل جان بیلی کے توسط سے نواب اودھ نواب سعادت علی خان برھان الملک کے دربار میں ملازمت حاصل کر لی۔سات سال ملازمت اور قیام اودھ کے بعد اپنے وطن رائے بریلی واپس آ گئے۔

تعلیم وتربیت:۔ سید غلام علی خان نقوی حالات وزمانہ کے ناسازگار ہونے کی وجہ سے اعلی تعلیم تو حاصل نہ کر سکے لیکن اپنے والد محترم اکمل علی خان کی ایما پر صرف ونحو و دیگر علوم وفنون کی تعلیم ماہر علم و فن اساتذہ سے حاصل کی۔افسوس صد افسوس کہ نقوی صاحب ابھی اپنی تعلیم وتربیت مکمل بھی نہیں کر پائے تھے کہ حاکم روہیلہ غلام قادر خان روہیلہ نے سلطنت دہلی پر حملہ کر کے شاہ عالم کی آنکھیں نکلوا کر بیگمات کو بے آبرو کر دیا۔تمام شہر میں افراتفری کا ماحول پیدا ہو گیا۔غلام علی خان اپنی تعلیم کو بغیر پایۂ تکمیل تک پہونچائے واپس ہو گئے۔

آپ کے والد سید اکمل علی خان شہنشاہ دہلی شاہ عالم کے دربار کے شاہی طبیب تھے۔

جب نقوی صاحب کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی تو اپنے والد کے ہمراہ دہلی آ گئے تھے اور آپ کی تعلیم و تربیت یہیں سے شروع ہوئی تھی۔لیکن بعض ناگفتہ بہ حالات اور سلطنت دہلی میں افراتفری کی وجہ سے یہاں زیادہ دن نہ ٹھہر سکے اور رخت سفر باندھنے پر مجبور ہو گئے۔جب غلام قادر خان روہیلہ سلطنت دہلی پر چڑھائی کر کے قتل وغارت شروع کی اور پورے دہلی میں پرسکون ماحول کو غیر سکون بنا کر سلطنت دہلی کو اپنے تسلط میں لے لیا تو نقوی صاحب کے والد اکمل علی خان ـــــــــ نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور اورحجاز کے لئے رخت سفر باندھ لیا۔سب سے پہلے دکن کی جانب روانہ ہوئے اور یہاں پہونچ کر دکن کو اپنا مسکن بنا لیا۔سات سال تک جنوبی ہند میں سرگرداں و پریشان رہے اور کہیں پر بھی مستقل مسکن نہیں بنایا۔کچھ دنوں کی سرگردانی کے بعد بمقام مالابار کیرالہ چلے گئے اور وہیں پر انتقال فرما کر مدفون ہو گئے۔

وفات:۔ سید غلام علی خان نقوی اپنے آباء واجداد کے شہر رائے بریلی میں پیدا ہوئے اور اسی سرزمین کو اپنا مدفن بھی بنایا۔تاریخ نگاروں اور تذکرہ نگاروں کے قلم آپ کی ولادت ووفات کی مستند تاریخ وسنہ کے سلسلے میں بالکل خاموش ہیں۔اس لئے اصل وفات تاریخ وسنہ تک میری رسائی نہیں ہو سکی۔

آثار علمی وادبی:۔ نقوی صاحب کی زندگی ناسازگار زمانہ کی وجہ سے بہت متاثر تھی اس کے باوجود بھی آپ نے چند کتابیں تصنیف کی جو مستند اور ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان میں سے پہلی کتاب ”عماد

السعادت،، اور دوسری کتاب ''نگار نامۂ ہند'' ہے جو کہ دونوں فارسی زبان میں فن تاریخ میں لکھی گئی ہیں۔

عماد السعادت:۔ اس کتاب کا شمار شمار اودھ کے مستند اور تاریخی کتابوں میں ہوتا ہے۔ نقوی صاحب نے اس کتاب کو ریزیڈنٹ انگریزی عماد الدولہ کرنل جان بیلی کی ایما پر سنہ ۱۲۲۳ ہجری بمطابق ۱۸۰۸ عیسوی تصنیف کی اور نواب سعادت علی خان برہان الملک کے نام سے معنون کرتے ہوئے اس کا نام ''عماد السعادت'' رکھا۔ اس کتاب میں نواب برہان الملک کے دور کے تفصیلی حالات کے ساتھ ساتھ درانیوں، افغانوں، مرہٹوں، سکھوں اور انگریزوں کی تاریخ بقدر تفصیل موجود ہے۔ اس کتاب کے مضامین حسب ذیل ہیں:

☆ ذکر برہان الملک نواب سعادت علی خان بہادر صوبہ دار اودھ ☆ ذکر نظام الملک نواب آصف جاہ صوبہ دار دکن ☆ ذکر نواب زکریا خان صوبہ دار لاہور ☆ ذکر نواب ناصر خان صوبہ دار کابل ☆ ذکر نواب عمدۃ الملک نواب امیر خان ☆ ذکر نواب ابو المنصور خان مہابت جنگ ناظم بنگالہ ☆ ذکر نواب شجاع الدولہ صوبہ دار اودھ ☆ ذکر احوال سکھ ہا ☆ ذکر احوال مرہٹ ہا و قبضہ بالا جی بر قلعہ دہلی ☆ ذکر قاسم علی خان ناظم بنگالہ ☆ ذکر نواب آصف الدولہ صوبہ دار اودھ ☆ ذکر نواب سعادت علی خان صوبہ دار اودھ۔

نگار نامۂ ہند:۔ عماد السعادت کی تصنیف کے بعد کرنل جان بیلی ایک مفصل تاریخ چاہتے تھے۔ چونکہ '' عماد السعادت،، مختصر تھی اس لئے کرنل جان بیلی کی رضا جوئی اور خوشنودی کے لئے غلام علی خان نے '' نگار نامۂ ہند،، مرتب کر کے کرنل جان بیلی کے نام سے معنون کیا۔ اس کتاب میں پانی پت کی تیسری جنگ کے مفصل حالات دلچسپ پیرایہ میں بیان کرنے کے بعد مصنف نے مرہٹوں، افغانوں۔ درانیوں اور مغلوں کے تمام جھگڑوں اور لڑائیوں کو بھی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۰۸ عیسوی کے بعد مرتب کی گئی ہے۔

حوالہ جات: (۱) اودھ کے تاریخ نگار، مصنف انور حسین اکبر پوری، مطبع نشاط آفسٹ پریس ٹانڈہ فیض آباد یو پی انڈیا۔، سال اشاعت ۱۹۹۱ء (۲) تذکرہ مؤرخین، مصنف چودھری نبی احمد سنڈیلوی، مرتب ضیا فاروقی، مطبع عفیف پرنٹرس دہلی، سال اشاعت ثانی ۲۰۱۶ء (۳) عماد السعادت، مصنف سید غلام علی خان نقوی (مخطوطہ) (۴) تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ، مصنف امجد علی خان، مطبع سرفراز قومی پریس لکھنؤ، سال اشاعت ۱۹۷۶ء۔ ☆☆☆

Husain-ul-Haq ki Afsano mein alamati anasir by Shgufta Iqbal
(Research scholar dept. of Urdu Jammu University, Jammu)
شگفتہ اقبال (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں)

حسین الحق کے افسانوں میں علامتی عناصر

حسین الحق کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ان کا شمار اردو کے جدید افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے ۔انھوں نے اردو افسانے کی دنیا میں جب قدم رکھا تب جدیدیت کا دور عروج پر تھا۔جدیدیت ایک ایسا رُجحان تھا جس کے متعلق بہت سے افسانہ نگاروں نے اپنے قلم سے افسانے تخلیق کیے جن میں عبدالصمد،شوکت حیات،سلام بن رزاق،سید محمد اشرف اور علی امام نقوی وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔حسین الحق نے سیدھے سادے،علامتی،استعارتی،تجریدی،بیانیہ اور تمثیلی تخلیق کیے ہیں۔انھوں نے اپنے افسانوں میں ہندوستانی سیاست کو بڑے پُراثر انداز میں بیان کیا ہے۔بلخصوص ایمرجنسی کا جو سانحہ پیش آیا ساتھ ہی تقسیم کے واقعہ کو اور تقسیم کے وقت جو لوگ ہجرت کر کے پاکستان چلے گے اس کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔حسین الحق کی افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۶۵ء میں ہوا جب افسانہ ’’پسند‘‘ ماہنامہ ’’جمیلہ‘‘ دہلی سے چھپا۔اس کے بعد انھوں نے پیچھے موڑ کر نہیں دیکھا اور بے شمار افسانے اردو ادب میں تخلیق کیے۔حسین الحق کے اب تک سات افسانوی مجموعہ منظرِ عام پر آ کر دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

’’دقنا عذاب النار‘‘ حسین الحق کے پہلے افسانوی مجموعہ ’’پس پردہ شب‘‘ میں شامل اہم افسانہ ہے۔یہ ایک علامتی افسانہ ہے۔ایک لاش جو پچھلے تیس سال سے ایک کمرے میں بند پڑی ہے ۔مصنف نے لاش کو علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔دراصل یہ پچھلے تیس سال سے آزادی کے بعد سے آج تک قومی زوال کی کہانی ہے۔آزادی حاصل ہوئے ہمیں تیس برس ہو گئے۔آزاد ہونے کے باوجود ہماری حالت ایک لاش جیسی ہے جیسے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا ہے۔جس کا علم گھر والوں کے علاوہ کسی کو نہیں اور نہ ہی اس کے متعلق کسی دوسرے کو خبر دی گئی۔تیس برس گزر جانے کے بعد لوگوں کی آنکھوں سے پردہ ہٹتا ہے اور لوگ اس پر غور کرنے لگتے ہیں اقتباس ملاحظہ ہو:۔

’’لاش تیس سال سے بھی زیادہ پرانی تھی مگر اس کی موت کا احساس ہی تیس سال بعد ہوا تو اسے کیا کیا

جائے۔جس نے بھی سنا حیرت زدہ رہ گیا کہ ایک لاش تیس سال تک رکھی رہی اور لوگوں کو یہ احساس تک نا ہوسکا کہ یہ لاش ہے۔لیکن سب خاموش تھے کہتے بھی کیا کہ غلطی تو اپنی کہ تیس سال ایک لاش کو عزت دیتے رہے اور اب اچانک معلوم ہوا کہ جس کی اتنی عزت کی گئی وہ زندہ نہیں بلکہ مردہ تھا لوگ شرمندہ تھے اور مشتمل بھی''۔(وقنا عذاب النار مشمولہ ''پس پردہ''ص،۹۲،سن اشاعت ۱۹۷۹ء)

یہ لاش جو کمرے میں پڑی تھی سڑ گل چکی تھی ۔ پڑوس کے لوگوں کو جب بدبو آنے لگی تو ان کو بالکل علم نہیں تھا کہ کس کی لاش ہے۔لوگ طرح طرح کی افواہ کو ہوا دینے لگے کوئی کہتا چوہا مرا ہے، کوئی کہتا بلی کی لاش ہے اور کوئی کہتا کتا مر گیا ہے ۔ بلا آخر جب اس راز سے پردہ ہٹا اور پتہ چلا کہ انسان کی لاش ہے تو کوئی بھی شخص گھر میں جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔لیکن کچھ دیر بعد چند نوجوان گھر کے اندر جاتے ہیں اور پھر ڈاکٹر جاتا ہے۔اس کے بعد لاش کا غائبانہ جنازہ پڑھ کر قریب کے قبرستان میں دفن کیا جاتا ہے۔لیکن کچھ مدت بعد پتہ چلتا ہے کہ لاش غائب ہوگئی جس سے ڈر اور خوف کا ماحول بن جاتا ہے۔ یہ لاش ہر گھر میں رات کو دستک دیتی ہے اور لوگ ڈر کے مارے گاوں چھوڑ دیتے ہیں ۔دراصل افسانے میں مصنف نے حکمران طبقے پر طنز کیا ہے کہ وہ عوام پر ظلم وستم کر سکتا ہے اور جب تک وہ چاہیے تو اس کو پوشیدہ رکھ سکتے ہے اور اس کی خبر بھی نہیں ہونے دیتا۔لیکن ہماری قوم بھی اس سے آزاد ہونے کا راستہ نہیں ڈھونڈ رہی ہے۔افسانے کے آخر میں دکھایا گیا ہے کہ لاش دو حصوں میں بٹ جاتی ہے اور لوگوں کا تعاقب کرتی ہے اور لوگ ڈر اور خوف سے بھاگ رہے ہیں۔

مختصر طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اس افسانے میں پچھلے تیس سال سے آج تک کی قومی زوال کی کہانی بیان کی گئی ہے۔کہانی کو مردہ لاش کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔آزادی ملنے کے باوجود ہماری حالت مردہ لاش جیسی ہے جو ایک کمرے میں بند ہے۔حسین الحق نے افسانے میں علامتوں کا بخوبی استعمال کیا ہے اور پورے افسانے میں ڈر کا ماحول بنا رہتا ہے۔''چپ رہنے والا کون'' حسین الحق کا یہ افسانہ بھی علامتی انداز میں لکھا ہے جو ان کے افسانوی مجموعہ ''صورت حال'' میں شامل ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے فساد جیسے سنگین موضوع کو بیان کیا ہے۔آزادی کے بعد بھی ہمارے ملک میں آئے دن فساد ہوتے رہتے ہیں۔فساد جب ہوتا ہے تو اس میں اُن لوگوں کو بھی نقصان اُٹھانا پڑتا ہے جن کا فساد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔فساد خود نہیں ہوتے بلکہ کرائے جاتے ہیں۔ یہ وہی لوگ کرواتے ہیں جو جو ہماری قدروں کا تحفظ کرنے کی ذمہ داری اُٹھاتے ہیں۔فساد میں دیکھتے ہی دیکھتے لاشوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ یہ افسانہ ایک ایسے علاقے کی ترجمانی کرتا ہے جہاں کے لوگ بہت

غریب اور معصوم ہوتے ہیں۔ جو کسی بھی ظلم کا بدلہ نہیں لینے چاہتے اور نہ ان کا کوئی ساتھ دیتا ہے۔ افسانے میں مصنف نے فساد کے وقت جو قتل وغرت ہوتی ہے وہ کچھ یوں بیان کی ہے:۔

''سامنے چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے۔لوگ بلبلہ بلبلہ کر گھروں سے نکل رہے ہیں اور جدھر سنگِ سماہی ہے بھاگ رہیں ہیں اور باہر چاروں طرف سے گھیر گھیر کر ایک بڑے میدان میں جمع کیا جا رہا ہے۔اور جو ذرا ادھر اُدھر، چھپ کر یا بچ کر نکلنا چاہتا ہیں اور نکل نہیں پاتے ،اُنہیں بوٹوں سے روندا جا رہا ہے''۔ (چپ رہنے والا کون''مشمولہ''صورت حال،ص،۳۰،سن اشاعت ۱۹۸۱ء۔)

حسین الحق کی یہ کہانی ایسی فضا سے متعلق ہے جہاں ظلم وستم اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔لوگ اس ظلم وستم سے مر رہے ہیں اسی بیچ ایک کردار اپنے بچے کو لے کر گٹر میں چھپا ہے۔وہ بچے کے بچ جانے پر خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ یہاں کس فرقے کے لوگ رہتے ہیں اس کی وضاحت نہیں کی گئی ہے لیکن افسانہ پڑھنے کے بعد وقاری کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں کس قسم کے لوگ رہتے ہیں۔ افسانے میں ظلم وستم اور انسانی قدروں کی پامالی کو پیش کیا گیا ہے۔افسانہ''گونگا بولنا چاہتا ہے''ان کے افسانوی مجموعہ''نیو کی اینٹ''میں شامل اہم افسانہ ہے۔ یہ ایک علامتی افسانہ ہے۔اس افسانے میں انہوں نے عالمی مسائل کی طرف توجہ راغب کروائی ہے۔جدید دور میں بہت سے مما لک سپر پاور کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں اور بہت سے مما لک اس دور میں لگے ہوئے ہیں۔یہی سُپر پاور مما لک اپنی طاقت کا فائدہ اُٹھا کر غریب مما لک کو کبھی بھی اپنا نشانہ بنا سکتے ہیں۔اس افسانے میں مصنف نے عالمی طاقتوں کے ظلم وستم کو نشانہ بنایا ہے۔اگر چہ یہ افسانہ امریکہ اور عراق کے پس منظر میں لکھا گیا ہے ۔افسانے میں امریکہ اور عراق کی جنگ دکھائی گی ہے۔ساتھ ہی یہ بھی بیان کیا ہے کہ لوگ کس طرح امریکہ کی شکست کے انتظار میں ہوتے ہیں۔حسین الحق نے یہ بات واضح کرنے کی سعی کی ہے کہ طاقتور مما لک نے کس طرح غریب مما لک پر اپنا دبدبہ بنا کر رکھا ہے اور کمزور مما لک کی حیثیت ان کے سامنے گونگے انسان کی طرح ہے جو بولنا تو چاہتے ہیں مگر بول نہیں پاتے ہیں۔ان کمزور مما لک کی آواز کو دبایا جاتا ہے جب تک ان کی بات کو سُنا نہیں جائے گی تو اس کا حل کیسے نکلے گا۔مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ حسین الحق کو افسانہ نگاری پر مہارت حاصل ہے۔انھوں نے جدیدیت کے زیر اثر باکمال افسانے تخلیق کیے۔ان افسانوں میں علامتوں کا استعمال جا بجا دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کے افسانے اردو ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔انھوں نے اردو ادب میں جو خدمات انجام دئیں ہیں ان کو کبھی نظر انداز نہیں کا جا سکتا ہے۔☆☆☆

Urdu mein marsia goyi ki rewayat by Reyaz Ahmad Najar(Research Schoalr Dept.of Urdu University of Hyderabad,Hyderabad)
ریاض احمد نجار (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، یونی ورسٹی آف حیدر آباد، حیدر آباد)

اردو میں مرثیہ گوئی کی روایت

مرثیہ عربی زبان کا لفظ ہے جو رثا سے نکلا ہے۔ رثا کے اصطلاحی معنی بین و بکا یا اظہار افسوس کے ہیں۔ اس بین و بکا میں مرنے والے کے زاتی صفات بیان کئے جاتے ہیں۔ مرثیہ کو شخصی اور کربلائی دو مختلف زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ شخصی مرثیہ کی تاریخ عربی میں دور جہالیت اور دور اسلام دونوں میں پائی جاتی تھی۔ لیکن اس کے برعکس کربلائی مرثیہ کی ابتدا واقعہ کربلا اور اہل بیت کی شہادت کے بعد شروع ہوا۔ مولانا حالی مرثیہ کی تعریف میں لکھتے ہیں:

''مرثیہ کا اطلاق ہمارے یاں زیادہ تر شہدا کربلا اور خاص کر سید الشہدا کے مرثیے پر ہوتا ہے۔''

(ڈاکٹر سید رضا حیدر، مرزا سلامت علی دبیر، قومی قونسل فروغ اردو زبان نئی دہلی، 2019، ص 2)

اس اقتباس کو مدنظر رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ دور حاضر میں لفظ مرثیہ سنتے ہی ذہن خود بخود واقعہ کربلا یا شہدائے کربلا کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ خلافت بنو عباس میں اہل بیت کی بہادری اور شان و فضائل کو جلا بخشنے اور ان کی یادوں کو شہرت دوام بخشنے کے لئے شعرا و ادباء نے اہل بیت کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو شعری قالب میں ڈھال کر واقعہ کربلا کی ایسی منظر کشی کی کے اہل بیت سے محبت رکھنے والے افراد زور و قطار سے رونے لگتے تھے۔ فارسی زبان میں رودکی کے اشعار اگر چہ شخصی مرثیے کی قدیم تاریخ میں پائے جاتے ہیں جس میں اس نے اپنے دوست کے انتقال پر رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ فردوسی اور فرخی نے بھی اس صنف میں نام کمانے میں ہر ممکن کوشش کی اور اپنے غم کا اظہار کیا کرتے تھے۔ اگر چہ فارسی زبان میں مرثیے کی روایت محتشم کاشی نے ڈالی جس کے بعد مرثیہ گوئی کے میدان میں کئی مرثیہ نگار داخل ہوئے جس میں سب سے مشہور و معروف مقبل صفاہانی ہے۔ مقبل کے بعد جو سوال و جواب کے انداز میں مرثیہ قانی کا تھا بھی مشہور ہوئے۔ اس طرح رفتہ رفتہ اس صنف میں دیگر مرثیہ نگاروں نے مرثیہ کو آگے بڑھایا۔ مگر میں ایران میں اسے وہ ادبی وقار نہیں ملی جو اسے ہندوستان میں حاصل ہوئی۔ ایران سے ہندوستان کے دیرانہ تجارتی و تہذیبی

تعلقات تھے اور قرب مکانی نے بھی اہل ایران کے لئے سفر دکن آسان بنا دیا تھا۔ اگر چہ شروع میں گولکنڈہ اور بیجا پور کی دکنی سلطنتوں میں مرثیہ کو وقار اور عروج حاصل ہوا۔ یہاں کے شہزادوں کی سرپرستی میں اس صنف نے مزید ترقی کے منازل طے کرنا شروع کئے اور دیکھتے ہی دیکھتے مرثیہ گویوں کی ایک بڑی تعداد سامنے آ گئی۔ دکن مین جو بہمنی سلطنت (747ھ) تھی۔ اس سلطنت کے آخری دور میں اشرف بیابانی نے ایک جامع اور طویل مثنوی ''نوسرہار'' کے نام سے قلمبند کی جس میں امام حسن اور امام حسین کی شہادت کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ مگر جب اس سلطنت کا زوال آ گیا تو 1490ء میں یوسف عادل شاہ نے عادل شاہی حکومت کی بنیاد رکھ دی۔ اس دور میں برہان الدین جانم، ملک خوشنود، عادل شاہ ثانی اور مرزا بیجا پوری قابل ذکر ہیں۔ مرزا بیجا پوری نے سب سے پہلے مربع میں مرثیہ کہے جو ارتقا کی طرف ہیئت کا پہلا قدم تھا۔ دکن میں بیجا پور کی طرح گولکنڈہ میں قطب شاہی سلطنت وجود میں آئی جس کی بنیاد قلی قطب شاہ نے 1580ء میں رکھی۔ محمد قلی قطب شاہ نے اسی دور میں بادشاہت سنبھالی۔ وہ اردو کا سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ ان کے دیوان میں بھی مرثیہ نگاری کے ابتدائی نقوش دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اسی دور کے ملا وجہی جس کو ڈاکٹر محی الدین قادری زار نے پہلا مرثیہ گو شاعر قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ غواصی جن کو ملک الشعرا کا خطاب ملا ان کے یہاں بھی مرثیہ گوئی کی روایت دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ اس دور کے بہت سے شعرا نے مرثیہ میں کمال فن دکھایا جس میں محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، علی عادل شاہ ثانی، مرزا بیجا پوری کا نام بڑے ادب واحترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

اورنگ زیب کے حملوں نے قطب شاہی اور عادل شاہی حکومت کا خاتمہ کیا جس سے اردو ادب کا مرکز گولکنڈہ یا بیجا پور کے بجائے اورنگ آباد منتقل ہو گیا۔ اس دور میں بھی مرثیہ گوئی کی طرف دلچسپی لی گئی اور یہ دور بھی مرثیہ کے لئے سازگار ثابت ہوا۔ اس دور میں روحی، زوقی، احمد برہان پوری، قائم وغیرہ جیسے مرثیہ گو شعرا نے اس صنف میں طبع آزمائی کی۔ اس کے علاوہ شمالی ہند میں آبرو، یک رنگ، شاہ حاتم وغیرہ ابتدائی دور کے اہم مرثیہ نگار ہیں۔ اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں دہلی میں مرثیہ گووں کی تعداد بہت زیادہ ہو چکی تھی جس میں سودا، مسکین، سکندر، مصحفی، جرات، اشرف بیابانی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ سودا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے مسدس کی ہیت مین مرثیہ لکھا لیکن کچھ ناقدین اس کا سہرا مہدی متین برہان پوری کے سر باندھتے ہیں۔ مگر اکثر کی یہی رائے ہے کہ مرثیے کے لئے مسدس کی ہیت سودا نے ہی دی۔ اس سلسلے میں شبلی لکھتے ہیں:

''اس وقت مرثیے عموماً چومصرے ہوتے تھے غالباً سب سے پہلے سودا نے مسدس میں لکھا۔''

(شبلی نعمانی، موازنہ انیس و دبیر، ص25)

گوپی چند نارنگ بھی شبلی سے متفق نظر آتے ہیں اور لکھتے ہیں:

''پہلا مسدس کہنے کا سہرا عام طور پر سودا ہی کے سر ہے۔'' (گوپی چند نارنگ، انیس شناسی، ص164)

سودا کے ساتھ ساتھ میر نے بھی مرثیہ نگاری میں اپنا لوہا منوایا ہے۔ ضمیر، خلیق اور بعد کے عظیم مرثیہ گو شعرا انیس و دبیر نے سودا سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ البتہ سودا کے ابتدائی مرثیوں مین فن کے کچھ اچھے نمونے دیکھنے کو نہیں ملتے ہیں اس لئے بعض سودا کے مرثیوں پر اعتراض جتاتے تھے اور بعض انھیں مرثیہ گوئی کا اہل ہی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی مرثیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

''مرثیے اور سلام بھی بہت کم کہے ہیں۔ اس زمانے میں مسدس کی رسم کم تھی۔ اکثر مرثیے چومصرے ہیں۔ مگر مرثیہ گوئی کی آج کی ترقی دیکھ کر ان کا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ شاید انھیں مرثیوں کو دیکھ کر اگلے وقتوں میں مثل مشہور ہوئی تھی کہ'' بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویاں مرثیہ خواں۔''

(بحوالہ محمد رفیع سودا، خلیق انجم، ص322)

جب مغلیہ سلطنت کا زوال ہوا تو بہت سارے شعرا نے لکھنو کی طرف رخ کر دیا جس سے لکھنو میں مرثیہ نگاری کو عروج ہوا۔ غازی الدین حیدر نواب لکھنوی نے مرثیہ گوئی کی سر پرستی کی جس سے لکھنو میں مرثیہ گوئی کی فضا بلند ہوئی۔ لکھنو کے مرثیہ نگارون میں میر ضمیر، دلگیر اور میر خلیق کے علاوہ افسردہ، ناظم وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ میر ضمیر نے مرثیہ کو موجودہ شکل دی۔ میر خلیق نے بھی اردو مرثیہ پر جو احسان کیا ہے وہ میر ضمیر سے کم نہیں ہے مگر بدقسمتی سے ان کا کلام نہیں ملتا۔ اسی دور کے دلگیر جو ہندو مذہب سے تعلق رکھتا تھا مگر جب مرثیہ لکھتے تھے تو ان کے ہندو ہونے مین شک ہونے لگتا تھا۔ ان کی مراثی سات جلدوں میں 1897ء میں مطبع نول کشور سے شائع ہوئے۔

انیسویں صدی کی دوسری چوتھائی میں قائم چاند پوری، سکندر، مسکین، فقیر محمد خان گویاں اور خاص کر انیس و دبیر نے اردو مرثیہ کو ترقی دی اور اس کو فنی بلندیوں پر پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس دور میں مرثیہ گوئی کہ علاوہ مرثیہ خوانی کی طرف بھی توجہ دی گئی ہے۔ اس لئے ان کا یہ دور اردو مرثیہ میں ایک سنہری دور کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔

انیس 1803ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خلیق اور دادا کا نام میڈ حسن اور پردادا کا نام

میر ضمیر تھا۔ اس لئے انیس نے مرثیہ گوئی کی روایت میں خود کو مرثیہ کی پانچویں پشت کہا ہے۔ انیس ابتدا میں غزل گوئی کی طرف مائل ہو گئے تھےلیکن والد خلیق کے کہنے پر غزل گوئی کو ترک کر کے اردو مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی طرف مائل ہوئے۔ محمد حسین آزاد میر انیس کی مرثیہ خوانی کے بارے میں اپنی کتاب آب حیات میں لکھتے ہیں:

''ان کا اور ان کے بھائیوں کا بھی قائدہ تھا کے بڑا آئینہ سامنے رکھ کر خلوت میں بیٹھتے تھے اور مرثیہ پڑھنے کی مشق کرتے تھے۔'' (آب حیات، چوتھا ایڈیشن، ص525)

انیس کے مراثی میں جزیات کو اتنی چابک دستی سے برتا گیا ہے کہ منظر خود بخود آنکھوں کے سامنے دکھائی دیتا ہے۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ انیس ایک سنگ تراش ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ عام فہم اور سیدھے سادھے الفاظ کی مدد سے ایسا نقش کھینچتے ہیں کہ ان کا مرثیہ سن کر قاری داد تحسین دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ تشبیہات، استعارات و کنایات کو برمحل برتنے پر قدرت رکھتے تھے۔ ان کے مراثی میں محاورات کے زریعے جنگ کی منظر کشی دیکھئے:

یک بہ یک طبل بجا، فوج میں گرجے بادل   کوہ تھرائے، زمین ہل گئی، گونجا جنگل
پھر ڈھالوں کے چمکنے لگے، تلواروں کے پھل   مرنے والوں کو نظر آنے لگی شکل اجل

ان اشعار کا جب مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ طبل کا بجنا، بادل کا گرجنا، بجلی کا چمکنا، ناگن کا ڈسنا، جنگل کا گونجنا، اور زمین کا ہلنا وغیرہ عام محاورے ہیں جن کی مدد سے انیس نے جنگ کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ قاری کہ ذہن میں ایک گھماسان کی تصویر ابھرتی ہے۔ مسیح الزماں خان انیس کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''انیس کے مرثیوں میں انسانی برتاؤ اور جذباتی ردعمل کے مختلف النوع نمونے نظر آتے ہیں۔ غم، خوشی، شجاعت کے ساتھ جذبات بھی ملیں گے جو دوسرے شعرا کے یہاں بھی کامیابی سے پیش کئے گئے ہیں لیکن جب ان جزبات میں مختلف احساسات کی کشمکش رونما ہوتی ہے یعنی کہیں محبت اور حیا کہیں غصہ، شجاعت، یاس ادب، کہیں فرض محبت آپس میں دست گریباں نظر آتے ہیں تو انیس کی مہارت کا قائل ہونا پڑھتا ہے کہ ان ملے جلے جذبات کی تصویر کتنی کامیابی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔'' (ڈاکٹر مسیح الزماں، اردو مرثیے کا ارتقا ابتدا سے انیس تک، ص278)

مرزا دبیر انیس کے دور کا ہی تھا۔ دبیر بھی انیس کی طرح مشہور و معروف تھے۔ 1803ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور 1874ء کو لکھنو میں انتقال کر گئے۔ مرثیہ گوئی کے میدان میں دبیر انیس

سے پہلے اترے۔ ان کے مرثیوں میں موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔جس علم کو میر ضمیر نے ہاتھوں میں لیا اسی کو مرزا دبیر نے اور بلندی عطا کر دی۔غرض دبیر نے مرثیہ کے فن کو عظمت اور وقار بخشا۔اس کے علاوہ مرزا غالب نے بھی مرثیہ کے فن میں طبع آزمائی کی۔زین العابدین خان عارف کی وفات پر مرزا غالب کا مرثیہ مشہور ہے۔میر انیس کے چھوٹے بھائی میر مونس اور میر انس بھی مرثیہ گو شاعر تھے نیز میر انیس کے تینوں بیٹے رئیس، سلیس اور نفیس بھی شاعر تھے مگر میر نفیس کو باقی بھائیوں کی نسبت زیادہ شہرت ملی ان کا اصل نام میر خورشید علی تھا۔

میر انیس اور مرزا دبیر کے بعد جن مرثیہ نگاروں نے اس روایت کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا ان میں میر جلیس، پیارے صاحب رشید، میر تعش، میر وحید، خورشید حسن دلہا صاحب، عروج جعفر حسن وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔اس کے علاوہ غالب کی وفات پر حالی نے مرثیہ لکھا، داغ کی وفات پر علامہ اقبال کا مرثیہ اور اس کے علاوہ علامہ اقبال کا اپنی والدہ محترمہ کا مرثیہ (والدہ مرحومہ کی یاد میں) اردو مرثیہ کے حوالے سے اہم اثاثہ ہیں۔

قیام پاکستان سے پہلے جو مرثیہ نگار اپنی حیثیت منوا چکے تھے ان میں جوش، راجہ صاحب محمود، نجم آفندی کے نام اہم ہیں۔ جوش نے پہلا مرثیہ ''آوازِ حق'' 1918ء میں لکھا اور اپنے اس مرثیہ کی بدولت انھیں جدید مرثیہ کا بانی قرار دیا گیا ہے۔ 1941ء میں ان کا دوسرا مرثیہ ''حسین اور انقلاب'' کے نام سے سامنے آیا۔انھوں نے پاکستان آنے کہ بعد سات مرثیے کہے جو عظمت انسانی، وحدت انسانی اور پانی کے عنوانات سے منظر عام پر آ گئے نیز حفیظ جالندھری، جمیل مظہری، مہدی آغا، آل رضا وغیرہ کے نام بھی مرثیے کے حوالے سے اہمیت کے حامل نظر آتے ہیں۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ دبیر اور انیس کا دور اردو مرثیے کے عروج کا دور تھا۔اگرچہ دہلی لٹنے اور لکھنو اجڑنے کے بعد اور تہذیبی و معاشرتی قدریں تبدیل ہونے کے بعد اردو مرثیے کے حوالے سے ایک خلا ضرور پیدا ہو گئی ہے مگر پھر بھی سلام اور نوحہ لکھنے کا رواج آج بھی جاری و ساری ہے۔

☆☆☆

Abul Fazal Siddiqi ke afsano mein dehi samaj ki akkasi by Dr. Uzair Ahmad(HOD Urdu Islampur college Islampur)cell-9210919540

ڈاکٹرعزیراحمد (صدرشعبہ اردو، اسلام پور کالج، اسلام پور، مغربی بنگال)

ابوالفضل صدیقی کے افسانوں میں دیہی سماج کی عکاسی

ابوالفضل صدیقی (5 ستمبر 1908-16 ستمبر 1987) کا شمار اردو کے ممتاز افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی پیدائش میں بدایوں میں ہوئی۔ پرورش پرداخت زمیندارانہ ماحول میں ہوئی۔ پہلا افسانہ "سماج کا شکار" 1941 میں ادبی دنیا میں شائع ہوا جو لاہور سے نکلتا ہے۔ آزادی کے بعد جب زمینداری کو حکومت نے منسوخ کر دیا تو انہوں نے پاکستان ہجرت کر جانے میں عافیت سمجھی۔ ان کا قلم وہاں بھی رواں تھا۔ وہ زندگی کے آخری دم تک اپنے تجربات کو افسانوں اور ناول کی شکل میں اردو دنیا کو دیتے رہے۔ انہوں نے گاؤں دیہات کا مشاہدہ خود سے کیا جس کو انہوں نے اپنے افسانوں میں بکھیر دیا ہے۔ ان کے افسانوں میں روہیل کھنڈ کے دیہات پوری شان وشوکت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ان کا بیانیہ پر اثر ہوتا ہے۔ کہانی کی بنت اتنی شاندار ہوتی ہے کہ قاری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

دیہات پر لکھنے والوں کا پیش رو پریم چند کو کہا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ابوالفضل صدیقی کو بھی پریم چند کی روایت کو مستحکم کرنے والا قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن ابوالفضل صدیقی کی افسانوی دنیا پریم چند کی دنیا سے قدرے مختلف ہے۔ انہوں نے ایک زمیندارانہ سماج میں آنکھیں کھولی تھیں۔ اس سماج کی عیاریاں اور مکاریاں ان پر عیاں تھیں۔ زمیندارانہ سماج کے لیے وہ ایک قسم کے گھر کے بھیدی ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں یہ بتایا کہ کس طرح زمینداروں کے آگے پیچھے تھانہ، کورٹ کچہری اور وکیل سب ان کے موافق کام کرتے ہیں۔ انہیں قانونی داؤں پیچ آتے ہیں۔ وہ اپنی ہوشیاری سے ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابوالفضل صدیقی کا پہلا افسانہ "سماج کا شکار" ہی ان کے افسانوی جہت کو واضح کرتا ہے۔ انہوں نے ایک ایسے دیہات کا نقشہ کھینچا ہے جو ذات پات کے دلدل میں بری طرح پھنسا ہوا ہے۔ وہاں بدھوا کی مظلومیت کے خلاف کھڑے ہونے والے تو نہیں ہوتے لیکن جب یہ خبر ان تک پہنچتی ہے کہ خان نے بیل نہ دینے پر اس

کے منہ پر تھوک دیا ہے تو اس کو مراؤ برادری سے خارج کر دیتے ہیں۔ اس کے گھر والے اس سے اچھوتوں کی طرح برتاؤ کرنے لگتے ہیں۔ لاچار ہو کر اس نے گھر سے بھاگ کر خودکشی کرنا چاہا۔ تو عزیز نام کے دوسرے خان نے یہ کہہ کر اکسادیا کہ اگر مرنا ہے تو اس کو مار کر مرو جس نے تم کو اس حال میں پہنچایا ہے۔ عزیز نے بدھوا کے رنج کو غصہ میں بدل کو خود مسیحا بن جاتا ہے۔ وہ اس وقت زبر خان کے گھر پہنچتا ہے جب بدھوا زبر خان کے دو چھوٹے بچوں اور بیوی کو مار چکا ہوتا ہے۔ ایک لڑکی کا ہاتھ کاٹ چکا ہوتا ہے۔ عزیز خان نے دونوں طرف سے مل کر معاملے کو اپنے حساب سے ڈیل کیا۔ شیر خان جس نے اس کے خاندان سے ایک آدمی کا قتل کیا تھا اس کو پھنسانے کا ایک بہانہ بنالیتا ہے اور زبر خان کو سمجھاتا ہے کہ اگر عدالت میں کھڑا ہونا ہے تو اپنے مقابلے کے آدمی کے سامنے کھڑے ہو۔ اس طرح اس معاملے میں شیر خان کو پھنسا دیا جاتا ہے جس کا اس قتل سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ اس تعلق سے عزیز خان اور زبر خان کی گفتگو کچھ اس طرح ہوتی ہے: **"ارے بھائی کس پر رپٹ دینے جاؤ گے! ان مروٹوں پر؟ کیا وہ تمہارے برابر کے ہیں۔ ان کے ساتھ عدالت میں کھڑے ہوئے شرم بھی نہ آئے گی۔" "ارے بھائی کہاں کی ہانک رہے ہو۔ اگر رپورٹ نہیں ہوئی تو پولیس میں چوکیدار اطلاع کر دے گا۔ پولیس خود تحقیقات کرلے گی! کہیں قتل بھی چھپ سکتا ہے پھر ایک چھوڑ چار!" "ارے میاں میں کیا کہہ رہا ہوں اور تم کیا سمجھ رہے ہو! رپٹ کو کون مسخرہ منع کرتا ہے (کان کے قریب ہونٹ لے جا کر) مطلب یہ ہے کہ کسی برابر والے پر رپٹ دو۔"**

(ذرا ٹھٹک کر) ایں برابر والے پر! کس پر؟

"(طنز سے) اور نہیں تو آپ ان مُروٹوں کو پھانسی کرا کر بہت نہال ہو جائیں گے۔"

زبر خاں ایک معاملہ فہم پٹھان تھے۔ مگر ساتھ ساتھ اس نعمت سے جو پٹھانوں میں قدرت کی جانب سے نہایت فیاضی کے ساتھ ودیعت ہوتی ہے خوب مالا مال تھے۔ معاملہ کی اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے بولے۔ "اچھا کس کس پر ہونا چاہیئے؟"

عزیز خاں نے نہایت سادگی سے کہا۔ "بھائی میری رائے یہ ہے کہ شیر خان اور ناصر خاں دونوں کو ضرور لے لو۔" زبر خاں اوچھل پڑے اور ذرا تعجب سے کہا "ایں شیر خاں اور خاں کیوں؟"

"تمہیں کچھ خبر بھی ہو۔ اس دو کوڑی کے آدمی کی یہ ہمت تھی! ہمیں معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ ان دونوں کی شرارت تھی!!۔ بھپارے دینے میں تو بہت طاق ہیں۔"

(افسانوی مجموعہ شکنجہ، ص 27۔28)

اس افسانہ میں اس وقت زمینداروں کے دبدبہ اور ان کے مقابلے میں عام لوگوں کی حالت کا علم ہوتا ہے۔ زمینداری کے نام پر کھیت زیادہ نہیں بچے تھے پھر بھی زبر خان سب پر رعب جھاڑتا رہتا تھا۔ اس کی بھینسیں آزادی کے ساتھ کسی کا بھی کھیت نقصان کرتی تھیں لیکن کسی کو ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ آ کر شکایت کر سکے۔ گاؤں میں جس سے چاہتا بیگار لیتا تھا۔ اگر کوئی اسے گنا نہیں دیتا تو اس سے گڑ لینے کا طریقہ اس کو معلوم تھا۔ ابوالفضل صدیقی کے افسانوں میں بڑے طبقے اور چھوٹے طبقے کے درمیان کشمکش کی ایک ایسی فضا ملتی ہے جو ان کے علاوہ کسی اور افسانہ نگار کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ یہ بڑا طبقہ ذات برادری کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے جیسے برہمن کاشتریہ، رتبہ اور مرتبہ کی شکل میں بھی جیسے زمیندار، پولیس داروغہ وغیرہ۔ یہ سبھی لوگ مل کر غریب مزدور اور کسانوں کا خون چوستے نظر آتے ہیں۔ کسانوں اور غریبوں کا خون چوسنے والے ہمیں دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں بھی مل جاتے ہیں لیکن ابوالفضل صدیقی کے یہاں یہ طبقہ جس چالاکی سے یہ سب کرتا ہے وہ قابل توجہ ہے۔ وہ ہر کام "قانون کے دائرے میں" کرنے کا عادی ہے۔ اسٹیشن ماسٹر کو سیدھو کی جگہ اس کی بیٹی کو کام پر رکھنے کے لیے قانونی داؤں چلنا پڑتا ہے۔ سیدھو سے کہتا ہے کہ ایک سرکاری ملازم سے کام لینا قانونی طور پر جرم ہے۔ سیتا نے کام کرنے سے منع کر دیا پھر بھی اسٹیشن ماسٹر نے اس کو نوکری سے نہ نکال کر دوسرا قانونی راستہ نکالا کہ تھانے میں چوری کی رپورٹ لکھوا کر پورے گھر کو اندر کروا دیا۔ قانونی طور پر خود بھی تھانے میں سیتا کی عزت لوٹی اور دوسرے پولیس والوں نے بھی لوٹی۔ عزیز پٹھان کو شبیر خان سے بدلہ لینا ہوتا ہے تو بدھوا کے بجائے شبیر خان کو قتل کے الزام میں گرفتار کروا دیتا ہے۔ شکنجہ افسانے کا نرمل جب اپنی گروی زمین کو چھڑا کر خود اس قابل ہو جاتا ہے کہ اپنی کھیتی خود کرے تو زمین دار اور اس کے موالی اس کو لالی پاپ دے کر، بڑے زمین دار ہونے کا خواب دکھا کر تیس سو روپیے سالانہ پر ڈھیر ساری زمین پٹہ پر دے دیتے ہیں۔ اس طرح وہ ان کے جال میں دوبارہ پھنس جاتا ہے۔ اور پھر اسی مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں سے اس کے بیٹے نے فوج میں جان دے کر اس کو نکالا تھا۔

"اچھوت کا ادھار" میں کنور سالک رام سنگھ اپنے دوست کے ساتھ مل کر گاندھی جی کے مشن پر اپنے علاقے میں نکلا ہے کہ اچھوتوں کو اپنے ساتھ ملانا ہے۔ لیکن اس کے پیچھے ان کا مقصد یہ ہے کہ بدلتے سیاسی منظر نامہ میں اب وہی حکومت کرے گا جس کی تعداد زیادہ ہوگی۔ اگر بڑی ذات والے زبانی جمع خرچ کر کے اچھوتوں کو اپنے ساتھ نہیں ملائیں گے تو مسلمان ان کو اپنے ساتھ ملا کر تعداد میں زیادہ

ہو جائیں گے۔ ابوالفضل صدیقی کے یہاں دیہی معاشرہ کے استحصال کرنے والے زمیندار، ساہوکار کے علاوہ پولیس محکمہ بھی ہے۔ جو ہر معاملے کو کمائی کا ذریعہ سمجھ کر دیکھتا ہے۔ وہ شبیر خان کے گھر سے بارہ سولیتا ہے اور عزیز خان کے گھر سے بھی۔ اس طرح معاملہ دونوں طرف سے برابر کر کے رفع دفع کر دیتا ہے۔ قتل کے الزام میں جان بوجھ کر زبر خان کے گھر والوں کے قتل کے الزام میں شبیر کو گرفتار کر کے چالان کاٹ دیتے ہیں۔ معاملہ صرف ڈیڑھ سو میں طے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی "شکنجہ" کے پیش لفظ میں ابوالفضل صدیقی کے افسانوں کی خصوصیات پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ابوالفضل صدیقی کے افسانوں اور ناولوں میں زمیں داروں، ان کے کارندوں، پولیس والوں اور وکیلوں کے جوداؤں پیچ نظر آتے ہیں، وہ گزرے ہوئے کل کی دیہاتی زندگی کی بڑی سچی اور واضح تصویر پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسے فن کار کی بنائی ہوئی تصویریں ہیں جو اس فضا اور ماحول کا ایک حصہ تھا، جس نے اس فضا اور ماحول کے ہر پیچ وخم اور نشیب وفراز کو اپنی ذاتی زندگی میں پوری طرح محسوس کیا تھا اور پھر انھیں پورے فن کارانہ سلیقے، خلوص اور سچائی کے ساتھ افسانوی ادب کے قالب میں ڈھال دیا تھا۔ یہ تصویریں صرف افسانوی ادب ہی کا حصہ نہیں ہماری معاشرتی تاریخ کا جزو بھی ہیں۔ یہ بڑی قیمتی، اہم اور پائدار تصویریں ہیں جن سے فضا اور ماحول کی عکاسی کے ساتھ ساتھ ایک خاص ذہنیت کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ تذلیل، توہین اور تحقیر کے تمام جذبوں کی پرورش و پرداخت کرنے والی یہ ذہنیت کسی نہ کسی حد تک اور کسی نہ کسی شکل میں آج بھی زندہ ہے اور آئے دن ہم اخباروں میں اس کے حوالے سے اجتماعی آبروریزی، غارت گری اور قتل کی وارداتوں کے بیان پڑھتے رہتے ہیں۔ ابوالفضل صدیقی نے اس ذہنیت کے عملی مظاہروں کو محفوظ کر لیا ہے۔" (ص 6)

ابوالفضل صدیقی کے یہ سبھی افسانے آزادی سے پہلے کے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ گاؤں کے سماج کے معاشرے کی عکاسی کی ہے بلکہ ان کی زبان بھی استعمال کی ہے۔ دیہی زبان کے مکالمے ان کے افسانوں کو حقیقت سے قریب کر دیتے ہیں۔ ابوالفضل صدیقی کے افسانے عموماً طویل ہوتے ہیں۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ افسانے کا اختتام ہو گیا ہے پھر اچانک اس میں کوئی نئی بات پیدا کر کے افسانے کو آگے بڑھا دیتے ہیں۔ ان کا افسانہ " گل زمیں کی تلاش میں " ایسا ہی ایک طویل افسانہ ہے جس میں روہیل کھنڈ کی ریاست اور غلام قادر روہیلہ کے دہلی تاراج کرنے اور پھر انگریزی حکومت کے قیام تک کی روداد بیان کی گئی ہے۔ آم کے پھل کے اردگرد بنے گئے اس افسانے میں قدیم ہندوستان کے جاگیردارانہ مزاج کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ساتھ مختلف دور حکومت میں عوام پر پڑنے

والے اثرات بھی واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ابوالفضل صدیقی کے افسانوں میں دیہات سے شہر کی طرف مراجعت کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ اس زمانے میں گاؤں میں شہر کو امید کی نظر سے دیکھنے کا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب گھر میں کھانے کو کچھ نہیں بچتا، ساہوکار ادھار دینے سے منع کر دیتے تو شہر ایک آخری امید بن کر ان کے سامنے کھڑا ہو جاتا۔ چنانچہ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر شہر کا رخ کرتے ہیں۔لیکن بدلے میں یہاں بھی ان کو وہی عیاری اور مکاری دیکھنے کو ملتی ہے۔

دھنسی کہار کی زندگی پر مشتمل افسانہ "ارتھی" آزادی سے پہلے کے ہندوستانی گاؤں اور شہروں کی سماجی اور معاشی صورتحال کی سچی تصویر ہے۔ دھنسی کو جب گاؤں میں کام نہیں ملا، برباد فصل دیکھ کر قرض دینے والے بھی نہیں ملے تو کئی دنوں کے فاقے کے بعد گاؤں سے دس کلومیٹر کے فاصلہ پر ریلوے اسٹیشن پر قلی کا کام کرنے چلا جاتا ہے۔قلی سے اسٹیشن ماسٹر کا باورچی اور پھر لائن مین کی سرکاری نوکری تک پہنچنے میں اس کو دیر نہیں لگتی۔ پھر اسٹیشن ماسٹر اپنے شاطرانہ چال سے کہ اب تم بھی سرکاری ملازم ہو گئے ہو اس لیے آپ سے کام کروانا غلط ہوگا، اس لیے اپنی بیٹی کو کھانا بنانے پر لگا دو۔ دھنسی کے منع کرنے پر پولیس کی مدد سے اس کی بیٹی کی آبروریزی کرتا ہے۔ افسانے کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"یار اسٹیشن ماسٹر کچھ غلط نہ مٹا تھا۔ مال بھی بہت کرارا تھا کوتوال نے کہا اور منہ ڈھکی ہوئی دفتر کے کونے میں سکڑی سہمی سیتا کی جانب عیارانہ مسکراہٹ آمیز تیوروں سے دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"جی ہاں۔ خیر تو پھر پہلا ہاتھ آپ نے انہیں کا کرا بھی تو دیا ورنہ پولیس سے محکمہ میں تو یہاں پر اپنے باپ کا بھی لحاظ نہیں ہوا کرتا ہے" چھوٹے تھانیدار نے کہا۔" ہاں صاحب ہمارے کوتوال صاحب کچھ اسٹیشن ماسٹر صاحب پر بے حد ایمان لائے ہوئے ہیں۔ بھائی یہاں تو اس اصول کے قائل ہیں کہ "اول خویش بعدہ درویش" منشی جی ہیڈ محرر نے کہا۔" (ص56)

اس طرح دیہات سے شہر کا سفر دھنسی کے لیے کچھ دنوں کی راحت کا سامان ضرور ثابت ہوا لیکن ان کی ارتھی کا سامان بھی ہو گیا۔ ابوالفضل صدیقی کے افسانوں میں نچلا طبقہ ہر ظلم کو خاموشی کے ساتھ برداشت نہیں کرتا بلکہ اس کا ردعمل بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ دھنسی اپنے ظلم کا بدلہ اسٹیشن ماسٹر کو زہر دے کر خود کو ہلاک کر لیتا ہے۔ "سماج کا شکار" کا بدھوا زبر خان کے پورے خاندان کو ختم کر کے اپنے اوپر ہوئے ظلم کا بدلہ لیتا ہے۔ اس کے پیچھے ابوالفضل صدیقی کا یہی فلسفہ ہے کہ اگر مرنا ہی ہے تو کچھ کر کے مرو۔ چنانچہ ابوالفضل صدیقی کے نچلے کردار خاموشی کے ساتھ ظلم برداشت نہیں کرتے بلکہ

بدلہ بھی لیتے ہیں۔ پروفیسر شمس الحق عثمانی رقمطراز ہیں۔ **"ابوالفضل صدیقی کی نمائندہ کہانیاں اوائل بیسویں صدی کے اس ہندوستانی معاشرے کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں جس پر چھوٹے بڑے زمیں داراوران کے طورطریقے حاوی تھے۔ان کہانیوں میں وہ عام لوگ مصنف کی توجہ کا خاص مرکز ہیں جو کسی نہ کسی طور پر زمینداروں کے زیرنگیں تھے۔اور وہ انھیں تادیر وکلیتاً اپنا (مجہولیت کی حد تک) تابع بنائے رکھنے کے لیے تمام آزمودہ اور نت نئے حربے استعمال کررہے تھے۔ابوالفضل کے زندہ و پرفکر حواس نے ان کہانیوں کے قاری کو باور کرایا ہے کہ زیرتحریر معاشرے کے افراد میں، بہ وجوہ،ان اسباب کا اکھوا پھوٹ چلا تھا جن کے طفیل میں عام عورت مرد بھی اپنے وجود کے معانی اور مرتبے کومحسوس کرنے لگے تھے۔اس احساس کی بالواسطہ یا بے وجہ سگندھ سے صاحبان اقتدار بھانپ گئے تھے کہ ان کے ہاتھوں سے اقتدار کی ریشمی ڈور دھیرے دھیرے پھسلتی جارہی ہے۔کیونکہ ڈور کے دوسرے سرے پر صدیوں سے بندھے،دوسروں کے اعضاوافکار میں رہائی کے لیے کسمساہٹ و برگستگی اور دلوں میں اپنے وجود کے معانی و مرتبے تک رسائی کی آرزو جنم لے رہی تھی۔نتیجتاً صاحب اقتدار کی گرفت میں مزید سختی پیدا ہوگئی تھی تو گرفتاروں کی کسمساہٹ برگستگی اورآرزوؤں میں شدت عودکرآئی تھی۔"** (رسالہ جامعہ،الفضل صدیقی نمبر،شمارہ نمبر 7-12، ص181-180)

ابوالفضل صدیقی نے دیہی زندگی سے متعلق جتنی اصطلاحوں کواپنے افسانوں میں جگہ دی ہے اس کی مثال کہیں اورنہیں ملتی۔کھیتی کسانی،شادی بیاہ کی رسم ورواج،گھوڑا اور جانوروں سے متعلق بہت سی ایسی اصطلاحیں ہیں جو دیہی معاشرہ میں بھی اب ناپید ہوگئی ہیں۔یہ سبھی تصویریں ایسی ہیں جن کی روشنی میں ہم قدیم ہندوستان کے دیہی سماج کو آج بھی آئینہ کی طرح صاف وشفاف دیکھ سکتے ہیں۔یہ تصویریں یقیناً بدنما ہیں۔انہیں انسانیت پر ایک داغ کے طور پر بھی دیکھ سکتے ہیں لیکن انہوں نے اس استحصالی معاشرہ کا جو خاکہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے وہ رونگٹے کھڑا کردینے والا ہے۔قاری کے اندر تجسس کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔وہ دل ہی دل میں مظلوم کرداروں کے لیے دعائیں بھی کرنے لگتا ہے۔ ابوالفضل صدیقی ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہونے کی وجہ سے لاگ لپیٹ کے بغیر اصل حقیقت کو بیان کردیتے ہیں جس کی وجہ سے افسانہ کے اختتام پر اکثر قاری چونک جاتا ہے۔

حوالہ جات:1۔شکنجہ از۔ابوالفضل صدیقی،فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ،کراچی 21999۔جوالامکھ ابوالفضل صدیقی مکتبہ اسلوب،کراچی 1986 3۔انصاف ایضاً، 4۔آئینہ ایضاً 5۔رسالہ جامعہ، نئی دہلی،ابوالفضل صدیقی نمبر شمارہ نمبر 7-12

☆☆☆